رجسٹرڈ نمبر ا ۲۱۱

مرتبہ :- دیانراین نگم بی-اے

جلد ۶۱	جولائی سنہ ۱۹۳۳ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

تصاویر :- پوردا ؤد - رائے صاحب منشی رگھونندن لال صاحب مرحوم انبالوی

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت فی پرچہ ۸/
قیمت سالانہ عہ
نوٹ - سالانہ ممالک غیر سے ۔ ششماہی ۔ ہندوستان کیلئے ششماہی تین روپیہ

زمانہ

جلد ۶۱ — جولائی سنہ ۱۹۳۳ء — نمبر ۱

معیار شاعری

(از پروفیسر سنت پرشاد، مدہوش ایم۔اے)

شاعری کے موضوع پر ہر ملک کے نقادوں شاعروں اور فلسفیوں نے اظہار خیالات کیا ہے، کسی نے شاعری کو مذہب کی سرحد تک پہونچا دیا اور کسی نے مذہب کے بھی ادھر جگہ دیدی، کسی نے شاعری کو جذبات کی ترجمانی، تخیلات کی پرواز، مناظر کی محاکات، واقعہ نگاری اور لفظی مصوری کا فن قرار دیا ہے۔ کسی نے دلبستگی اور تفنن طبع کا ذریعہ ٹھہرایا بہرحال

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

پیشتر اس کے کہ اس موضوع پر مفصل اظہار خیال کیا جائے اُن نقادان ادب کے خیالات کا مختصر ذکر کرنا مناسب ہوگا جو تنقید کی ارتقا میں منزل بہ منزل رکن تصور کئے جاسکتے ہیں۔ مشہور یونانی فلسفی افلاطون پہلا بڑا نقاد تھا جس نے ادبیات کا مطالعہ علمی نقطۂ نگاہ سے کیا۔ وہ تنقید ادب میں اخلاقیات اور ادبیات کے باہمی تعلق کے اصول کے اطلاق کا حامی ہے۔ اس نے ادبیات کو اخلاقی صداقتوں کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس کا اعتقاد تھا کہ ادبیات میں بلند خیالی اور حسن بیان کا تعلق مصنف کے ذاتی اخلاق کی بلندی پر ہے۔ اس کے خیال میں پست خیالی اور طرز بیان کے نقائص کی وجہ بھی مصنف کی کمزوری اخلاق ہے۔ اس کے قول کے بموجب ادیب وہی ہوسکتا ہے جو اپنے حسن طینت اور جودت طبع کی بدولت حسن کامل کی خوبیوں اور اس کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کرسکے۔ دوسری بات جس پر افلاطون

نے زور دیا ہے ادبیات میں واقعیت کی ضرورت ہے، اُس نے جو زور واقعیت پر دیا ہے اس کا مفصل ذکر یہاں عمداً نظر انداز کیا جاتا ہے۔

افلاطون کے بعد دوسرا شخص جس نے اس موضوع پر اظہار خیالات کیا مشہور فلسفی ارسطو ہے اس نے کہا کہ تمامی آرٹ اور لٹریچر، محاکات، تصویر کشی اور نقالی ہے جن کا مقصد انبساط خاطر ہے۔ اسکی رائے میں کسی چیز کی صحیح تصویر کھینچنا (خواہ وہ اچھی ہو یا بُری) انسانی طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے۔ اس کی رائے میں طبیعت انسانی میں نقل اتارنے کا قدرتی رجحان ہے۔ لٹریچر کی بنیاد اسی میلانِ طبع پر ہے۔ ارسطو کے خیالات کا جدید اُردو ادب پر بھی بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ کیونکہ اُردو کے مشہور ادیب ونقاد مولانا شبلی مرحوم نے اُردو ادب میں ارسطو کے خیالات ہی کی ترجمانی کی اور اسی کی تقلید پر زور دیا۔

ارسطو نے طرز بیان کو اہمیت دیتے ہوئے ہم آہنگی اور تناسب کو تنقید کا معیار قرار دیا ہے چنانچہ اسی اصول کے اطلاق سے جدید فنِ تنقید کا آغاز ہوا اور ایک عرصہ دراز تک ان اصولوں میں جو افلاطون وارسطو نے قائم کر دیئے تھے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ انگلستان کے نقادوں نے بھی ارسطو کے اصولوں کی تقلید کی۔ اڈیسن نے البتہ ایک اصول کا اور اضافہ کیا اور وہ "مقبولیت" کا اصول تھا۔ اس کی رائے میں تنقید کا ایک معیار یہ بھی ہونا چاہیئے کہ کوئی نظم ہمارے تخیل کو کس قدر مقبول اور پسندیدہ ہے مقبولیت کے وصف کو اس نے اس قدر اہمیت دی کہ اسے شاعری کی جان اور اعلیٰ ترین تکمیل کا ثبوت قرار دیا۔ اس کا قول تھا کہ قدرت میں ہمیں کوئی چیز ہمارے حسن کے تصوّر کے مطابق نہیں مل سکتی اس لئے شاعر فطرت کی چیزوں میں مناسب ردوبدل کر کے اپنے تخیل کے مطابق ان کا عکس پیش کرتا ہے جن کی بنا اصل پر ہوتی ہے۔ اصل اور اس کے تخیلی عکس میں یہ فرق ہوتا ہے کہ مؤخرالذکر اصل کے نقائص سے مبرّا اور محاسن تخیلی سے مملو ہوتا ہے۔ یہی شاعر کا کمال اور اس کی جدت آفرینی ہے۔ اڈیسن کے مطابق شاعری کو تخیل کے ساتھ وابستہ کر دینے سے فن تنقید کو تین ضروری معیار دستیاب ہوئے یعنی صداقت، تناسب اور مقبولیت، جو کہ روزمرہ زبان میں شاعری کے اوصاف نفس مضمون، طرز ادا، اور پسندیدگی ہیں۔ کزن نے کہا کہ قدرت میں جو حسن دیکھنے میں آتا ہے شاعر اُسے دیکھکر نہ صرف ایک مرتبہ محظوظ ہوتا ہے بلکہ اس مادّی واخلاقی حسن سے بار بار لطف اندوز ہونا چاہتا ہے، اور حسن کے انھیں پہلوؤں کی تصویر اپنی شاعری میں کھینچتا ہے۔ اس طرح شاعر حسن باطن کو جسے تخیل کی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے نمایاں کرتا ہے وہ حسن مادی کی تصویر کھینچتے ہوئے اس کے پوشیدہ اوصاف کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی حسن اخلاق کا نمایاں کرنا شاعری کا مقصد ہے

حسنِ صورت حسنِ باطن کا محض عکس ہوتا ہے جس کی تمام خوبیوں کو ظاہری نظریں پوری طور پر دیکھ نہیں سکتی ہیں۔ اس لئے شاعر ان کو روشن کرکے ہمارے احساسات کو زیادہ متاثر و متحرک کر دیتا ہے۔

عہد جدید میں اس بات کا پورا احساس ہوگیا ہے کہ کسی نظم یا ادبی کارنامے کو رسمی تنقید (Formal Criticism) کے معیار پر پرکھنا درست نہیں۔ رسمی تنقید کا بہت بڑا مخالف انگریزی زبان کا مشہور شاعر ورڈسورتھ ہے۔ ورڈسورتھ کی رائے میں فنِ تنقید کے پرانے رسمی قواعد کی بنا پر جو زمانہ قدیم کے ادبی شاہکاروں کے سلسلے میں قائم کئے گئے ہیں کسی نئے ادبی کارنامے کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا غلطی ہے۔ کیونکہ ہر جدید یا ادبی کارنامہ میں جو کسی شاعر یا مصنف کے جودتِ طبع کا نتیجہ ہے کوئی نہ کوئی اُپج (Originality) ضرور ہوگی اور یہی اس کا خاص وصف یعنی مقبولیت کا باعث ہوگا۔ رسمی تنقید اس پہلو کو قطعی نظر انداز کر دیتی ہے اور اصطلاحی قواعد شاعرانہ خوبیوں کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہماری اُردو شاعری بھی ابھی تک اس رسمی تنقید کی زنجیروں میں گرفتار رہی ہے۔ متقدمین اور متاخرین کے وقت میں یہ زنجیریں زیادہ سخت تھیں اب کسی قدر ڈھیلی ہو رہی ہیں مگر ابھی تک ٹوٹی نہیں۔ نقادانِ ادب اُردو زبان کا چٹخارہ، محاورہ کی کثرت، روانی، بندش کی چستی اور خیال کی جدت کی بنا پر شاعری کو اچھا یا بُرا کہہ دیتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ کسی نظم میں مذکورہ بالا چیزوں کے ہوتے ہوئے اثر اور شعریت مفقود ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس ان چیزوں کے نہ ہوتے ہوئے بھی کلام پُرتاثیر اور شعریت سے مملو ہو سکتا ہے۔ ہندی میں کبیر اور فارسی میں مولانا روم کے کلام پر نظر ڈالئے اکثر مقامات پر زبان کی خامیوں اور نامانوس الفاظ کی موجودگی اور بندش کی اجنبیت کے باوجود روانی میں انتہا درجہ کا اثر پایا جاتا ہے۔ رسمی تنقید کا ایک مسلّمہ اصول یہ ہے کہ مانوس اور روزمرہ کی بول چال کے الفاظ کا استعمال شعر میں فصاحت اور اثر پیدا کرتا ہے اور غیر مانوس الفاظ شعریت کا خون کر دیتے ہیں مگر غالب کے یہاں دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض مقامات میں ایک نامانوس لفظ جو اصطلاح میں غیر فصیح کہا جائیگا ایک خاص زور پیدا کرتا ہے اور سامع کی توجہ خاص طور پر اپنی جانب مبذول کرکے اہمیت کے ساتھ مطلب ادا کرتا ہے۔

تنقید کے موضوع پر ورڈسورتھ کے بعد آرنلڈ[1] کے اضافات زیادہ اہم اور قابلِ قدر ہیں۔ اس نے افلاطون کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی کتاب "تنقید پر مضامین" (Essays in Criticism) میں مختلف شعرا کی زندگی کے حالات اور ان کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے نہایت بصیرت افروز طریقہ

---

[1] Mathew Arnold

سے یہ راز روشن کیا ہے کہ شاعر کے شاعرانہ کارناموں کے محاسن و معائب کا گہرا تعلق اس کی ذات وصفات سے ہوتا ہے۔ آرنلڈ نے اپنے مضمون مطالعۂ شاعری "(Study of Poetry) میں (جس کا ترجمہ ناظرین کو زمانہ جوبلی نمبر میں ملجائیگا) مندرجہ ذیل اصول قائم کئے ہیں:۔

۱۔ شاعری زندگی کی تنقید ہے یعنی یہ کہ شاعر زندگی کی مثالیہ تصاویر پیش کر کے ہمارے لئے ایک معیار قائم کر دیتا ہے جس سے ہم اپنی زندگی کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

۲۔ شاعری میں اخلاقی بلندی کے ساتھ ساتھ بیان میں کمال سنجیدگی اور خلوص بھی لازمی ہے۔

اس نے یہ بھی دکھلایا کہ ہر مصنف کا اپنے زمانہ سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ہماری پرانی اُردو شاعری کے بیشتر نقائص اسی تعلق کا نتیجہ ہیں کیونکہ جس زمانہ میں اس شاعری نے نشو و نما پائی ہے اُس وقت کی معاشرتی آب وہوا مسموم تھی، مذاق عام پستی کی طرف مائل تھا، غزل گوئی اور ہجو سرائی کا عام رواج تھا۔ غزل گوئی کے بغیر کسی شاعر کا کلام مقبول عام نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ہجو کے بغیر ان کا کوئی دیوان مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ میر جیسا سنجیدہ شاعر بھی اپنے وقت کی آب وہوا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کا کلام بھی کہیں کہیں فحش ہو گیا ہے اور اس کے دیوان میں ہجو کا حصہ بھی موجود ہے۔

آرٹ اور اخلاق کے باہمی تعلق کے اصول کا بہترین اعتراف رسکن اور ولیم مارس کی تحریروں میں ہوا۔ رسکن نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ آرٹ کی لطافت اخلاقی پاکیزگی اور جذبہ کی عظمت و شکوہ کا عکس ہوتا ہے یعنی جذبات میں جس قدر پاکیزگی نیک نفسی اور راستی ہوگی اُسی قدر شاعری بھی لطیف ہوگی۔ رسکن اسکول کے خیالات کے قطعی مخالف سوئبزن کا اسکول ہے۔ رسکن نے آرٹ کے ساتھ اخلاق کا وابستہ ہونا لازمی قرار دیا۔ سوئبزن کا قول ہے کہ آرٹ محض آرٹ ہے جس کو اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں۔ اخلاق کے علاوہ شاعری خود ایک فن ہے اور اُسکی رائے میں کوئی ادبی کارنامہ قابل قدر نہیں ہو سکتا جب تک اس کی تکمیل سر بسر فن کی بنیاد پر نہ ہوئی ہو۔

بہرحال فن تنقید کے مختلف نظریوں پر سرسری نظر ڈالی جا چکی ہے، ہر شخص جس نظریہ کو چاہے قبول کرے یا نہ کرے۔ اس کو اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کی پوری آزادی ہے۔ مگر میری رائے میں شاعری میں اخلاقی بلندی کا ہونا لازمی ہے اگر کوئی نظم اُس سے محروم اور صرف فنّی خوبیوں کی آئینہ بردار ہو، اگر اس کے طرز ادا میں جدت اور روانی۔ بندش کی چستی زبان و محاورہ کا لطف مصرعوں میں مناسبت۔ اشعار میں تسلسل۔ بیان میں جوش اور جذبہ میں جان

سب کچھ موجود ہو لیکن جذبات میں لطافت کے بجائے بوالہوسی تخئیل میں بلند آہنگی اور اعلیٰ اخلاق کے بجائے پستی اور بیان میں شوقِ لطیف اور دردِ دل کے بجائے جذبۂ نفسانی ہو تو ایسی نظم ایک جام مرصع ہے. صاف و شفاف مگر جس میں زہر ہلاہل بھرا ہوا ہے مثلاً داغ اور امیر کا کلام فنی خوبیوں کا آئینہ ہے مگر لطافتِ اخلاقی کی صیقل سے محروم اور بوالہوسی سے زنگ آلود ہے۔

آرٹ اور اخلاق کی وابستگی کے متعلق ایک غلط فہمی کا احتمال ہے اس لئے یہاں پر یہ بات واضح کر دینا واجب ہے کہ آرٹ کا کسی خاص مذہب کے عقائد کا پابند ہونا یا کسی مقررہ اخلاق کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے. شاعر کا نقطۂ خیال مروجہ مذاہب و طریق عمل سے مختلف ہو سکتا ہے۔ اسے اس بارے میں پوری آزادی ہے۔ اخلاقی بلندی سے جس کا شاعری میں ہونا لازمی ہو صرف نیک نفسی مراد ہے جو جملہ مذاہب اور اخلاقیات کی روح رواں ہوتی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ کسی بلند اخلاقی واقعہ کا منظوم کر دینا ہی شاعری نہیں. مثلاً اگر کوئی نظم اخوت انسانی کے موضوع پر ہے لیکن اس کا طرزِ بیان بے کیف. اس کی بندشیں لچر، ترکیبیں سُست اور الفاظ نامناسب ہیں تو اس میں اثر مفقود ہوگا یعنی اس میں شعریت معدوم ہوگی مندرجہ بالا کمزوریوں کی وجہ اور اثر نہ ہونے کا باعث یہ ہے کہ نظم ذاتی جذبات کی بنا پر نہیں لکھی گئی۔ اسی وجہ سے افلاطون اور آرنلڈ نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ شاعر کے کارناموں کے محاسن و معائب کا گہرا تعلق اس کے ذات و صفات سے ہوتا ہے۔ اس لئے میں شاعری کے لئے دو باتوں کو خاص اہمیت دیتا ہوں اور انھیں کو معیار شاعری سمجھتا ہوں:-

اوّل یہ کہ شاعری میں بلند آہنگی، نیک نفسی اور اخلاقی معراج ہو،

دوّم یہ کہ بیان جذبۂ ذاتی کا عکس، اُس کی پہچان یہ ہے کہ اگر جذبۂ ذاتی کا عکس ہوگا تو ضرور اثر کرے گا۔ بقول شخصے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے　　　پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

شاعر کا احساس قوی اور لطیف ہوتا ہے وہ کسی موثر واقعہ یا منظر کو دیکھکر متاثر ہو جاتا ہے، اُس کا جو بیان ہوتا ہے وہی شاعری ہے۔ یہ بات نظر انداز نہ ہونا چاہئیے کہ شاعر کے دل پر جو اثر ہوتا ہے اُسے لطیف ہونا چاہئیے، ورنہ یوں تو ایک بوالہوس کا احساس بھی سریع الاشتعال ہوتا ہے مگر شاعری احساساتِ حسنہ اور جذباتِ لطیفہ کا اظہار ہے، جذباتِ لطیفہ اور احساساتِ حسنہ وہی ہیں جو حسن پرستی (اس حسن خاص کی پرستش جو جملہ محاسنِ باطنی کا آئینہ بردار ہو) انصاف و صداقت کی داد

وتحسین یا بے غرض ہمدردی سے لبریز ہوں۔ ایک شاعر باغ میں جاکر پھولوں کے رنگ وبو، ہوا کی تازگی اور طراوت سے محظوظ ہوتا ہے اور جب اس منظر کو نظم میں بیان کرتا ہے تو انھیں احساسات کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بیان میں کتنی ہی محاکات کیوں نہ ہو مگر اس کی نظم میرے نزدیک شاعری کی روح سے خالی ہوگی، حالانکہ ارسطو کے نظریہ کے مطابق یہ نظم عین شاعرانہ کارنامہ تصور کی جائیگی، مگر چونکہ اس شاعر کے بیان میں اخلاقی بلندی نہیں ہے اور اس کا احساس نفسانیت پر مبنی ہے اس لئے اس کی نظم جو اخلاقی معراج سے دوش بدوش نہیں میرے نزدیک شاعری نہیں۔ دوسرا شخص جو اسی منظر کو دیکھکر کسی پھول پر نظر ڈالتا ہے اور بیساختہ کہہ اُٹھتا ہے ع

اے گل بہ تو خرسندم تو بوے کسے داری

یہ اصلی شاعر ہے۔ اس کے بیان میں عشق کا لطیف جذبہ موجود ہے، پھول کی پاکیزگی دیکھکر، اُس کی بو سونگھ کر اُسے اپنے محبوب کی یاد آتی ہے۔ اُس کی نظر میں حُسن باطن کی خوبیاں ہیں، وہ لذات نفسانی کا گرویدہ نہیں۔

تیسرا شخص باغ کی رنگا رنگی کو دیکھکر بیساختہ کہتا ہے ع

ہر گل ہے تیرا جلوہ قطرے میں نور تیرا

یہ ایک عاشق حقیقی کا بیان ہے جو کہ ذرے ذرے اور پتے پتے میں اپنے محبوب حقیقی کا پرتو دیکھتا ہے یہ بیان شاعرانہ کیف سے بھرا ہوا ہے۔ شاعری کی جان جذبات کی پاکیزگی اور لطافت اور بیان کی سنجیدگی اور خلوص ہے۔

عورت مشاہیر مغرب کی نظر میں

۱۔ سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص ہے جس کی بی بی عصمت مآب اور نیک طینت ہو، اور جس کے ساتھ اس کا شوہر عشق سے زندگی بسر کرسکے۔ (لوتھر)

۲۔ اچھی بی بی ملنے سے بہتر کوئی اور نعمت نہیں ہوسکتی اور بُری بی بی سے بدتر اور سخت دوسرا کوئی خدا کا عذاب نہیں ہوسکتا (لیمونٹیر)

۳۔ میں اپنی بی بی کی ذکاوت طبع اور دانائی پر فخر و مباہات کرتا ہوں اور اپنے آپ کو تمام دنیا کے مقابلہ میں زیادہ خوش نصیب تصور کرتا ہوں (ڈینی سن)

۴۔ عورت کو مجسم راستی اور صبر و قناعت ہونا چاہیئے (جاپسر)

سیّد اطہر حیدر سہارنپوری

سہی

(از مسٹر سلیم جعفر)

لفظ "سہی" ابھی تک "شرمندۂ تحقیق" نہیں ہوا ہے، مولوی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ میں ارقام فرماتے ہیں "اصل میں صحیح تھا"۔ اس حکم و وثوق پر مولوی عبدالحق صاحب پہلے یہ کہکر کہ "اس کی اصل صحیح بتائی جاتی ہے" رنگ اشتباہ چڑھاتے پھر ایک اور فقرہ لکھکر کہ "قدیم اردو میں اس لفظ کو صحیح ہی کہتے تھے"۔ خیال کو اسطرف لیجانا چاہتے ہیں کہ ایک سند اس قسم کی ضرور ملتی ہے جس سے اس تحقیق کا درست ہونا خارج از امکان نہیں، مستشرقین انگلستان محققین ہندوستان کے ہم خیال نہیں۔ ڈاکٹر صاحب فاربز تو تحقیق سے گریز کرتے ہیں، لیکن ڈاکٹر فالن نے جرأت کی ہے ان کا قول ہے کہ یہ "متعلق فعل" ہے۔ اور اس کا ماخذ سنسکرت کا مادہ آس (आस) بہ معنی "ہونا" ہے، مسٹر پلاٹس اپنے "لغت ہندوستانی و انگریزی" میں لکھتے ہیں کہ "اصل" غالباً "ستیم" (सत्य) بہ معنی "سچ" ہے۔

لفظی تحقیق بیان فرمانے کے بعد مولوی سید احمد صاحب فرماتے ہیں:۔

> "یہ لفظ جس قدر موقعوں پر بولا جاتا ہے اگر وہ سب مواقع جتائے اور ان کے واسطے الفاظ بنائے جائیں تو بھی ہم پورا پورا چربا نہیں اتار سکتے۔ کیونکہ اہل زبان اسے ایسے بیچ موقعوں پر استعمال کر جاتے ہیں کہ انھیں اہل زبان ہی بول اور سمجھ سکتا ہے دوسرا شخص اگر بولے تو ضرور خطا کھائے گا۔ لہذا ہم چند مشہور قریب الفہم مواقع زیادہ تر حضرت غالب کی غزل سے بتا کر آگے چلتے ہیں۔"

اور بطور "مشتے نمونہ از خروارے" گیارہ محل استعمال بتاتے ہیں مولوی صاحب کا استنباط و استقرار غور و فکر سے محض فریب نظر معلوم ہوتا ہے، ممدوح نے اپنے دعوٰی کی تائید میں کچھ روزمرہ کے فقرے اور غالب مرحوم کی ایک غزل پیش کی ہے جو درج ذیل ہیں۔

(۱) ٹھیک۔ بجا۔ درست جیسے، جو تم کہو سو ہی سہی،

(۲) برائے ایجاب۔ قبول۔ منظور۔ تسلیم۔ مانا۔ فرض کیا۔ ع ؎

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے، غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

(۳) برائے شرط، آ تو سہی

(۴) تکمیل فعل کے واسطے جیسے۔ میاں کھاؤ تو سہی، پیچھے تکلف کر لینا، یعنی پہلے کھانا تو کھاؤ۔ (مصرعہ رنگین) اس کو یاں لا تو سہی، سوچ میں بیٹھی ہو کیوں؟ یعنی پہلے لے تو آئے

(۵) غنیمت ہے۔ مغتنم ہے۔ بہتر ہے۔ ع ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی،

(۶) تسلی خاطر کے واسطے، یہی سمجھیں گے۔ یونہی جانیں گے۔ ع ؎

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی۔

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

(۷) تاکید کے واسطے۔ حصر تاکید کے لئے ع ؎

کچھ تو دے اے فلک ناانصاف آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

(۸) تسلسل کے واسطے۔ جاری رہے چلے جائے۔ برقرار رہے ع ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(۹) تاکید کلام کے واسطے۔ مانو۔ جانو۔ خیال کرو۔ ع ؎

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی

(۱۰) منظور کرو۔ قبول کرو ع ؎

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

(۱۱) ہرچہ بادا باد۔ کچھ ہی ہو۔ کچھ پروا نہیں۔ چلو یونہی سہی۔ ہم فقیر ہی سہی۔

پہلے دوسرے اور پانچویں محل استعمال میں نہ تو کوئی بین اور نہ کوئی باریک فرق ہے "ٹھیک" ہندی کا لفظ ہے۔ اور بقول خود مولوی صاحب اس کے معنی راست، درست، بجا۔ صحیح، ہیں،

اس کے علاوہ کیا پہلی مثال کے یہ معنی لینا کہ جو کچھ تم کہتے ہو ہم اسے مانتے یا تسلیم وقبول ومنظور کرتے ہیں، غلط ہے۔ یہ فقرہ متکلم اس موقع پر بے تکلف بول سکتا ہے جہاں ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کا کہنا قبول کرتا ہے خواہ اس کی وجہ کچھ ہی ہو۔ اسی طرح اگر دوسری مثال کے شعر کا مطلب یوں بیان کیا جائے کہ "یہ ٹھیک۔ بجا۔ یا درست ہے کہ غیر کو تم سے محبت ہے مگر ہم بھی تو اپنے دشمن نہیں ہیں" تو معنی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پانچویں مثال میں بھی صرف لفظوں کا الٹ پھیر ہے۔ اور کچھ نہیں۔ یہاں بھی شعر کے یہ معنی کہے جا سکتے ہیں کہ اگر نغمۂ شادی میسّر نہیں تو کچھ پروا نہیں ہمیں نوحۂ غم بھی منظور ہے گھر کی رونق کا دارومدار "ہنگامہ" پہ ہے، اس سے غرض نہیں کہ اس کا باعث کون ہے، نوحۂ غم اور نغمۂ شادی دونوں "ہنگامہ" پیدا کر سکتے ہیں۔ اور دونوں میں سے جو بھی میسّر آجائے گھر کی رونق کیلئے کافی ہے اور اس لئے ہم اسکو قبول کرتے ہیں۔

غالب کا سا 'الم دوست' 'حریص لذت آزار'، جو 'کف افسوس ملنے' کو 'عہد تجدید تمنا' سے تعبیر کرتا ہے نغمۂ شادی میسّر نہ آنے پر نوحۂ غم کو بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھ کر قبول کرلے یہ اس کی 'شوخی اندیشہ' کے لئے باعث ننگ ہے، وہ دونوں کو ہم پلّہ سمجھتا ہے، اس کے نزدیک دونوں میں سے کسی کی کوئی قدر نہیں، اور ہے تو محض اس سبب سے کہ وہ ایک ہنگامہ پیدا کر سکتا ہے، جو گھر کی رونق کا باعث ہے۔

مولوی سیّد علی حیدر صاحب طباطبائی اس شعر کی شرح ان الفاظ میں فرماتے ہیں: "دنیا کی شادی وغم دونوں ہیچ ہیں۔ اپنی دلگی سے کام رکھنا چاہئے۔ عارف کی نظر میں شادی وغم دونوں کی ایک ہی صورت ہے" اس سے بھی نہیں معلوم ہوتا کہ غالب نوحۂ غم کو غنیمت اور مغتنم سمجھکر قبول کرتے ہیں۔

(۶) اس مد میں جتنے معنی بتائے گئے ہیں وہ سب پورے کے پورے شعر کا حاصل ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ کہنا کہ یہ معنی محض لفظ سہی سے نکلے درست نہیں۔ مثلاً پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اپنی ہی ہستی سفینۂ بحر نجات بن سکتی ہے، اگر تم سے ہو سکتا ہے تو اس کی حقیقت کو سمجھ لو، نہیں ہو سکتا تو اسے قطعی بھلا دو۔ درحقیقت ہستی ہی مانع حصول مقصد ہے، اور رفع مانع صرف دو ہی صورتوں سے ممکن ہے یا تو اسے بہت ہی اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے یا پھر اُسے اتنا بھلا دیا جائے کہ دل میں اس کا خیال ہی نہ آئے۔ معرفت نفس حاصل ہو تو اور خودی مٹا دی جائے تو دونوں ایک ہی منزل پر پہونچاتی ہے، اس لئے برابر ہیں۔

اسی طرح شاعر دوسرے شعر میں ایک قدر زد کرتا ہے تیسرے میں عاشق صادق اور وفاشعار ہونیکا مدعی ہے، اور گوارا اور ناگوارا کی پروا نہیں کرتا، اور چوتھے میں یہ قبول ومنظور کرکے کہ بے نیازی

تیری عادت" ہے۔ جس کے ہم اس وقت متحمل نہیں، کہتا ہے کہ اب سے وہ طریق عمل اختیار کریں گے، کہ آئندہ ہمیں تیری بے نیازی شاق نہ گذرے اور اس کی وجہ سے جو کچھ پڑے جھیل جائیں۔
بہر صورت وفا ہمارا شعار ہے اور اس سے منہ نہ موڑیں گے،

ان چاروں اشعار میں لفظ سہی کے استعمال سے شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ جو صورت واقعات ہو یا پیش آئے اس سے اسے کوئی تعرض نہیں۔ وہ اسے قبول و منظور کرتا ہے۔ بہ لحاظ معانی، پہلا شعر اچھا خاصہ تصوّف کا وعظ ہے، دوسرا ایک مجسمۂ آرزو اور تیسرا اور چوتھا نعرۂ وفا پرستی۔ ان سے "تسلّی خاطر" کے معانی کہاں نکلتے ہیں؟

(۷) اس شعر میں تاکید یا حصر جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے، وہ لفظ "سہی" سے نہیں بلکہ "تو" اور "ہے" سے ہوتا ہے، ان میں سے پہلا حرف تاکید ہے اور دوسرا بمعنی حصر مستعمل ہے، خود مولوی صاحب کی تالیف اس کی شاہد ہے۔

(۸) اس میں کلام نہیں کہ شاعر تسلسل تعلقات کا خواہشمند ہے اور اس کے نزدیک دو شخصوں میں باہم عداوت ہونا بھی دلیل تعلق ہے، کیونکہ دو بے تعلق شخصوں میں دوستی یا دشمنی کچھ بھی نہیں ہو سکتی، گویا تعلق ہی ہیولائے منافرت و موانست ہے لیکن لفظ "سہی" میں کونسی بات ہے جس سے یہ استدلال کیا جائے، کہ یہ تسلسل تعلق کی جانب ذہن کو منتقل کرتا ہے، کوئی بھی نہیں، شاعر پہلے کہتا ہے ؎
"قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے" اس مصرع سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ لفظ منہ سے نکلے ہیں، متکلم و سامع میں پہلے سے ربط و ضبط تھا جسے اب سامع توڑنا اور متکلم قایم رکھنا چاہتا ہے دوسرے مصرع میں یہ صاحب غرض اس کے قایم رہنے کی تدبیر بتاتا اور کہتا ہے کہ اگر کوئی اور صورت پسند نہیں تو عداوت ہی رکھئے۔ اس طرح آپ یاد تو کر لیا کریں گے اور یہی بہت ہے کیونکہ یاد وہی کیا جاتا ہے جس سے تعلق ہوتا ہے۔ اسی مضمون کے دو اور شعر نقل کئے جاتے ہیں پہلے سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعر دشمنی (لاگ) کو تعلق (لگاؤ) سمجھتا ہے اور دوسرا شعر زیر بحث کا ہم معنی ہے۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو　　　کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

(۹) کسی نے کسی کے عشق کا دعویٰ کیا تھا، جواب ملا "یہ عشق نہیں وحشت ہے، اسے چھوڑ دو" اس کے جواب میں مدعی عشق کہتا ہے۔ "میں مانتا ہوں کہ میرا عشق، عشق نہیں وحشت ہے لیکن یہ وحشت کوئی بیکار اور فضول چیز بھی نہیں کہ چھوڑ دی جائے۔ اس سے اور کچھ نہیں تو آپ کے حُسن کا شہرہ ہی

ہوتا ہے،، اس شعر میں حصر و تاکید "ہی" سے پیدا ہوتی ہے، دونوں مصرعوں میں "سہی" کے وہی ایک معنی ہیں یعنی منظور و قبول۔

(۲) یہاں ادعائے پاک بازی ہے۔ جلوت ہو یا خلوت مرد وش میں فرق نہیں آسکتا۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں۔ "مان لیا کہ تم تنہا ہو اور کوئی پاس نہیں" سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شعر میں سہی کے معنی "منظور کرو" "قبول کرو" کیونکر ہو گئے۔ ایک پرانا مقولہ ہے " المعنی فی بطن الشاعر" یہ تو غالب ہی جانیں کہ کون سا منظر سامنے تھا جس کی انھوں نے تصویر کھینچی ہے۔ لیکن شعر سے دو منظر سمجھ میں آتے ہیں۔ وھوہذا۔

(ا) عاشق اپنے محبوب سے ملنے کی آرزو ظاہر کرتا ہے، جواب ملتا ہے کہ دنیا بھر کے سامنے تمھیں کیسے بلالیں، رسوا ہو جائیں گے، یہ پھر کہتا ہے کہ میں پاک باز ہوں، اندیشہ نکرو تنہائی میں بلالو اس سے تمہاری رسوائی نہ ہوگی، مجھے تنہا ملنا ہی منظور ہے۔ یا

(ب) معشوق تنہا تھا اُسے حُسن اتفاق کہئے یا سوئے اتفاق کہ عاشق ادھر جانکلا۔ اب وہ برس رہے ہیں کہ تو یہاں کیوں آیا۔ تیرے یوں آجانے سے ہمارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا۔ عاشق بطور معذرت یوں کہتا ہے کہ میرے یہاں آنکلنے سے کوئی اندیشہ نہیں، مانا کہ آپ تنہا ہیں (خلوت ہے) لیکن میں لچا شہدا نہیں اور آپ پاک باز ہیں،

(۱۱) اس فقرہ میں بے پروائی کا انداز لفظ سہی نہیں پیدا کرتا بلکہ خود فقرہ محل استعمال اور بالخصوص اس میں لفظ "چلو" کا موجود ہونا۔ محاورہ میں بعض اوقات یہ لفظ اس معنی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ "تمھیں کیا غرض تم ہمارا پیچھا چھوڑو"

(۳) یہاں "تو" سے محض تاکید پیدا کرنا مقصود ہے لفظ سہی موکد ہے۔ یہ جملہ شرطیہ ہی نہیں، اور بغرض اتمام حجت مان بھی لیا جائے کہ یہ جملہ شرطیہ ہے تو شرط کی جزا میں حرف "تو" آتا ہے "سہی" نہیں آتا۔

(۴) یہاں "سہی" تکمیل فعل کے معنی میں ہرگز استعمال نہیں ہوا۔ در حقیقت جب ایک ہی شخص کو دو کام بہم کرنا ہے اور ان میں وہ ایک کام بے درنگ کرتا ہے اور دوسرے کے کرنے میں اسے پس و پیش ہوتا ہے تو متکلم اسے دوسرا کام کرنے کی ترغیب دینے کیلئے "تو سہی" استعمال کرتا ہے۔ ان دونوں مثالوں میں "تو" محض تاکید کے لئے اور "سہی" ایک کام کے ساتھ ساتھ دوسرا کرنیکی ترغیب دینے کو استعمال ہوئے ہیں۔

فرہنگ آصفیہ میں جو مثالیں لفظ سہی کا محل استعمال سمجھانیکے لئے لکھی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض دو موقعوں پر بولا جاتا ہے ایک وہ ہے جہاں کوئی بات منظور و قبول ہو، دوسرا وہ جہاں دو فعل بہم صادر ہونے چاہئیں۔ اور وہاں ایک کے صدور کے بعد دوسرے کے صدور میں توقف ہو۔

اور متکلم سامع کو اس کے کرنے کی ترغیب دلانا چاہتا ہو یعنی یہ کہنا چاہتا ہو کہ ایک کام کر لیا ہے اسکے ساتھ ہی دوسرا بھی کرنا چاہیئے۔ چوتھی مثال میں مولوی سید احمد صاحب خود فرماتے ہیں کہ "پہلے کھانا تو کھاؤ" یعنی ایک شخص کو دو فعلوں کا مصدر ہونا چاہئے۔ کھانا کھانا، اور تکلف کرنا۔ وہ تکلف کرتا اور کھانا نہیں کھاتا ہے اس لئے اس سے کوئی کہتا ہے کہ تکلف تو کرتے ہو مگر کھانا نہیں کھاتے اس لئے پہلے کھانا کھالو، پھر تکلف بھی کر لینا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اس لفظ کا محل استعمال سمجھانے کے لئے مندرجہ ذیل مثالیں لکھی ہیں،

(۱) سن تو سہی۔ کہہ تو سہی۔ اکثر تو کے ساتھ مل کر آتا ہے۔

(۲) بعض اوقات اپنے اصلی معنی کی طرف رجوع کرتا ہے، جیسے ؎

بھڑکی سہی، ادا سہی، چین جبین سہی، سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

(۳) کبھی دھمکی کے معنی دیتا ہے، جیسے آؤ تو سہی، کھاؤ تو سہی،

(۴) (ان معنوں میں ہمیشہ تو کے ساتھ آتا ہے) کبھی آمادگی ظاہر کرتا ہے، تم جاؤ تو سہی پھر دیکھا جائے گا۔

(۵) کبھی استغنا ظاہر کرتا ہے لیکن حرف نفی کے ساتھ ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی (غالب)

ان میں سے دوسری مثال میں سہی کے معنی منظور و قبول ہیں، باقی کی مثالوں پر وہی صادق آتا ہے جو فرہنگ آصفیہ کی تیسری اور چوتھی مثالوں کے متعلق کہا جا چکا ہے دھمکی، آمادگی اور استغنا کا مدار "سہی" پر نہیں ہے، بلکہ ان فقروں کے خاص خاص مواقع سے بولنے پر ہے،

پلاٹس کے "ستیم" (सत्यं) کا بگڑ کر "سہی" ہو جانا بہت ہی بعید از قیاس نظر آتا ہے، فالن نے صرف مادۂ لفظ بتانے پر اکتفا کی ہے، دونوں کی تحقیقات پر الگ الگ نظر ڈالی جائے تو حقیقت بے نقاب نہیں ہوتی، لیکن انکی مدد سے صحیح صحیح نتیجہ نکال لینا دشوار نہیں، پلاٹس نے لکھا ہے کہ ہندی میں "سئی" (सई) مستعمل ہے، اور فالن کہتا ہے کہ اس کا مادہ "اَس" (अस) ہے فالن نے اس کے معنی Be it so (ایسا ہی ہو) بھی بتائے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت میں جو لفظ ان معنی میں استعمال ہوتا ہے وہی بگڑا ہے۔ سنسکرت میں مضارع स्यात جہاں بہت سے معانی میں آتا ہے آرزو اور خواہش کے معنی میں بھی آتا ہے۔ "اَس" کا مضارع "سیات" (स्यात्) ہوتا ہے اسکی دو مثالیں ہدیۂ ناظرین ہیں،

(۱) यस्य यो भावः स्यात (جس کی جو عادت ہو)

(۲) न स्यात् प्राघनिः (وہ تابع غیر نہو)

"سیاتْ" کا بگڑ کر "سہی" ہو جانا عین اصول پراکرت کے مطابق ہے۔ مسٹر آر۔ وے جاگیردار کی ایک تازہ تصنیف[ل] سے ظاہر ہوتا ہے کہ "یَتِ" (यति) پراکرت میں "اے۔ای" (ए) ہو گیا ہے انھوں نے مندرجہ ذیل مثال پیش کی ہے:۔

پراکرت	پالی	سنسکرت
नासेइ	नासेति	नाशयति
ناسیئی	ناسِیئت	ناشَیَتِ

اس تبدیلی کی سند پر یہ نتیجہ نکالنا کہ سیاتْ کا ٹکڑا "یات" यात 'ای' ई سے بدل گیا، تاویل لایعنی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ بالخصوص اس صورت میں کہ سیاتْ کے لغوی یا مجازی معنی ان تمام موقعوں پر چسپاں ہوتے ہیں جہاں "سہی" مستعمل ہے۔ جسب تقاضائے سیاق و سباق ہمیں سیاتْ کے کہیں لغوی معنی (ہو) لینے پڑیں گے اور کہیں مجازی معنی (قبول و منظور وغیرہ)۔ اس لفظ کو غالب مرحوم نے اپنی دو غزلوں کی ردیف میں رکھا ہے جن کے مطلعوں کے پہلے مصرع یہ ہیں:۔

(۱) عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی،

(۲) نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی،

ان دونوں غزلوں میں سے پہلی میں "سہی" بیشتر اپنے مجازی اور کمتر لغوی معانی میں آیا ہے اور دوسری میں بالکل اس کے برعکس ہے۔

اس قسم کے فقروں میں جیسے "میاں کھاؤ تو سہی پیچھے تکلف کر لینا" یعنی جہاں سیاق و سباق کلام دو فعلوں کا وقوع یکے بعد دیگرے چاہتا ہے۔ میں "سہی" کو سنسکرت کے لفظ "سہت" (सहित = ساتھ) کا مخفف مانتا ہوں، مثال کے فقرہ سے صاف صاف ظاہر ہے کہ دو کام ساتھ ساتھ ہونا چاہئے تھے، ان میں سامع نے ایک کیا ہے دوسرا نہیں، متکلّم تقاضا کرتا ہے کہ دوسرا بھی اس کے "ساتھ" ہی کر دے مصرعۂ رنگین سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

"سئی" کیوں کر "سہی" ہو گیا اس کا جواب وہ زبردست لوگ ہیں جو بیدھڑک لفظوں کا تلفظ بگاڑتے اور بے کھٹکے قواعد کا خون کرتے ہیں جو بے سمجھے بوجھے ان میں کبھی کچھ گھٹا اور کبھی کچھ بڑھا دیتے ہیں اور جن کی قوت و اقتدار کا اعتراف کرنے کے لئے مستعلق گو اپنے عجز و بے بسی کو محاورہ اور روزمرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

[ل] An Introduction to the Comparative Philology of Indo-Aryan Languages by R.V. Jahagirdar M.A. (London.)

مرزا رسوا مرحوم کی نثر

(از مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

نمبر ۳

میرے مراسلۂ سابق میں تشبیہ کا بیان ختم ہوگیا۔ یعنی جو کچھ مجھے ان مراسلات کی حیثیت میں تشبیہ کا ذکر کرنا تھا وہ ہوچکا۔ اب میں استعارہ کے باب میں کچھ مختصراً لکھنا چاہتا ہوں۔

قدما کا یہ خیال ہے کہ تشبیہ کو علم بیان کے مباحث میں خاص دخل نہیں ہے نہایت درست ہے اس لئے کہ فن بیان کا مقصود یہ ہے کہ ایک مطلب کو کئی طرح سے ادا کر سکیں اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جبکہ الفاظ کو اُن کے معانی غیر موضوع لہا میں استعمال کیا جائے۔ اور تشبیہ میں یہ صورت نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ کہنا کہ "معشوق کے چہرہ کی رنگت گلاب کے پھول کی ایسی ہے" اس جملہ میں کوئی لفظ غیر معنی موضوع لہ میں نہیں استعمال کیا گیا، لہذا تشبیہ میں کوئی بیانی قوت نہیں ہوتی۔ البتہ استعارہ میں یہ قوت موجود ہے جس میں مشبہ کے عین مشبہ بہ ہونے کا ادعا کیا جاتا ہے۔ مثلاً معشوق کو گل کہنا، یا مردِ شجاع کو شیر کہنا۔ اور تشبیہ میں عدم قوت اور استعارہ میں وجود قوت کی وجہ یہ ہے کہ استعارہ میں مستعار منہ کی تخیل کے ساتھ مستعار لہ کے تخیل نہ ہونے سے پورا اثر مستعار منہ کے تخیل پر پڑتا ہے اور اُس کا وجہ جامع میں اقوی ہونا مشروط ہے۔ لہذا وجدانی اثر خواہ مخواہ زیادہ ہوگا اور چونکہ تشبیہ میں ادائے تشبیہ کے ذریعہ سے یہ بات کھل ہی جاتی ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں متغائر ہیں لہذا یہ قوت باقی نہیں رہتی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ قرینہ سے بھی مغائرت طرفین کی ظاہر ہوجاتی ہے، اُس کا جواب یہ دیا جائیگا کہ قرینہ سے اُس قدر وضاحت نہیں ہوتی ہے جیسے کہ ادات تشبیہ سے ممکن الوقوع ہے۔ ایک اور وجہ استعارہ کے اقوی ہونے کی یہ ہے کہ بسبب حذف کر دینے ذکر مستعار لہ اور بسبب نہ موجود ہونے ادات تشبیہ کے بہ نسبت تشبیہ کے اس میں ایجاز زیادہ ہوتا ہے اور ایجاز کی وجہ سے سامع یا ناظر کی تخیل کو قوت ارتکاز کے زیادہ تر صرف کرنے کا موقع ملتا ہے اور اس قسم کے

صرف قوت کو ہم پہلے کسی موقعہ پر کہہ چکے ہیں کہ بنا بر عام قانون مسرت کے مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ مثل تشبیہ کے استعارہ کے بھی تین مدے ہیں (۱) توضیح مطلوب (۲) تخیل وجدان (۳) تعجب ملائم یعنی یا تو استعارہ کا یہ مقصود ہوگا کہ جو امر ہم کو بیان کرنا مطلوب ہے اُس کو اس طرح بیان کریں کہ سامع یا ناظر ہمارے مطلب کو بخوبی سمجھ سکے یا یہ ہوگا کہ سامعین یا ناظرین کے ذہن میں جو اثر از قسم لذت والم ہم پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ پیدا ہو جائے یا یہ کہ ان دونوں میں سے کوئی مقصود نہ ہو بلکہ صرف یہ مطلوب ہو کہ ذہن پر ندرت استعارہ کے حصہ سے تعجب کی حالت پیدا ہو۔ اور اس قسم کا تعجب نہ تو اس حد کا ہو کہ اس سے ہنسی آئے اور نہ ایسا ہو کہ اُس سے قوت غضبی کو تحریک ہو۔ کیونکہ یہ دونوں وجدانیات میں داخل ہو جائیں گی۔ اگرچہ وجدانی اثر سے استعارات غیر وجدانی بالکل مُعرّا نہیں ہوتے تقسیم کی بنا شدّت اور خفت کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ عدم وجدان عدم حس کو مستلزم ہے اور عدم حس عدم علم کو۔ اسی بنا پر تقاسیم ذہنیہ اکثر شدت اور خفت کے اعتبار سے ہیں۔ اس امر کو ہم بحث تقاسیم ذہن میں کسی قدر بیان کر چکے ہیں۔

ایک عام فائدہ استعارہ کا اور بھی ہے اور اُس کا ذکر اس موقع پر غیر مناسب نہ ہوگا کہ استعارات باعث ترقی زبان کے ہوتے ہیں۔ اگر الفاظ صرف معنی موضوع لہ میں استعمال کئے جاتے تو کسی زبان کی ترقی ایک محدود وسعت سے زیادہ نہ ہوتی۔

زبانِ قلم۔ لبِ دریا۔ تیغ زبان۔ آئینۂ دل۔ رکنِ سلطنت۔ دامنِ آرزو۔ گلِ مراد۔ سبکدوشی۔ عرق ریزی۔ جانفشانی وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے بیشمار استعارے زبان میں داخل ہو کر اُس کی وسعت کو بڑھاتے ہیں۔ اور یہ استعارے ملک اور قوم کی شاعرانہ قابلیت کی ترقی کے ساتھ روز بروز زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ یہ مثالیں جو اوپر لکھی گئی ہیں ان سب کو شاعروں کی تخیل نے پیدا کیا ہے اور پھر اُن کی زبان سے نکل کے اب عام ملکیت ہو گئے ہیں۔ ہر شخص اُن کو نہایت آزادی کے ساتھ استعمال کر سکتا ہے لیکن اس موقع پر ایک امر قابل غور ہے وہ یہ کہ ان الفاظ کی ترکیب ہی سے ان کے نو ایجاد ہونے کی دلیل ملتی ہے۔ اس امر کے تسلیم کرنے میں بظاہر کسی کو کلام نہ ہوگا کہ بخلاف کہنگی زبان کے مقابلہ میں یا اُن الفاظ کے جن سے یہ لفظیں بنی ہوئی ہیں، ان مرکبات کے وضع کی تاریخ کو کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ استعارات بطور وحی و الہام کے نہیں آئے ہیں۔ غرضکہ ہم تم ایسے لوگوں نے ان کو وقتاً فوقتاً بنا لیا ہے۔ عام اس سے کہ ان مرکبات کے واضع یا اُن کے رواج دینے والے عجم ہوں یا ہندی پھر اس کی کیا وجہ کہ اب ایسے مرکبات جدید نہیں پیدا ہوتے۔ کیا ان مرکبات کے بنانے والے ایزدی سروش تھے

کہ جو کچھ وہ کانوں میں پھونک گئے ہیں بس انھیں کے ہم استعمال کرنے پر مجبور ہیں ہم بھی آخر انسان ہیں یا کولھو کے بیل نہیں کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے اور ایک خاص چکر پر ہمیشہ کے لئے پھرتے رہتے پر مجبور کر دئے گئے ہیں۔ آخر یہ غلامانہ تقلید تاکے، اندھے بھی لاٹھی کے سہارے سے نئے نئے راستوں پر چل لیتے ہیں پھر ہم ہی کیوں اس قدر مجبور ہیں واقعی ہماری تقلید پسندی رحم کے قابل ہے۔

مرکبات غیر امتزاجی کے وضع کرنے میں تو ہم اس قدر مجبور ہیں کہ اگر کوئی نئی ترکیب ہماری زبان سے نکل جاتی ہے تو ہم قصور وار ٹھہرائے جاتے ہیں۔ پھر ہم حیران ہیں کہ مرکبات غیر امتزاجی کے باب میں تو کچھ کلام کرنا ہی بیکار ہے کیونکہ اُس کی وضع میں ہم بدرجہ اولیٰ مجبور ہیں۔

حالانکہ زبان کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ نہ صرف مرکبات غیر امتزاجی و امتزاجی بلکہ الفاظ جن کو ہم مفردات سمجھے ہوئے ہیں اُن میں سے بھی اکثر در اصل مرکبات ہیں اور پھر اُن سے پہلے جو صورت مفردات کی تھی اُس کے دریافت کرنے سے علم تاریخ لغت عاری ہے۔

وجوہ تسمیہ پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بر سبیل ارتجال بہت سی چیزوں کے نام ہیں کیونکہ اگر وجہ تسمیہ کی بنا کسی امر معقول پر نہ ہو تو ضرور ہے کہ یہ ترجیح بلا مرجح لازم آئیگی۔ کیا وجہ ہے کہ اس چیز کا یہی نام رکھا گیا اور وہ نام نہ رکھا گیا۔ گھوڑے کو گھوڑا اور بندر کو بندر کہنے کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ وحشی قوموں کی حالت پر غور کرنے سے کچھ اس بات کا پتا مل سکتا ہے۔ غالباً اکثر ناموں کے رکھنے میں ابتداءً نقل صوت سے کام لیا گیا، مثلاً مرمر یا صرصر یا زنیل وغیرہ اور اس کے بعد جب گرد و پیش کی چیزوں کے نام رکھ لیے گئے ہونگے تو مرکبات تشبیہی سے بہت کچھ کام لیا گیا ہوگا۔ جب یہ ایک قدرتی طریقہ الفاظ کی وضع اور ساخت کا ہے تو ہم اس طریقہ کو کیوں بھول جائیں اور ہم کیوں اپنی شاعری کے لئے حضرات عجم کی پابندی کو واجب و لازم سمجھا کریں۔

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غرضکہ بیجا تقلید نے نہ صرف ہمارے خیالات کو بلکہ زبان کو بھی روک دیا ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ اُنھیں باتوں کو خیال میں لائیں جن کو اگلے خیال میں لا چکے ہیں، اور وہی لفظیں بولیں جن کو اگلے بول چکے ہیں۔ اس صورت میں شعر گفتن چہ ضرور، اس سے یہی بہتر ہے کہ تفنن طبع کے لئے اساتذہ کے منتخب اشعار یاد کر لیں اور اُنھیں کو حسب موقع پڑھ لیا کریں اور جب بہت گھبرائیں تو اُنھیں کو گنگنایا کریں یہ بات خیال ہی میں نہیں آتی کہ ہمارے ذہنوں سے قوت ایجاد کیوں سلب ہوگئی ہے۔ کس قدر قابل تاسف یہ امر ہے کہ اس انیسویں صدی عیسوی میں مغرب کی طرف کیسے کیسے ایجادات

ہوئے ہیں کیسی کیسی عمدہ کلیں نکالی گئیں، کیا کیا آلات بنے۔ اگر آپ یورپ و امریکہ کے علمی اخبار دیکھئے تو معلوم ہو کہ ہر ہفتہ میں نئے نئے ایجادات ہوتے رہتے ہیں، نئی نئی کلوں کی فرمائشیں ہوتی ہیں بعینہ اُسی طرح جیسے آپ طرح کا مصرعہ مشتہر کرتے ہیں اُن ملکوں میں کلوں کی فرمائشیں ہوا کرتی ہیں اور دوسرے ہفتہ میں موجد اُس آلہ یا کل کا نقشہ اور ترکیب شائع کر دیتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں صرف خیالی ایجاد یعنی مضامین شاعرانہ کی قابلیت بھی مسلوب ہے، فاعتبروا یا اولی الابصار۔ اور سبب اس عدم قابلیت کا وہی جہل مرکب ہے جس کو حکمائے اخلاق لاعلاج کہتے ہیں، مادۂ ایجاد کے روکنے والے ہمارے ملک کے بیجا اور بے محابا معترض ہیں جن کی کوتہ نظری اور تاریک خیالی اُن کو کسی نئی بات کے سننے کی اجازت نہیں دیتی، اس میں شک نہیں کہ شاعرانہ مذاق ایک اکتسابی امر ہے اور جو لوگ اس طرف توجہ کرتے ہیں۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اُن کو کسی نہ کسی حد تک اچھے بُرے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ اس سبب سے خواہ اپنا شعر ہو خواہ پرایا اس کا حسن و قبح معلوم ہونے لگتا ہے۔ ہر فرد کا جی چاہتا ہوگا کہ کوئی نئی بات نکالیں اور نکالتے بھی ہیں مگر معترضین بالتمکین کے شکوہ میں دبکر کچھ نہیں کر سکتے بامزہ اور رنگین اشعار کے نہ کہے جانے کا یہی سبب ہے۔ مگر ازبسکہ انسان کی طبیعت جدت پسند ہے لہذا اکثر شوخ طبیعتوں نے وہ پیرایہ اختیار کر لیا ہے جسے اس زمانہ میں ظرافت کہتے ہیں کیونکہ اس صورت میں اکثر قیود کی پابندی سے آزادی ملجاتی ہے اگرچہ اُس کے کلام کو وہ وقعت نہیں حاصل ہو سکتی جو کہ سنجیدہ کلام کے لئے مخصوص ہے اور وہی اُس کا مستحق ہے لیکن اُنکا کلام ظریفانہ ہنسنے ہنسانے کے لئے عمدہ ہے۔

اور وہ کلام جسے سنجیدہ کہنا چاہیئے اُس کا تو بالاکثر یہ حال ہے کہ اُس پر نہ کسی کو رونا آتا ہے نہ ہنسی، نہ منہ سے واہ نکلتی ہے نہ دل سے آہ۔ یعنی اُس کا فیشن اور اُس کا طرز بیان ایسا کہنہ اور مندرس ہو گیا ہے کہ اب اس میں کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ اس حالت کی ترمیم کسی نہ کسی طرح ضرور ہونا چاہیئے، بشرطیکہ وہ لوگ جو ان باتوں کو سمجھ سکتے ہیں اس طرف متوجہ ہو جائیں۔

مراسلہ نمبر ۱۴

اس میں شک نہیں کہ استعارہ بہت مشکل صنعت ہے اور اس کے استعمال میں اکثر غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں جس سے استعارہ بدنما معلوم ہوتا ہے لہذا شاعر کو بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے تاکہ صنعتی غلطیاں نہ ہوں۔ ہم یہاں بعض اُمور کا ذکر کرتے ہیں۔ جن سے احتیاط لازم ہے۔

دو یا زیادہ استعاروں کو ملا دینا یہ خطا اس طرح واقع ہوتی ہے کہ اولاً ایک چیز کو کسی چیز سے

استعارہ کیا اور پھر اُس کے ساتھ مناسبات کسی اور چیز کے بیان کر دیے۔ مثلاً معشوق کے چہرہ کو گل سے استعارہ کیا اور مناسبات ماہ کے ذکر کر دیے۔ اس قسم کی غلطیاں اکثر اشعار میں پائی جاتی ہیں مگر کون کہے اور کس سے کہے ؎

مہندی مل کر مرا ترکِ ستم ایجاد آیا　　خونبہا ہاتھ میں لیتا ہوا جلّاد آیا

یہ شعر کسی کا بہت مشہور ہے، معشوق کو ترک کہا پھر اُس کا مہندی لگانا کیسا، یہ غلطی اکثر شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

استعارہ کے مناسبات غیر متعلقہ کو ذکر کرنا، یہ بھی نہ چاہیئے۔ یہ غلطی اکثر مراعات النظیر کی حد مراعات غیر واجب سے پیدا ہوتی ہے۔ ناسخ کا شعر ہے ؎

جگر بھنتا ہے اک سو اک طرف کورخم پکتے ہیں　　تردد خانۂ دل میں ہے غم کی میہمانی کا

ماخذ اس اہتمام کا یہ ہے کہ غم کی نسبت مشہور ہے کہ اُس سے آدمی دُبلا ہو جاتا ہے اور دُبلا ہونا موقوف ہے خون کی کمی پر اس لیئے کہا گیا کہ غم خون پیتا ہے۔ اب دوسرا استعارہ یہ کیا گیا کہ دل کو گھر سے تشبیہ دی، پھر اس کو باورچی خانہ بنایا غرضکہ اس قدر مہتم بالشان مضمون مگر ہیچ بلکہ مکروہ۔

ان دونوں غلطیوں سے احتراز واجب ہے۔ اگر شاعر کو ظن یا وہم ہو کہ اُس کے کلام میں اس قسم کے سقم موجود ہیں تو چاہیئے کہ اپنے کلام پر معاندانہ نظر کرے اور اس قسم کے اسقام کو نکال ڈالے۔

اب ہم اور بعض صنائع کا ذکر کرتے ہیں جن کے نشان ہماری شاعری زبان میں پائے جاتے ہیں منجملہ اُن کے جن کی بنا مماثلت پر ہے۔ ایک تمثیل ہے۔ یہ نہایت ہی عمدہ اور مفید صنعت ہے خصوصاً بچوں کی تعلیم کے لئے بہت کام کی چیز ہے، مثلاً قصص لقمانیہ۔ ہماری زبان میں تمثیل کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ نظیر اکبر آبادی کا ہنس نامہ اکثر فقیر ڈنڈوں پر گاتے پھرتے ہیں، نفس ناطقہ انسانی اور اسباب مادیہ فانیہ کا ارتباط اور افتراق اس میں بیان کیا گیا ہے۔

مجاز مرسل کے بعض اصناف بھی مماثلت پر مبنی ہیں، مثلاً کل کو جزو سے تعبیر کرنا یا اس کا عکس اگرچہ اس کو علاقہ غیر تشبیہ کے اقسام میں داخل کیا ہے لیکن درحقیقت بنا اس کی تشبیہ ہے۔ دوسری قسم مجاز مرسل کی اسنکدوخیہ، یہ لفظ یونانی ہے معنی اس کے ایک شے کے ساتھ دوسری چیز کا پایا جانا۔ مقصود اس صنعت کا یہ ہے کہ کسی چیز کو باعتبار اُس کے ملازمات کے تعبیر کریں عام اس سے کہ ملازم اس کا جزو ہو یا سوائے جزو کے کوئی اور امر ہو از قبیل اعراض وغیرہ۔

ایک صنعت اس کی یہ ہے کہ جزو شے سے شے کا اسم اخذ کریں اور اس حالت میں اظہار ہے

کہ وہی جزو اختیار کیا جائیگا جو عند الفہم یا عند العقل اقوی ہو۔ مثلاً کہیں کہ ہاتھ خالی نہیں ہے اور مراد اُس سے عدیم الفرصتی ہو۔ اور اس صورت میں عکس بھی بہت موثر ہوتا ہے، اور اس صنعت کے اصناف سے ہے کسی شئے کو اُس کے مادہ سے تعبیر کرنا، مثلاً چاندی سونے سے روپیہ اشرفی مراد لیں اور انھیں اقسام میں داخل تبادلہ صفات مثلاً بستر غم کہنا اور مریض کو مراد لینا یا صف ماتم کہنا اور اہل عزا مراد لینا، گوش شنوا کہنا اور شنونده کو مُراد لینا۔ اور اسی قبیل سے ہے مطلق کو مقید سے تعبیر کرنا اور اس کا عکس اور اسی قسم سے ہے نوع کو جنس سے تعبیر کرنا اور اس کا عکس۔ وہ صنائع جنکی بنا لزوم ذہنی پر ہے تمام صنائع کو ایک ہی نام سے تعبیر کیا ہے یعنی مجاز مرسل، اور اُس کے اکثر اقسام علم بیان کی کتابوں میں مفصل بیان کئے گئے ہیں۔ بنا ان صنائع کی لزوم پر ہے خواہ وہ لزوم اس طرح سے ہو کہ دو چیزوں میں مقارنت ہو، بر سبیل طبیعت یا بربناے عادت اور جبکہ طبیعت اُس کی بنا ہو تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں یا یہ کہ ایک دوسری چیز کا جزو ہو یا نہ ہو۔

مطانومیہ[۱] مجاز مرسل کی وہ قسم جس میں دو چیزوں کی مقارنت باعتبار لزوم عادی کے ہو، اس کے اقسام میں سے ایک علامت ہے۔ مثلاً تاج و تخت سلطنت کے لئے، کاسہ گدا کے لئے۔ آلہ ذوالآلہ کے لئے مثلاً قلم دبیر یا شاعر کے لئے یا تلوار سپاہی کے لئے۔ ظرف مظروف کے لئے۔ سبب مسبب کے لئے مثلاً ریش سفید مرد کبیر السن کے لئے۔ صانع مصنوع کے لئے، مثلاً حافظ کہیں اور دیوان حافظ مراد لیں۔ مثل استعارہ کے مجاز مرسل زبان کی ترقی کے لئے بہت مفید ہے۔ ہزارہا معانی اس صنعت کے ذریعہ سے ادا کئے جاتے ہیں۔

استعارہ یا مجاز مرسل کے ذریعہ سے جو جدید اسما یا افعال لغت میں زیادہ ہوتے رہتے ہیں اُن کے لئے دو زمانے ہوتے ہیں، ایک وہ زمانہ جب وہ نئے نئے وضع کئے جاتے ہیں یعنی جبکہ ذہن اصل ماخذ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اس وقت میں وہ اشعار کے لئے مفید ہوتے ہیں دوسرا وہ زمانہ جبکہ ذہن اصل ماخذ کی طرف حرکت نہیں کرتا۔ اسی زمانہ میں اُن کی قوت شعری سلب ہو جاتی ہے، اب وہ ایک لغت کے طور پر باقی رہ جاتے ہیں۔ اس مطلب کو سمجھ کے شاعر یا منشی کو چاہئیے کہ جب اس قسم کے الفاظ کام میں لائے جن کی بنا کسی صنعت شعری پر ہو تو یہ ضرور ملاحظہ کر لے کہ آیا اب اُس کی قوت ویسی ہی باقی ہے یا اُس سے کچھ کم جو ابتدائے وضع میں تھی اور اگر ایسا نہیں ہے تو ایسے الفاظ کا استعمال مقصود شعری کے لئے مفید نہ ہوگا۔

[۱] لفظ مطانومیہ کے معنے یونانی زبان میں تغیر علم کے ہیں یعنی کسی چیز کے نام یا علامت کو بدل دینا۔

(۵)

یہ مراسلہ میرا شاعری اور فلسفہ کے تقابل میں ہے۔ جن صاحبوں نے میرے پچھلے مراسلات پڑھے ہیں اُن کو اس مضمون سے زیادہ لطف آئے گا۔

ہم اگلوں سے سنتے آئے ہیں کہ شاعری حکمت کی چھوٹی بہن ہے، واقعی کیا اچھی تشبیہ ہے، اِن دونوں کی صورت اور مزاج کی یکرنگی اور اتحاد ایک مختصر مگر عام فہم عبارت میں صرف اسی قریبی رشتہ سے سمجھائی جاسکتی ہے۔ ایک نوخیز پُر مذاق وارفتہ فراج علم دوست طبیعت بہ مشکل ایک کو دوسرے پر ترجیح دے سکتی ہے۔ اگر ایک دل آرا ہے تو دوسری بھی ضرور دلفریب ہے۔

ہومر سا پختہ کار عالی دماغ شاعر جو حکیم نہ ہو۔ افلاطون سا نکتہ سنج نغز گفتار حکیم جو شاعر نہ ہو۔ ایک کو شاعری کی شوخ نگاہی اور کافر ادائی نے سب طرف سے پھیر کر لُبھا لیا۔ دوسرے کو فیلوسوفیہ کی شرم آلود نگاہیں اور دیرآشنائی نے لڑکپن کی منگیتر سے چھوڑا کر اپنا بنالیا۔ پھر نہ اُس شاعر دل سے اُس پاک محبت کا مذاق چھوٹا جو شاید کسی دنیاوی غیر ارادی سبب نے اُس سے چھوڑا دیا تھا اور نہ اس حکیم کے سر سے اُس نشہ کا خمار اترا جس کو کسی ناصح مشفق نے ملامت کی ترشی سے دفعتہً اُتار دیا تھا۔

مشیئت نے جس کو جس کام کے لئے بنایا تھا وہ اُس سے خوب بن آیا دونوں اپنی اپنی قسمت پر راضی رہے اور لطف اُٹھایا کیئے۔

صرف انھیں دو مثالوں پر حصر نہیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے حکیم اس دنیا میں فی الحقیقت شاعر تھے۔ اور بہت سے شاعر فی الحقیقت حکیم تھے۔ میں کچھ اس پر بھی ترقی کیا چاہتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ہر ایک حکیم ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر ہے اور ہر ایک شاعر ایک ادنیٰ درجہ کا

١ه فوطیقہ یعنی شاعری و فیلوسوفیہ یعنی فلسفہ یہ دونوں لفظیں یونانی ہیں مونث ہیں۔ اگرچہ ہماری زبان میں فلسفہ کو لوگ مذکر بولتے ہیں، لیکن اُس کا مرادف حکمت مؤنث ہے لطف تشبیہ لفظی صرف اُس صورت میں باقی رہیگا جبکہ دونوں مؤنث ہوں۔ میرے قلم سے اکثر فلسفہ بصیغۂ مؤنث نکل گیا ہے۔

٢ه ہومر واسطے اخذ معاش کے اپنے اشعار کو گا کر روٹی کماتا تھا۔

٣ه افلاطون نے سقراط کے وعظ کے اثر سے فوراً شاعری کو ترک کیا اور بیس برس لکھا جو کچھ کہا تھا اس کو جلادیا۔

حکیم ہے۔ حکمت اعلیٰ درجہ کی شاعری ہے اور شاعری ادنیٰ درجہ کی حکمت ہے۔

حکمت اور شاعری دونوں کا تعلق ذہن انسان کی دو مختلف قوتوں سے یا یوں کہو کہ ذہن انسان کے دو مختلف فعلوں سے ہے، جن کا نام تعقل اور تخئیل ہے مگر یہ دونوں قوتیں یا فعل بلکہ کل قویٰ اور افعال ذہنی باہمدگر کچھ اس طرح مرتبط ہیں کہ ایک کا نقص فرض کر کے دوسرے کی تکمیل تجویز نہیں ہوسکتی

ہر انسان کا ذہن دوسروں کے ذہن سے بلحاظ کمی اور زیادتی قوائے ذہنیہ کے مختلف ہے مگر کسی قوت ذہنی کا ایک معیار خاص سے کم ہوجانا ایک قسم کی دیوانگی ہے اور ان سب قوتوں کے اعتدال کا نام کمال انسانی ہے

اگرچہ حکمت کو تعقل کے ساتھ اور شاعری کو تخئیل کے ساتھ ایک نسبت ہے مگر دونوں کو اور افعال ذہن کے ساتھ بھی بہت کچھ تعلقات ہیں، مگر ان دونوں کے تعلقات میں قوائے ذہنی کے ساتھ باہمدگر فرق ہے اور اسی فرق کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے۔ اسی سے ایک یعنی فلسفہ علم ہے اور دوسری یعنی شاعری فن ہے۔ فلسفہ کو تعقل سے جو خاص نسبت ہے اس کے علاوہ بھی اور قویٰ سے بہت تعلق ہے اور شاعری کو تعقل سے بالکل کم تعلق ہے اور تخئیل سے بہت زیادہ اور اور قوتوں سے بہت کم۔

فلسفہ اور شاعری کی غائتیں بھی بالکل مختلف ہیں۔ فلسفہ کی غایت ذہن انسانی کی تکمیل ہے اور شاعری کی غایت ذہن انسانی یا تخئیل کو خوش کرنا۔

ان دونوں کے فعل بھی جُداجُدا ہیں، فلسفہ ذہن انسانی کو تحقیق حق کی طرف رجوع کرتی ہے اور تلبیس اور مغالطہ سے اُس کو نفرت ہے اور برخلاف اُس کے شاعری کی بڑی صفت دھوکا دینا ہے

اور اسی صفت کے اعتبار سے شاعری کو اکثر مصوّری سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جس طرح مصوّر کی بڑی تعریف یہ ہے کہ وہ کسی چیز کی ایسی تصویر بنائے گا جس کے دیکھنے والے کو اصل چیز کا دھوکا ہوجائے اُسی طرح شاعر کی بڑی صفت یہ ہے کہ اُس کا شعر سننے والے کے دل میں ایسی لذت یا ایسا لذت آمیز الم پیدا کردے کہ جس کے پیدا ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہ ہو۔

مگر مصوّری اور شعر اگرچہ دونوں ہم کو دھوکا دیتے ہیں لیکن اُن کا اثر نہایت ہی مزے کا ہے۔

شاعری اور مصوّری جس چیز کا جلوہ دکھاکر ہم کو دھوکا دیتے ہیں وہ بجائے خود اور بذات خود نہایت دل پسند اور دلفریب ہے، میری مراد خوبصورتی سے ہے اس لئے کہ مصوّری خوب صورت کا نقل

کرنا ہے کہ وہ نقل محسوس البصر ہو اور شاعری خوبصورت چیز کا بیان ہے کہ اُسکا تصور دل میں پیدا کر دے۔

یہ تعریف موافق متقدمین کے لکھی گئی ہے۔ متاخرین نے اس تعریف کو اور بھی وسعت دی ہے اور ان کے نزدیک مصوری کسی چیز کی خواہ وہ کیسی ہی ہو نقل کرنا ہے کہ وہ نقل آنکھوں کو بھلی معلوم ہو اور شاعری کسی چیز کا خواہ وہ کیسی ہی ہو ایسا بیان ہے کہ وہ بیان دل کو خوش کرے۔

ان دونوں تعریفوں کا فرق ان دو لفظوں سے خوب ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ اگلے زمانے میں اگر کوئی بدصورت آدمی کسی مصور کے پاس آجاتا اور کہتا کہ میری تصویر بنا دے تو وہ کہتا کہ تیری تصویر کو کون بنائے جب تیری صورت دیکھنا کوئی پسند نہیں کرتا۔ اور ویسا ہی ایک شخص اس زمانے میں کسی مصور کے پاس جائے اور کہے کہ میری تصویر بنا دے تو وہ یہ کہے گا آئیے بسم اللہ اگرچہ آپ کی صورت کوئی دیکھنا پسند نہیں کرتا مگر میں آپکی تصویر ایسی ہو بہو بناؤنگا کہ سب اُسکو بڑی خوشی سے دیکھیں گے۔

اگرچہ متاخرین کی تعریف بہت وسیع اور نہایت قابل قدر ہے مگر وہ نگاہ جس کو اچھی صورت کے دیکھنے کا لپکا ہو وہ اکثر صناع کے کمال اور فن کی باریکیوں کو نظر انداز کر کے اکثر انھیں تشبیہوں کو ڈھونڈھتی ہے جن کے دیکھنے سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ کمالِ فن کے اعتبار سے متاخرین کا مقصد بہت عمدہ ہے لیکن غرض کے اعتبار سے متقدمین کی تجویز بہت درست ہے۔

شیخ سعدی نے اس مضمون کو ایک شعر میں خوب ادا کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اچھی آواز اور اچھی صورت اپنی اپنی جگہ پر دونوں اچھی ہیں مگر وہ کیسا دلربا اور خوش ادا ہوگا جس میں یہ دونوں صفتیں جمع ہو جائیں۔

اس غایت پر نظر کر کے کسی فارسی والے نے کیا خوب شعر کہا ہے ؎

شعر گفتن بلکہ در سُفتن بود شعر فہمیدن بہ از گفتن بود

یہ شاعرِ فارسی شاید اُن لوگوں میں تھا جنھوں نے شعر کو صرف فنون کے احاطہ میں اُس کے محدود ہونے کو پسند نہ کیا اور اُس کو فلسفہ کے ایک شعبہ کا موضوع بنا دیا۔ میری مراد اس شعبہ سے ہے جس کو اہل حکمت "حب الجمال" یعنی اچھی صورت دیکھنے اور اُس کے پسند کرنے کا مذاق کہتے ہیں۔ اس شاعر نے کس عمدگی سے شعر کو حکمت کے مقاصد میں داخل کیا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ شعر جس حد تک کہ وہ ایک عملی صناعت ہے جسکو اُس نے شعر گفتن سے تعبیر کیا ہے حکمت میں داخل نہیں ہو سکتا ہے اس لیے کہ حکمت صرف نظر کرنا ہے نہ عمل کرنا۔ پھر اُس نے کہا کہ شعر فہمیدن، یعنی الفاظ اور زبان کے ذریعہ سے جو مطالب اور مفاہیم ایسے ادا کئے جاتے ہیں کہ جنکا انسان کے دل اور دماغ پر خاص اثر ہے اُس کا سمجھنا یا اُس پر نظر کرنا اُس فن سے بہتر ہے۔ پھر شعر کے فن ہونے کی کیا اچھی مثال دی دُر سفتن، موتی پرونا قطع نظر اسکے

کہ ایک پیشہ ہے بجائے خود عمدہ ہے اس لئے کہ گول شفاف چمکدار چیزوں سے ہر وقت کام رہتا ہے اور پھر یہ کام دشوار بھی ہے اسی طرح شعر کہنا بھی مشکل ہے مگر با ایں ہمہ کہ وہ ایسا فن شریف اور لطیف ہے پھر بھی فہمیدن یعنی اُس کے موضوع پر نظر کرنا اُس سے عمدہ ہے اور نظر کرنا صرف صنعت نہیں ہو سکتا ہے اس لیے کہ صنعت میں شرط یہ ہے کہ شے مصنوع پیدا ہو اپنے اور دوسروں کے استعمال کیلئے۔

فلسفۂ محبّت

(از جناب میر حسن صاحب عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

چشمے دریا میں،
اور دریا سمندر میں جا ملتے ہیں،
فضائے آسمانی کی ہوائیں ایک دوسرے سے ہمکنار ہوتی رہتی ہیں
دنیا کی کوئی شے تنہا نہیں،
کائنات کے جملہ مظاہر، قانون فطرت کے مطابق اپنے آپ کو ایک دوسری ہستی سے وابستہ کر دیتے ہیں
پھر کیوں نہ میں اپنی ہستی کو تیری ذات میں محو کر دوں؟

سر بہ فلک کہسار مصروفِ آسماں بوسی ہیں
موجیں ایک خاص عالم کیف و سرمستی میں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہی ہیں،
کوئی پھول اپنے ہم جنس سے نفور رہے،
تو اس کی یہ خطا قابلِ عفو نہیں سمجھی جائیگی۔
ضیاء مہر کرۂ ارضی کو اپنی آغوش الفت میں لئے ہوئے ہے۔
چاندنی فرط محبت میں سطح محیط کو چومتی رہتی ہے۔
اس تمام بوس و کنار سے کیا حاصل؟
اگر تو مجھے پیار نہ کرے!

(ترجمہ از شیلی)

شیطان کی شکست

(از مسٹر جگیشور پرشاد بیتاب بریلوی بی۔اے ایل ایل بی)

عروس شب افق مشرق کی بے حجاب تجلیوں میں بکمال استغنا اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ مردودِ جنت نے عبا لپیٹتے ہوئے اس حسین منظر کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ تاروں بھرا آسمان اُس کی خودرائی کی تحقیر پر اپنی صد ہزار آنکھوں سے مضحک تھا۔ ابلیس احساس تشہیر سے محجوب اور زعم خودی کی انتقام پرور آگ سے متاثر ہوکر مغرب بعید کی بے پایاں وسعتوں میں روپوش ہوکر تیرہ و تار پنہانیوں میں بوالہوس کے زریں خواب کی مانند گم ہوگیا۔ وہ شیطان کی پہلی شکست تھی جو فتح و نصرت کا پہلو لئے ایک عافیت دشمن تلاطم، ایک بے پناہ شورشِ حشر سے ہمدوش تھی!

مغرب کی سونی دنیا میں شیطان نے اپنا سنہرا جال بچھا دیا

تنویرِ حسن کی نور پاشیوں سے محروم۔ تابشِ جمال کی سحرکاریوں سے نامحرم۔ عشق و جنونِ عشق کی کارفرمائیوں سے بیگانہ۔ شباب و کیفیتِ شباب سے ناآشنا مغرب ایک رنگین کہر میں محو ہوگیا ابلیس کی آتشِ انتقام کے عُریاں و بیقرار شعلوں کی دھندلی چمک سے اس کی بینائی سلب ہوگئی۔ شیطان کا جوششِ غضب تصنع کا نظر فریب ریلا بنکر آبلا اور بادِ خزاں کے خاکستر گل کو پراگندہ کر دینے والے سموم جھونکوں کی طرح بہار پیکر رعنائیوں کو بہا کر لے گیا۔ دستِ خباثت نے معصوم حیا کا زرتار آنچل تار تار کر دیا۔ اور حسنِ ملیح کو عشقِ شراب آوردہ کی معصیتوں کا مایۂ نشاط بنا ڈالا رہبر عقل کی اس لغزش پر روح تڑپی۔ زمین لرزی۔ آسمان تھرایا، اور انسانیت قعرِ مذلت کی نذر ہوگئی۔ اس کے ساتھ سکون و سکوت، مسرت و شادمانی کی بھی قبر بن گئی۔ شیطان اپنی کامیابی پر مسکرایا۔ یہ اس کی پہلی اور مکمل فتح تھی جس نے فرزندِ آدم کے لئے جنتِ گم گشتہ کے دوبارہ حاصل ہونے کی اُمید کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مبہم و موہوم بنا دیا۔

شیطان بروئے خنداں مشرق کی جانب بڑھا

عفوِ تقصیر کے مقدس جذبہ سے مرعوب ہوکر مشرق نے اپنے حریف کو خوش آمدید کہا۔ شیطان نے موقع پاکر پھر وہی طلسم باندھے، وہی سبز باغ دکھائے فطری کمزوریوں نے ماندہ و بے بہرہ قلوب کو متزلزل و متغیر کردیا۔ بدی رنگ لائی۔ ابھی انسان ایک لمحہ کے لئے شاہراہِ مقصود سے بھٹکنے بھی نہ پایا تھا کہ نیکی نے پھر ایک بار کروٹ لی۔ اور پیکارِ حیات میں بقائے حیات کا ثبوت دیکر گم کردہ منزل مغرب کے قلبِ مضطر میں چٹکی لی۔ شیطان اپنی جگہ پر بل گیا اور اُس نے اپنی ساری قوتوں کو یکجا کرکے زور آزمائی کی۔ چاروں طرف ہاتھ پیر مارے۔ سر دُھنا۔ قید و بند اور دار و رسن کا دام بچھایا۔ مگر انسانیت پر قابو نہ پاسکا۔

تبسم روح فضائے بسیط میں بوئے لطیف کی طرح برابر محوِ خرام و مصروفِ گلگشت رہی۔ یہ شیطان کی دوسری شکست تھی، جس نے اس کے طلسمِ فریب کا شیرازہ یکسر منتشر کردیا۔ صبح کاذب کی نقاب اُلٹ کر نورانی آفتاب بامِ عرش پر جلوہ افروز ہوا۔ سورج کی پہلی سنہری کرن آستانۂ مشرق پر جھکی اور اس کی خاکِ پا کو بوسہ دیکر بصد ناز پلٹ گئی۔ جنت نے ایک بار پھر فرزندِ آدم کے قدم چومے اور دنیا کی عظیم ترین شخصیت کے احترام میں دو زانو ہوگئی۔ مشتِ خاک نے اُدھر دیکھا۔ آسمان پر نظر ڈالی — شیطان کا سر خم تھا۔ بشری انکسار تبسم کی صورت میں رونما ہوا۔ اور ساری فضا روح کے لافانی نغموں سے لبریز ہوگئی۔

تصحیح

زمانہ بابت ماچ ۱۹۳۳ء میں صفحہ ۱۹۹ پر جناب ساز چاند پوری کی رباعیاں شائع ہوئی ہیں جس میں پہلی رباعی کا پہلا مصرعہ غلط چھپ گیا ہے، صحیح مصرعہ یہ ہے:-

بے کیف ہے آج کچھ طبیعت ساقی!

اسی طرح زمانہ بابت اپریل ۱۹۳۳ء میں صفحہ ۲۶۱ پر مدہوش صاحب کی نظم "انتشارِ شاعر" کے عنوان سے چھپی ہے اسکے چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ حسبِ ذیل ہونا چاہئے: "خوشبہ ہے مہر و وفا میری جو یہ پاتے ہیں"

زمانہ مئی ۱۹۳۳ء صفحہ ۳۲۱ پر "پارہائے جگر" کے عنوان سے جو دو غزلیں شائع ہوئی ہیں وہ درحقیقت حضرت جگر بریلوی کی ہیں، جگر صاحب مراد آبادی کی نہیں، ناظرینِ کرام تصحیح فرمالیں۔

(ا۔ ز)

مہابھارت فارسی

(پروفیسر مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل)

سنسکرت کی جن کتابوں کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں ان میں سے ایک مہابھارت بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تراجم کے حق میں سب سے زیادہ اہم اکبری عہد (۱۵۵۶ء لغایت ۱۶۰۵ء) ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت کتابوں کے فارسی ترجموں کی بنیاد اکبر سے کافی عرصہ پہلے پڑ چکی تھی۔

غالباً سلطان زین العابدین (۱۴۲۲ء لغایت ۱۴۷۲ء) فرمانروائے کشمیر نے سب سے پہلے مہابھارت کا فارسی ترجمہ (نثر میں) کرایا تھا[1]۔ اس کا نسخہ کہیں ہے یا نہیں اس کی بابت کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ اکبری عہد کی، فارسی مہابھارت کا نسخہ میری نظر سے گذرا ہے اور اس کے متعلق جو حالات معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں۔

صاحب منتخب التواریخ[2] کا بیان ہے کہ اکبری عہد میں مسلمان مصنفین کی متعدد ضخیم کتب (قصص) کے ترجمے ہوئے۔ جن میں بہت سا سرمایہ اور وقت صرف ہوا۔ اسی سلسلہ میں ایک دن اکبر کو خیال ہوا کہ کیوں نہ ہندوؤں کی معتبر کتب کا ترجمہ کرایا جائے۔ جو دینی و اخلاقی تعلیمات وغیرہ سے بھر پور ہیں۔ چنانچہ بادشاہ نے ایک دن چند عالموں کو جمع کیا۔ اور مہابھارت کے فارسی ترجمہ کے لئے حکم دیا۔

بادشاہ نے سب سے پہلے نقیب خاں کو کچھ باتیں بتلائیں۔ اور انہیں فارسی جامہ پہنانے کے لئے فرمایا۔ بعدہٗ عبد القادر بدایونی کو اس کام میں لگایا۔ آخر کار تین چار مہینے میں کل اٹھارہ فصلوں میں سے صرف دو فصلوں (پربوں) کا ترجمہ ہو سکا۔ اس کے بعد ملا شیری و سلطان تھانیسری بھی اس کام کے لئے مقرر ہوئے اور یہ ترجمہ جو ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں شروع ہوا تھا تقریباً چار سال بعد تکمیل کو پہونچا۔

ہاں ملک الشعرا فیضی نے بھی اس ترجمہ میں کچھ ہاتھ بٹایا مگر آخر میں سلطان تھانیسری ہی نے تمام ترجمہ کو کما حقہ درست کیا۔ بادشاہ نے کتاب کا نام رزم نامہ رکھا اور مرزا ابو الفضل نے شرح و بسط کے ساتھ تمہید اسکی لکھی، پھر تصاویر سے مزین ہو کر وہ کتب شاہی کتبخانہ میں رکھی گئی اور اسکی ایک ایک نقل دربار کے ہر ایک امیر نے لی،

---

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۳۴۴ مطبوعہ مطبع نول کشور۔
[2] منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۱۹ - ۳۲۱ مطبوعہ کلکتہ۔

صاحب آئین اکبری کی تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رزم نامہ کے مترجم صرف نقیب خاں، عبدالقادر بدایونی اور سلطان تھانیسری تھے الغرض اس کتاب کے قلمی نسخے ہندوستان اور دیگر ممالک کے بہت سے کتب خانوں میں موجود ہیں اور بعض ارباب علم کے ذاتی کتب خانوں میں بھی ہیں۔ مگر "مہابھارت فارسی" کے نام سے یہ نسخہ منشی نولکشور صاحب کے مطبع لکھنؤ سے بھی ایک اچھے ڈھنگ پر دو ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکا ہے[۵۲] جو بڑے سائز کے کل ۱۲۴۲ صفحات پر مشتمل ہے، اسی مطبوعہ نسخہ میں سے دو اقتباسات ذیل میں بطور نمونہ دئے جاتے ہیں۔

(۱)

"چوں بحکم تیامہ قواعد سلطنت و آداب جہانداری و لوازم آں براجہ جدھشتر گفت، جدھشتر پرسید کہ آنچہ شما فرمودید ضوابط آنست کہ بادشاہان و ارباب دولت را در زمان سلطنت بکار آید اما اگر معاذ اللہ کسے را حادثۂ دست دہد و از گردش زمانہ ناسازگار بفلاکت و ادبار گرفتار گردد۔ و مال و خزینہ در دست او نماندہ باشد و ہر طرف دشمنان، بر و ہجوم آرند بمرتبہ کہ چارہ کار از دست او برود بیان فرمائید کہ او را چہ باید کرد تا باز بحالت اصلی آید"

(ماخوذ از فن دوازدہم فصل آپد دھرم)

(۲)

"راویان ایں کتاب چنیں آوردہ اند کہ چوں بحکم تیامہ ایں ہمہ مواعظ و نصائح براجہ جدھشتر و سری کرشن جیو و دیگراں، گفت ہمہ ایشاں برکمال فضل و دانائی او آفریں کردند و بر جدائی و فوت او تاسف خوردند، و بسیار گریستند چہ یقین می دانستند کہ او در ہمیں روزہا ازیں عالم خواہد رفت بعد ازاں راجہ جدھشتر گفت کہ شما در شانت پرب بسیارے از مواعظ و حکم بیان فرمودید اما خاطر من آرام نمی گیرد و اضطراب خاطر و غم و اندوہ دل من زیادہ می گردد"

(ماخوذ از فن سیزدہم)

ان اقتباسات کا مقابلہ اصل سنسکرت عبارت کے ساتھ کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ ترجمہ درحقیقت لفظی نہیں ہے بلکہ ترجمہ میں سنسکرت کے اصلی مفہوم کو فارسی لباس پہنایا گیا ہے۔

کلکتہ ریویو (غالباً ۱۹۲۵ء) میں مہابھارت فارسی کے متعلق ایک مضمون کسی صاحب کا نکلا تھا جس میں مقالہ نگار نے مہابھارت فارسی کے ان متعدد نسخوں کا حال درج کیا تھا۔ جو دنیا کے مختلف کتب خانوں میں ہیں مگر کئی نسخوں کے بارے میں مقالہ نگار نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ نسخے از روئے عبارت ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں ممکن ہے کہ جن دو ترجموں کا بیان اوپر ہوا ہے ان میں سے دونوں یا کسی ایک سے ہی ملتے جلتے بقیہ نسخے ہوں یا یہ کہ کسی دیگر ترجمہ پر ان تمام بقیہ نسخوں کی بنیاد ہو۔

---

[۵۱] آئین اکبری جلد اول صفحہ ۱۰۴ مطبوعہ مطبع نول کشور۔

[۵۲] سنہ اشاعت مندرج نہیں، ممکن ہے کہ یہ ترجمہ ۱۸۸۳ء کے قریب شائع ہوا ہو کیونکہ اس قسم کی چند کتابیں اسی سنہ کے کچھ پہلے اور بعد کی شائع شدہ ہیں۔

شرافتِ نفس
(ایک قصہ)

(از مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی)

(۱)

اسم بامسمیٰ جمیلہ مختصر سے ایشیائی طرز پر آراستہ کمرے میں گاؤتکیئے کے سہارے ایسے انداز میں نصف دراز ہے جو اکثر نازنینوں کی فطرت میں داخل ہوتا ہے، اگرچہ وہ عمر کے سولھویں سال میں داخل ہو چکی ہے لیکن ہنوز آلام دنیا سے اس کا دامن پاک ہے. اس کا خداداد حسن ایک کھلے ہوئے پھول کی طرح دیکھنے والے کے دیدہ و دل کے لئے باعثِ مسرت ہے۔

اس کی تربیت شریف و نجیب آغوش میں ہوئی ہے، یہی سبب ہے کہ حسنِ ظاہری کے ساتھ محاسن باطنی بھی اُس کی ذات میں بخوبی پائے جاتے ہیں، اس کی اطاعت شعاری سے اس کے بزرگ راضی، اُس کی مہربانیوں سے اس کے چھوٹے مطیع، اس کے اخلاق حمیدہ سے اسکے سب عزیز گرویدہ ہیں۔

شادی کی بات چیت تو اکثر جگہ سے آئی لیکن اس کے والد نے اپنے بھتیجے کو اس لئے منتخب کیا کہ وہ صورت، سیرت، علم و فضل، لیاقت و شرافت طبعی سے جمیلہ کا شوہر بننے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اس کی غیرت و حمیت کے افسانے اپنے پرائے میں زباں زد تھے، اور وہ مغربی روشنی میں خالص مشرقی تھا.

بات پختہ ہو چکی تھی، کئی دفعہ نکاح کی تاریخ بھی مقرر ہوئی لیکن اُس کے والد کی خطرناک علالت نے یہ رسم اب تک پوری نہ ہوتے دی. گذشتہ موقعہ پر تو اعزا کو تو یدبھی دیجا چکی تھی۔ اور پوری امید تھی کہ اس مرتبہ لئیق (جمیلہ کا منگیتر) کا گھر آباد ہو کر اُس کے والد کی دیرینہ حسرت پوری ہو جائیگی. مگر

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

برات روانہ ہونے میں پورے چار روز باقی تھے کہ اُس کے والد نے داعی اجل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے دنیا کو چھوڑ دیا۔

(۲)

یہ واقعہ بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھا اور اس کے بعد لئیق کے طرزِ عمل میں یکسر تغیر و تبدل ہو گیا دنیا کی نگاہوں میں اُس کے والد امیرِ کبیر اور رکنِ شہر تھے، مگر یہ راز کسی کو معلوم نہ تھا کہ اُن کی دس سالہ علالت نے اُن کے کاروبار کو تحس نحس کر دیا تھا، تجارت قریب قریب ختم ہو چکی تھی اور علاقہ کی آمدنی گھٹتے گھٹتے آدھی رہ گئی اور علاج و معالجہ میں قرض کا بار جائداد سے بھی بڑھ گیا۔

رسم و رواج کے سامنے مذہب کو بھی ہزیمت قبول کرنا پڑتی ہے، شادی ہو یا غم ہر موقعہ کی رسمیں جدا ہیں جن پر عمل کرنا واجب و لازم۔ نماز و روزہ جو فرائض میں داخل ہیں ترک ہو جائیں تو پروا نہیں، مگر کسی موقعہ کی کوئی رسم کسی مجبوری سے ترک ہو جائے تو طوفان برپا ہو جاتا ہے۔

لئیق کے باپ کا مرنا کسی معمولی آدمی کا مرنا نہ تھا کہ چپ چپاتے تجہیز و تکفین ہو جاتی۔ ابھی لاش بھی دفن نہ ہوئی تھی کہ یار لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ لئیق نہ بیوقوف تھا نہ کوتہ اندیش، نہ جاہلانہ رسموں کا قائل، مگر ایسے موقعوں پر اس کی بات کون سنتا ہے۔ وہ پہلو تہی کرتا رہا۔ مستقل سے ڈراتا دھمکاتا رہا تاہم وہ بزرگ جو ایسے موقعوں پر کچھ تو وجاہت ذاتی اور کچھ اعتماد و قرابت کا اثر ڈالکر اپنی سی کر گذرتے ہیں بھلا ایک طفلِ دبستاں کی کب سننے والے تھے۔ نتیجہ وہی نکلا جو اکثر ایسی حالتوں میں پیش آتا ہے۔ خوب دھوم دھام سے سوم ہوا، توڑے بندی کی گئی، اور چالیسواں تو ایسی اولوالعزمی سے کیا گیا کہ بڑے بوڑھوں نے متفق اللفظ ہو کر فتویٰ دیدیا کہ "ہمارے ہوش میں اس سیر چشمی سے کسی نے کام نہیں کیا"۔

لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ لئیق بیچارہ وسیع دنیا کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مارنے کو بیک بینی و دو گوش چھوڑ دیا گیا۔ ہرچند کہ اس کا سن و سال کچھ زیادہ نہ تھا لیکن مبدءِ فیاض نے عقل و ہوش کی نعمت عطا کی تھی جس نے اُسے مآل اندیش و نتیجہ فہم بنا دیا تھا۔ اس نے تباہ حالی کا علاج سوچا اور ساری املاک فروخت کر کے مہاجنوں کا قرض بیباق کر دیا۔

اب بیٹھنے کا ٹھکانا باقی نہ رہا، وہ شہر جہاں اس کی امارت کے گیت گائے جاتے تھے ہنسنے والوں سے معمور نظر آنے لگا۔ جدھر سے گذرتا انگلیاں اُٹھتیں۔ مگر ایک گھر، ایک کاشانہ اکرام اُس کے لئے اب بھی آغوش کشا تھا۔ جمیلہ کے والد تقاضوں پر تقاضے کر رہے تھے کہ وہ اُن کی نورِ نظر کو کنیز اور مکان کو اپنا گھر سمجھکر بزرگوں کے تجویز کئے ہوئے رشتے کو شرعی رسوم کے ذریعہ استحکام بخشے۔ لیکن لئیق کی غیور طبیعت سسرال کے ٹکڑوں پر زندگی گذارنے کی روادار نہ تھی۔ ہرچند مرحوم باپ کی وصیت پر

عمل کرنا اس کا فرض مقدم تھا۔ تاہم غور کرنے سے اس منزل میں ایسے دشوار گذار خارزار نظر آتے تھے جن میں ہو کر سلامت گذر جانا بظاہر ناممکنات سے تھا۔ وہ ہرگز ہرگز گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک ناز و نعم میں پرورش پائی ہوئی نازنین کو عقد میں لا کر اپنے ساتھ ہدف آلام بنائے یا غیرت و خودداری کو بالائے طاق رکھکر خود اس کے ٹکڑے توڑے۔ اس معاملہ پر ایک ہفتہ کامل غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب تک اپنی حالت سدھار نہ لے اس تقریب کو ملتوی رکھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ دولت پیدا کرنے میں خدا معلوم کتنا عرصہ صرف ہو؟ پھر یہ بھی یقینی نہیں کہ کامیابی ہی نصیب ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ بار بار کی کوششیں بھی رائگاں جائیں۔ ان پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے اس نے جمیلہ کے والد کو ایک خط کے ذریعہ مطلع کر دینا مناسب سمجھا کہ فی الحال نکاح نہیں ہو سکتا اور نہ اس وقت اس کی کوئی آیندہ تاریخ ہی مقرر کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی صاحبزادی کو کسی لائق لڑکے سے بیاہ سکتے ہیں۔

اس خط کو ڈاک کے سپرد کر کے وہ بیک بینی و دو گوش اپنے شہر اپنے پیارے وطن پر نگاہ حسرت ڈالتے ہوئے نکل کھڑا ہوا۔

(۳)

ڈپٹی جمیل احمد (جمیلہ کے والد) ابھی کھانے سے فارغ ہو کر مردانے میں آئے تھے کہ لئیق کا لفافہ ملا۔ خط پڑھا تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ انھیں کبھی وہم و گمان میں بھی خیال نہ آیا تھا کہ لئیق کبھی اُن کی ایسی توہین کر سکے گا۔ انھیں اُس کی تباہیوں اور بربادیوں کا علم تھا اور انھوں نے ہمدردی سے متاثر ہو کر متواتر کئی پیام بھیجے تھے۔ اُن کا دلی منشا تھا کہ لئیق جائداد تلف ہونے کا ملال نہ کرے، جو ہونا تھا ہوا، خدا کی مرضی یوں ہی تھی، یہ گھر بھی اُسی کا ہے، بے تکلف آئے، جائداد و املاک سنبھالے لیکن لئیق نے اُن کی تمام آرزوؤں پر پانی پھیر دیا، اب دنیا اُن کی آنکھوں کے سامنے تاریک ہو گئی۔ بہت دیر تک خط ہاتھ میں لئے ہوئے انھیں حرف نہ سجھائی دیتے تھے اور وہ غم و ہم کا صحیح نقشہ بن کر رہ گئے۔ اُن کی آنکھوں کا تارا زندگی کا سہارا صرف ایک لڑکی جمیلہ تھی جسے آغوش مادر کا چین نصیب نہ ہوا، باپ کی شفقت نے ماں کی گود کا حق ادا کیا۔ اب اس خط نے جمیلہ کے مستقبل کو ان کی نگاہ میں بالکل ملیامیٹ کر دیا۔

بہرحال اُن کی آنکھوں میں ہولناک و تباہ کن مستقبل کا نقشہ پھرنے لگا انھوں نے محسوس کیا کہ وہ مکان جہاں عزیز و اقارب کی چہل پہل نے محشرستان سرور بپا کر رکھا تھا

بے چراغ پڑا ہے، اُس کے مکینوں کا پتہ نہیں، در و دیوار سے اُداسی ٹپکتی ہے، امتدادِ زمانہ کے قلعہ شکن حملوں سے ہزیمت کھا کھا کر چھتیں بیٹھ رہی ہیں........"

وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھوڑی دیر تک واقعات حاضرہ پر غور کرتے رہے چند گھنٹے اسی طرح گذر گئے پھر وہ اس فیصلے پر قائم ہوئے کہ جو ہونا تھا ہو چکا، یہ خبر چھپنے والی نہیں، اس لئے جمیلہ کو حقیقت حال سے آگاہ کر دینا چاہیئے، اور اسے سمجھانا چاہیئے کہ رسم منگنی ترک ہو جانے میں چنداں بُرائی نہیں ہے۔ اگر لئیق نے بے سبب رشتہ سے انکار کر دیا تو خدا نے چاہا اس سے بہتر سے بہتر لڑکا مل جائے گا۔

غرض وہ لئیق کا خط لئے لائبریری میں داخل ہوئے میز کے سامنے بیٹھ کر کاغذ کے پیڈ پر بیٹی کے نام رقعہ تحریر کرنے میں مصروف ہو گئے کیونکہ اس معاملے میں انھیں زبانی گفتگو سے حجاب آیا۔ جہاں تک قلم میں زور تھا انھوں نے پند و نصائح سے بیٹی کے غم و اندوہ کو کم کرنے کی کوشش کی، دنیا کے نشیب و فراز، ذاتی تجربے، سُنی سنائی باتیں تمام لکھ ڈالیں۔ بہرحال یہ واقعہ تمام کر کے لئیق کے خط کے ساتھ لفافہ میں بند کیا، خود دینے کی ہمت نہ ہوئی تو گھنٹی بجا کر خدمتگار کو طلب کیا اور اُسے دیکر اندر بھجوانے کی تاکید کر دی۔

(۴)

یہ رقعہ نہ تھا کڑکتی ہوئی بجلی تھی جس نے جمیلہ کے خرمنِ امید کو جلا کر خاکستر کر دیا، شرمیلی اور متحمل لڑکی زبان سے کیا کہتی، دل میں گھٹ گھٹ کر رہ گئی اور اس کا پھول سا چہرہ کمھلا کر زرد پڑ گیا، آنکھوں سے وحشت ظاہر ہونے لگی، دل ایک مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ دن اُداس اور راتیں سنسان ہو گئیں، مسرت کی جگہ افسردگی نے لے لی، اور وہ دنیا میں ایک مایوس زندگی گذارنے کو رہ گئی۔

ڈپٹی صاحب کی صحت پر اس واقعہ نے ناگوار اثر کیا، ہر وقت کی افسردہ خاطری، قلق و اندوہ نے بیمار کر دیا، عمر بھی زیادہ آ چکی تھی، شباب کی قوت موجود نہ تھی جو امراض کے حملوں سے مقابلہ کرتی، ضعف پیری نے جلد جلد ہزیمت قبول کرنا شروع کی اور آخر دو تین ماہ علیل رہ کر ملک عدم کو سدھار گئے۔

اب جمیلہ کے لئے بیشمار مشکلات پیدا ہو گئیں، گھر میں کوئی مرد نہ تھا جو جائداد و املاک کا انتظام کر سکتا۔ وہ نو عمر لڑکی بیرونی دنیا سے ناواقف، بے خبر، ناتجربہ کار تھی۔ اس پر باپ کے مرنے کا رنج

از حد ہوا۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب چاروں طرف سے مایوسیاں گھیر لیتی ہیں تو استقلال کی قوت عود کر آتی ہے اور کمزور سے کمزور انسان بھی مصائب کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے، یہی حال جمیلہ کا ہوا۔ وہ بساط غم اُلٹ کر آلام زندگی کا مقابلہ کرنے پر کمربستہ ہو گئی۔ اس کے ماموں زاد بھائی نے انھیں دنوں میں کالج سے ڈگری حاصل کی تھی، دوران تعطیل میں جب کبھی وہ مکان آتا تو جمیلہ سے مخلصانہ برتاؤ کرتا۔

اس موقعہ پر اس نے جمیلہ کے ساتھ قابل قدر ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کی جائداد اور تعلقہ کا انتظام باقاعدہ کر کے کارندوں کو جتا دیا کہ ڈپٹی صاحب کی موت کے باوجود ان کو جائداد پر ہاتھ صاف کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

اس نے جائداد کے بندوبست ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ خالص ہمدردی سے جمیلہ کے راز دل کو بھی دریافت کر لیا، چنانچہ اُس نے طے کر لیا کہ جس طرح ہو سکے لیئق کو تلاش کر کے جمیلہ کی المناک زندگی کو ختم کرنا چاہیئے۔

(۵)

بمبئی کے عالی شان بازاروں میں لیئق روزگار تلاش کرتا پھرتا ہے، لیکن زمانہ کی مخالف ہواؤں نے تجارت کو شدید دھکا پہنچایا ہے۔ بڑے بڑے تجار اپنی عزت کو سنبھالنے کی فکر میں مبتلا اور ساکھ قائم رکھنے کی تدبیروں میں مصروف ہیں نئے آدمی پر جلد بھروسہ کرنے سے محترز رہتے ہیں۔ چنانچہ دو ہفتوں کی کامل دوڑ دھوپ کے باوجود بھی لیئق کو کہیں کام نہیں مل سکا۔ چند ہی روز کے قیام میں اس کا مختصر سرمایہ ختم ہونے لگا، اور گو وہ مصیبتوں سے چیخ اُٹھنے والا دل نہ رکھتا تھا لیکن دو ہفتوں کی مسلسل ناکامی نے اُسے بدحواس سا کر دیا

ایک دن جب وہ آوارہ و سرگرداں پھر رہا تھا ایک نوجوان جنٹلمین سے ملاقات ہو گئی۔ پہلے تو اس نے بغور دیکھا پھر کچھ سوچ کر لیئق کے قریب پہنچکر سوال کیا:۔

"کیا میں کچھ دریافت کر سکتا ہوں؟"

لیئق:۔ "ارشاد"

جوان:۔ "آپ بمبئی کے باشندہ نہیں معلوم ہوتے ہیں"

لیئق:۔ جی ہاں، درست ہے۔

جوان: اور غالباً بیکاری کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔

لئیق: شامت اعمال سے ایسا ہی ہے۔

جوان: تو کیا آپ میرا مخلصانہ مشورہ قبول کر سکتے ہیں؟

لئیق: میرے لئے اس وقت تنکے کا سہارا بھی بہت ہے۔

سامنے سے وکٹوریہ گاڑی گذر رہی تھی، جوان نے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور لئیق کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وکٹوریہ پر جا بیٹھا۔

لئیق مسحور معمول کی طرح چون وچرا کئے بغیر نوجوان کے اشاروں پر اس کی مرضی کے مطابق کام کر رہا تھا، چنانچہ چپ چاپ جوان کے ساتھ گاڑی پر جا بیٹھا۔ حقیقت میں وہ نوجوان کے بھیس میں ایک فرشتہ کو دیکھ رہا تھا جو اس کی مشکلیں آسان کرنے کو آسمان سے اُتر آیا تھا۔

گاڑی چوپاٹی پہنچکر ایک خوبصورت بنگلے کے احاطہ میں داخل ہوکر برساتی میں جا کھڑی ہوئی۔ نوجوان لئیق کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا اُترا اور ہال میں داخل ہوکر نرم وگداز مخملی صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا اور ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ کسی اہم معاملہ پر غور کر رہا ہے۔

لئیق بھی خاموشی کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک کامل سکوت رہا، پھر نوجوان نے سلسلۂ کلام جاری کیا۔

نوجوان: مجھے اپنا تعارف خود ہی کرادینا چاہیئے، میں کسی شخص ثالث کو بیچ میں ڈالنا پسند نہیں کرتا بہرحال میرا نام نصیر احمد ہے، قاضی بشیر احمد میرے والد ابتدائے عمر سے حیدرآباد میں ملازم تھے اور اب پنشن لیکر وطن میں اللہ اللہ کرتے ہیں۔ میں نے اسی سال کالج سے ڈگری حاصل کی ہے، اور عام جوانوں کی طرح نوکری یا بہ الفاظ دیگر غلامی کی زندگی پسند نہیں، اس لئے چھوٹی موٹی تجارت کے ساتھ کاروباری زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں، مگر تنہا شخص تجارت کی ذمہ داریوں کا بار نہیں اُٹھا سکتا لہذا چاہتا ہوں کہ کوئی سہیم کار ایسا مل جائے جو دیانت داری سے میرا ہاتھ بٹا سکے، میں اُسے نصف نفع پر شریک کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کی وضع قطع سے ہوطنی کی جھلک دکھائی دی اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ میری مرضی کے موافق کام کر سکیں گے، کیا آپ میری اس درخواست کو منظور فرما کر میرے ساتھ کام کرنا پسند کرینگے

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ جس چیز کی تلاش میں لئیق دو ہفتوں سے مارا مارا پھر رہا تھا اُسے حاصل ہوتے دیکھکر اس کا دل مسرت سے لبریز ہوگیا۔ تخئیل نے قبل ہی نوجوان کو فرشتہ بنا کر پیش کیا تھا ان باتوں کے بعد جائے کلام نہ رہی۔

لیئق: (احسانمندانہ نظر سے) آپ کی نوازشوں کا شکریہ۔ میں دو ہفتوں سے کام کی فکر میں تھا خدا کا شکر ہے کہ اُس نے آپ کے دل میں خیال پیدا کر دیا، میں مقدور بھر کوشش کرونگا کہ اپنے آپ کو آپ کے اعتماد کا اہل ثابت کر سکوں۔

(۷)

نصیر احمد نے ایک دوکان کھول دی اور لیئق کو منیجر بنا کر سیاہ و سفید کا اختیار دیدیا۔ لیئق نے دل لگا کر محنت کی اور کاروبار کو سنبھال لیا، اُس کی اَن تھک کوششیں بار لانے لگیں اور روز بروز سرمایہ بڑھنے لگا۔

لیئق نے اتنی ترقی پر قناعت نہ کی بلکہ جوں جوں سرمایہ بڑھتا گیا وہ کئی دوسرے کام بھی کرتا گیا۔ اور حسابات ہمیشہ نصیر احمد کے پاس بھیجتا رہا۔

نصیر احمد بھی دوسرے تیسرے مہینے بمبئی آکر اپنی آنکھوں سے لیئق کی کارگذاریاں ملاحظہ کرتا، اور دل ہی دل میں اُس کی محنت، معاملہ فہمی، دیانت اور ایمانداری کی قدر کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

لاکھوں روپیہ کا کاروبار پھر نگرانی بھی سخت نہیں، مگر لیئق نے ناجائز طور پر ایک کوڑی بھی اپنے ذمہ خرچ کرنا پسند نہ کیا۔ کوڑی کوڑی کا حساب مرتب، پائی پائی بنک میں جمع، محنت و کوشش کا یہ حال کہ رات کو رات اور دن کو دن نہ سمجھا۔ اس کا انجام نہایت خوشگوار ہوا، دو چار سال کی الٹ پھیر میں لیئق کی تباہ شدہ حالت پھر اصلی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ نصیر احمد نے نفع میں جو اس کا حصہ دیا اس کی مقدار لاکھوں کی تھی۔ چنانچہ لیئق کو اپنی آبائی جائداد واپس لینے کا خیال پیدا ہو چلا تھا۔

آخر یہ آرزو پوری ہونے کا وقت بھی آ گیا۔ اور وہ اس طرح کہ نصیر احمد نے اپنے عقد کی تقریب میں شرکت کا اطلاعی کارڈ بھیجکر فوراً آنے کی تاکید کی۔

اگرچہ کاروبار کی مصروفیت سے چھٹکارا ملنے کی مہلت نہ تھی لیکن وہ اپنے محسن کی دعوت رد نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے رجسٹر دیکھے، روزمرہ کی بکری پر غور کیا، کارندوں کی مستعدی ملاحظہ کی اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر ان کے لئے دستور العمل بنا کر تاکیدی حکم دیدیا جائے تو کاموں میں ابتری نہ پڑے گی۔

دوسرے ہی روز سے اس نے انتظام شروع کر دیا اور تین چار روز میں بندوبست سے فرصت پا کر وطن کو روانہ ہو گیا۔

(۸)

ایک وہ دن تھا جب لیئق اپنے وطن سے بیک بینی و دو گوش بے آبرو ہو کر پردیس گیا تھا آج

وہی لئیق کھوئی ہوئی دولت کو واپس لیکر پھر وطن آرہا ہے۔ جن لوگوں نے مفلوک الحالی میں نگاہیں پھیر لی تھیں آج خیر مقدم کے لئے پلیٹ فارم پر جمع تھے۔ وہ شعرا جنھوں نے پہلے اس کے یہاں سے قصائد کے بڑے بڑے صلے حاصل کئے تھے آج پھر تعریفی نظموں کے مسودے لئے اسٹیشن پر حاضر تھے۔

ٹرین ٹھیک وقت پر پلیٹ فارم سے آلگی۔ لئیق سیدھی سادی وضع میں ڈبے سے نکلا۔ سب سے پہلے نصیر احمد نے مصافحہ کیا، اُس کے بعد بچھڑے ہوئے احباب نے گھیر کر مصافحہ و معانقہ کرنا شروع کیا۔ شاعروں نے نظمیں پڑھیں اور بوڑھے آدمیوں نے ترقی عمر و اقبال کی دعائیں دیتے ہوئے اس کی ہمت و جرأت سعی و کوشش، غیرت و حمیت کی تعریف کی۔

پہلا زمانہ ہوتا تو لئیق کی مسرتوں کا ٹھکانا نہ رہتا۔ لیکن زمانے کی بے اعتنائیوں نے اُسے خاصہ تجربہ کار بنا دیا تھا، اس میں گندم اور جو میں امتیاز کرنیکی تمیز پیدا ہوگئی تھی۔ اب دنیا سازی اُسے لبھا نہ سکتی تھی نہ وہ فریب کاریوں سے پھسل سکتا تھا۔ تاہم حسن اخلاق کے تقاضے سے وہ سب سے خندہ روئی کے ساتھ پیش آیا۔ اسٹیشن کے باہر نصیر احمد کی خوبصورت اور قیمتی موٹر کار کھڑی تھی۔ دونوں سوار ہو کر مکان پہنچے۔

نصیر احمد نے اُس کی آسایش کا پورا پورا سامان مہیا کر دیا تھا۔ ہوا خوری کے لئے اپنی موٹر کار وقف کر دی، مگر لئیق ایک گھڑی کو مکان سے باہر نہیں نکلا۔ جو لوگ گھر پر ملاقات کو آتے اُن میں اکثر بے ملے ہی ٹال دیے جاتے۔ بہت تھوڑے ایسے ہوتے جن سے لئیق تھوڑی دیر گفتگو کرنا پسند کرتا۔

یہ طریقہ ایسا تھا جس نے اُسے بعضوں کے نزدیک مغرور اور کج خلق ثابت کیا اور اُنکی حرف گیری اور نکتہ چینیوں کی ہلکی صدائیں نصیر احمد کے گوش گذار ہوئیں۔ وہ لئیق کے اخلاق و اوصاف کا گرویدہ تھا۔ عام خیالات معلوم کر کے کبیدہ ہوا۔ ایک شب جب دونوں کھانے سے فارغ ہو کر گفتگو میں مصروف تھے تو نصیر احمد نے دریافت کیا۔

"لئیق میرا گمان تھا کہ وطن کی دلچسپیاں تم کو بمبئی کی رونقیں بھلا کر اپنی طرف متوجہ کرلینگی لیکن یہ خیال صحیح نہ نکلا"

لئیق (ٹھنڈی سانس لیکر) بھائی! میری سرگذشت سے آپ واقف ہیں، باہر نکلنے کا قصد کرتا ہوں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے۔ میں نے یہاں آکر اپنی جائداد واپس لینے کی کوشش کی، تفتیش سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کے ہاتھ میری ملکیت فروخت ہوئی تھی اُنھوں نے اب اس جائداد کو کسی دوسرے کے نام بیچ کر دیا ہے۔!"

نصیر: تو کیا تم اس کو واپس لینا چاہتے ہو؟
لئیق: جی ہاں، میرے دل کی آرزو تو یہی ہے۔

(۹)

نصیر احمد سرنیا ہو کر تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا، اُس کے چہرے کے کئی کئی رنگ تبدیل ہوئے آخر میں اس طرح دمک اٹھا جیسے اُسے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ اُس نے لئیق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر سنجیدگی سے کہا۔

"لئیق! مجھے تم سے محبت ہے۔ اور تمہاری جفاکشی اور دیانت داری نے مجھے تمہارا پہلے سے بھی زیادہ گرویدہ بنالیا ہے۔ اس لئے تمہاری چھوٹی سے چھوٹی خواہش بھی میری نگاہوں میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے اس کے پورا کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھونگا۔ تم نے جائداد واپس لینے کا جو خیال ظاہر کیا تو مجھے بھی یاد آگیا کہ حقیقت میں اُس جائداد کا واپس ملنا دشوار نہ ہونے پر بھی دشوار سا ہے۔

لئیق: میں آپ کی تقریر کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

نصیر: درست ہے، میری گفتگو وضاحت چاہتی ہے، بات یہ ہے کہ تم کو یہ جائداد صرف ایک ہی شرط پر واپس مل سکتی ہے۔"

لئیق: میں دونی قیمت دینے کو تیار ہوں، چاہتا ہوں کہ آبا و اجداد کا نام برقرار رہے اس لئے قربانی کرنے میں کوئی تامل نہیں۔

نصیر: یہاں قیمت کا سوال ہی نہیں، صرف ایک شرط منظور کرو بس کل ہی کُل کی کُل جائداد کا بیعنامہ ہو جائیگا۔

لئیق: وہ شرط کیا ہے؟

نصیر: بہت معمولی، صرف اس کی مالکہ سے عقد کرنا ہوگا۔

لئیق متحیر ہو کر رہ گیا، اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نصیر احمد ایسی سنگین شرط پیش کریگا۔ اُس کی آنکھوں میں وہ تصویر پھر گئی جب اُس نے جمیلہ کے والد کو انتہائی حزن و ملال کے ساتھ منگنی ترک کرنے کی اطلاع دی تھی۔ ہر چند اُس نے عام نگاہوں میں اول درجے کی بداخلاقی برتی لیکن وہ خود جانتا تھا کہ اُس کی نیت نیک اور ارادہ پاک ہے۔ اُس کا یہ انکار کسی بدنیتی سے نہیں بلکہ صفائے قلب، حمیت اور غیرت داری پر مبنی تھا۔ وہ مفلوک الحالی میں پھنسا کر

نہ کسی ناز پروردہ لڑکی کی زندگی خراب کرنا چاہتا تھا اور نہ خود ہی سسرال کی روٹیوں پر پڑا رہنا پسند کرتا تھا۔ لیکن اس انکار پر وہ ابتک چین سے نہ تھا۔ آٹھ سال کی طول طویل مدت میں کوئی گھڑی جمیلہ کے خیال سے خالی نہیں گئی، وہ دل کے صنم کدے میں جمیلہ کی مورت چھپائے ہوئے چپکے چپکے اُس کی پرستش کرتا رہا، اس کا عہد تھا کہ جمیلہ کے سوا کسی عورت کو دل نہ دیگا بھلا اب وہ کیونکر یہ شرط منظور کر کے عہد شکنی کر سکتا تھا۔ بہت دیر جواب کا انتظار کرنے کے بعد جب نصیر نے جواب کا تقاضا کیا تو کہا:۔

"میرے محسن! میں افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ اس شرط کو قبول نہیں کر سکتا۔ چاہے میرے ارمانوں کا خون ہی ہو جائے مگر میں مجبور ہوں۔"

نصیر:۔ خیر تمہاری خوشی! ہاں اگر تم میری درخواست قبول کر سکو تو میں کہونگا کہ وہ سبب بیان کرو جس لئے اس زریں موقع سے فائدہ اُٹھانے کے بدلے اپنی دلی خواہش کا خون کرنے پر آمادہ ہو؟

لئیق: آہ! یہ ایک المناک داستان ہے جس کے دوہرانے سے روح لرزتی ہے۔

نصیر: تم کو تکلیف دینا بھی منظور نہیں، خیر میں ہی اپنے اشتیاق کا خون کر ڈالونگا۔

لئیق: ہائے یہ بھی گوارا نہیں، جس نے مجھ پر احسان کیا، جس نے دستگیری کر کے خاک مذلت سے اُٹھایا اور بام ترقی پر پہنچایا اُسے مغموم و مایوس کروں۔ خیر سنیئے:۔

لئیق نے شروع سے آخر تک کل ماجرا بیان کر دیا، گویا کلیجہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ نصیر احمد یوں ہی اس کا گرویدہ تھا، اور اس عالی ظرفی کی داستان سنکر اُس کا کلمہ پڑھنے لگا۔ اب اُس سے بھی ضبط نہ ہو سکا، دل نے گوارا نہ کیا کہ ایسے عالی حوصلہ، نیک نہاد، جوان صالح کو عرصہ تک مغالطہ میں ڈالے رکھے، وہ سنبھل بیٹھا اور کمال متانت و سنجیدگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا:۔

"سنو لئیق! اب تک میں نے تم کو دھوکے میں رکھا، لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اصل واقعات بیان کر کے بیچ سے حجاب ہٹادوں۔ اب تک تم مجھکو جو سمجھتے رہے حقیقت میں میں وہ نہیں ہوں میرا نام اور ولدیت تو صحیح ہے لیکن اور جتنے واقعات میں نے بیان کئے تھے وہ سب فرضی اور مصلحت وقت پر مبنی تھے۔ چونکہ حادثات نے تم کو دیوانہ کر دیا تھا، تمہارا حافظہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ تم میرے نام سے بھی مجھے پہچان نہ سکے۔ غرضکہ دل کو بھول گئے، اور اس حسن اتفاق سے میں نے کافی فائدہ اُٹھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ تم کو میرا ممنون ہونے کے بجائے جمیلہ خاتون کا احسانمند ہونا چاہیئے جنھوں نے میرے پردے میں رہ کر تمہاری تمام وکمال دست گیری کی۔ شاید اب تم کو یاد آگیا ہوگا کہ نصیر احمد جمیلہ کا ماموں زاد بھائی ہے۔ ڈپٹی صاحب کی وفات کے بعد ہی مَیں تحصیل علوم سے فارغ ہو کر واپس آیا اور جمیلہ سے ملا۔ وہ بیحد مغموم تھی، تمھارے رقعہ نے ڈپٹی صاحب کی جان ہی نہیں لی جمیلہ پر بھی عیش و آرام حرام کر دیا، وہ سخت مشکلات میں مبتلا ہو گئی، اس کی کیفیت بیان کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ بہر نوع جو کچھ مجھ سے ہو سکا اُس کی ہمدردی میں کیا۔ بدقت تمام سراغ پایا اور بمبئی جا کر تم سے ملا۔ یہ دوکان درحقیقت جمیلہ کی مرضی اور اُسی کے روپیہ سے محض تمہاری امداد کی غرض سے کھولی گئی تھی۔ حقیقت میں اس کارروائی سے دو باتیں معلوم کرنا تھیں، اول تمہاری جفاکشی اور دیانتداری، دوسرے اخلاق و عادات۔ خدا کا شکر ہے کہ تم ان بڑے امتحانوں میں پورے اُترے اور دشمنوں نے جو جو غلط اور بے بنیاد افواہیں مشہور کر کے تمہاری ذات میں عیب لگانا اور غریب جمیلہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی تھی اُسکی قلعی کھُل گئی۔

سب سے زیادہ تمہاری مسرت کی خبر شاید یہ ہوگی کہ جمیلہ نے آج ہی کے لئے تمہاری تمام فروخت شدہ جائداد خرید لی تھی، اور صرف تمھارے نام پر امیدوں اور تمناؤں کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی۔ اور اس وقت بھی تم سے بالمشافہ گفتگو کرنے کی تمنا میں یہاں موجود ہے۔ اُٹھو اور چل کے اُس کو اپنی خوشنودی کا مژدہ سناؤ۔

لیئق چپ چاپ بیٹھا اس عجیب و حیرت زا گفتگو کو سُن رہا تھا جمیلہ کی شرافت و عالی حوصلگی پر عش عش کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ نصیر کی تقریر نے بت بنا دیا، نہ معلوم کب تک خود رفتگی کا عالم چھایا رہتا وہ تو خیریت گذری کہ نصیر اس کا ہاتھ تھام کر دوسرے کمرہ میں لے گیا جہاں مریم خصال وحور جمال جمیلہ حریری برقع میں لپٹی حسین چہرے پر جالی کی نقاب ڈالے اسکا انتظار کر رہی تھی۔

لیئق کے پہنچتے ہی جمیلہ اُٹھ کھڑی ہوئی، اور خطاوار مجرم کی طرح دست بستہ یوں گویا ہوئی:

"میں نہیں سمجھ سکتی کہ کن لفظوں میں اپنے قصور کا اعتراف کر کے عذرخواہ ہوں۔ میں نے عجیب عنوان سے وہی کارروائی کی جسے آپ نے پسند نہ فرما کر مجھے کنیزی سے آزاد کرنے کا پروانہ بھیجا تھا مگر ہمارے بزرگوں نے ہماری قسمتوں کا جو فیصلہ کر دیا تھا میں اُسے کیونکر ٹھکرا سکتی تھی۔ اگرچہ آپ نے اس اہم مسئلہ پر غور نہیں کیا، اور کوئی آپ کو اس جلد بازی پر مورد الزام بھی نہیں کر سکتا کیونکہ جن مصیبتوں میں آپ کا دامن اُلجھا ہوا تھا اُن کا تقاضا یہی تھا، مگر آپ نے کمال مستعدی اور جراٗت سے زمانہ کی

بادِ مخالف کا مقابلہ کیا، خدا کا شکر ہے کہ اُس کی تائید نے آپ کا ساتھ دیا اور وہ ہوائیں ہوا ہوگئیں کیا اب میرا قصور معاف ہوگا؟"

لیئق بار احسان مندی سے دبا جاتا تھا، وہ بالکل نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ایسی فرشتہ سیرت منکسر مزاج دوشیزہ کی عنایات والطاف کا اعتراف کیونکر کرے۔

نصیر نے وقت کی نزاکت کو محسوس کیا اور مصلحت وقت سمجھکر دونوں کو بے تکلفی کا موقعہ دیتے ہوئے کمرے سے ٹل گیا۔

لیئق دیر تک سرنگوں رہا اور جمیلہ بدستور ہاتھ باندھے کھڑی رہی، آخر لیئق بڑھا اور وفا کیش خاتون کا دستِ سیمیں ہاتھ میں لیکر دباتے ہوئے صرف اتنا کہہ سکا۔

"لیئق تمہارا حلقہ بگوش تھا، ہے اور رہے گا۔"

اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، زمانہ موافقت کر رہا تھا کلفتیں مٹ چکی تھیں، مسرتوں کی بارش شروع ہوگئی، اور اسی ہفتہ میں نصیر اور لیئق کے نکاح کی تقریب ایک ساتھ عمل میں آئی۔

پروازِ خیال

۱۔ میں دیہات کے راستوں پر در بدر بھیک مانگتا پھرا کہ اچانک تیری روپہلی رتھ دُور فاصلے پر ایک حسین خواب کی طرح نظر آئی اور میں حیران تھا کہ یہ شہنشاہ کون ہے؟ میری امیدیں بڑھیں، اور میں نے خیال کیا کہ میری عُسرت تمام ہوئی، چنانچہ اپنی سوال کی عادی زبان کو جنبش تکلم دیئے بغیر خیرات کے انتظار میں کھڑا رہا، اس انتظار میں کہ دولت میرے گرد خاک میں بکھیر دی جائے۔

۲۔ تیری رتھ میری جائے اقامت کے قریب آکر رُکی۔ تیری نگاہ مجھ پر پڑی اور تو ایک مسکراہٹ کے ساتھ نیچے اُتر آیا۔ میں نے جانا کہ میری قسمت بیدار ہوگئی، لیکن اچانک تو نے اپنا دایاں ہاتھ پھیلایا اور کہا "مجھے دینے کیلئے تیرے پاس کیا ہے؟" کس قدر شاہانہ تمسخر تھا، ایک گدائے بینوا کے آگے اپنا دستِ سوال دراز کرنا! میں سٹ پٹا گیا اور کچھ جواب نہ بن پڑا۔

۳۔ پھر اپنے کشکول میں سے میں نے چند جَو کے دانے تجھے دیئے اور مجھے کتنی حیرت ہوئی جب دن ڈھلنے پر میں نے اپنا کشکول جھونپڑے کے فرش پر خالی کیا اور اس اناج کے حقیر ڈھیر میں ایک ادنیٰ مقدار سونے کی دیکھی۔ میں جی بھر کے رویا اور سوچنے لگا کہ کاش! مجھ میں تجھے اپنا سب کچھ دیدینے کی ہمت ہوتی۔

(ٹیگور)

تنقیدِ کتب

اے ہسٹری آف اُردو لٹریچر (انگریزی)

یعنی "تاریخ ادبیات اردو" مصنفہ ڈاکٹر طامس گراہم بیلی، ایم۔ اے بی۔ ڈی۔ ڈاکٹر آف لٹریچر سابق پروفیسر ہندی و اُردو لنڈن یونیورسٹی۔ یہ سوا سو صفحات کی ایک چھوٹی سی انگریزی کتاب ہے، جس پر یقیناً "دریا بکوزہ" کی صفت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس قدر مختصر مگر اس قدر جامع کتاب شاذ و نادر شائع ہوئی ہوگی۔ جس میں شیخ عین الدین گنج العلم (۱۳۰۶ء لغایت ۱۳۹۶ء) سے لیکر علامہ سر محمد اقبال تک دو سو اکتالیس شعراء و مصنفین اُردو کے مختصر مگر محقق حالات درج ہیں۔ اُردو زبان پر اس قدر صحیح اور جچی تلی تنقید کرنیکی توفیق ابتک کسی ہندوستانی مصنف کو نصیب نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر بیلی شمالی ہند کی اکثر زبانوں کے زبردست ماہر ہیں۔ آپ نے شمالی ہند خصوصاً کوہستان ہمالیہ کی پہاڑی زبانوں پر متعدد درسی کتب تصنیف فرمائی ہیں۔ پنجابی زبان کی گرامر، انگریزی پنجابی فرہنگ اور پنجابی مینول و گرامر بھی تصنیف کر چکے ہیں۔ پنجابی زبان کی تحریر و تقریر پر بھی آپ کو غیر معمولی عبور حاصل ہے۔

کتاب زیر نظر ایک مقدمہ، آٹھ ابواب اور متعدد ضمیمہ جات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں فاضل مصنف نے منجملہ دیگر امور مثلاً عروض، اصنافِ سخن وغیرہ لفظ "ریختہ" پر بھی معقول بحث کرکے بتایا ہے کہ "ریختہ" فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "گرایا ہوا" یا "ڈھالا ہوا" اور اصطلاحاً "ریختہ" کا اطلاق ایسے کلام پر ہوتا ہے جو دو زبانوں مثلاً عربی و فارسی یا فارسی و اُردو پر مشتمل ہو۔ (۲) ریختہ کے معنی "گرا ہوا" ہیں، چونکہ اُردو کو ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا اس لئے اُسے ریختہ کہا گیا۔ (۳) اُردو کو ریختہ اس وجہ سے کہتے تھے کہ اس کے اندر ہندی میں عربی و فارسی الفاظ شامل کئے گئے تھے۔ (۴) ریختہ امیر خسرو کی ایجاد کردہ فن موسیقی کی ایک اصطلاح ہے کیونکہ ہندی الفاظ فارسی لحن میں گانے سے زیادہ پیارے معلوم ہوتے تھے (۵) ریختہ کے معنی ہیں مختلف مسالوں کی ایک پختہ و مستحکم تعمیر۔ ناسخ کے بعد (المتوفی ۱۸۳۸ء) شعرائے لکھنو

نے لفظ "ریختہ" ترک کردیا۔ اور اس کے بجائے "اُردو" استعمال کرنے لگے۔ مگر دہلی میں لفظ "ریختہ" غدر ۱۸۵۷ء تک استعمال ہوتا رہا۔

باب اول میں زبان اُردو کی ابتدا سے بحث کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ لفظ "اُردو" ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "لشکر" یا "چھاؤنی" یعنی کیمپ ہیں۔ اور انگریزی زبان کا لفظ "ہورڈ" (Horde) (یعنی لشکر) اسی سے مشتق ہے ۱۱۹۳ء کے بعد دہلی میں جو اسلامی فوجیں تعینات رہیں اُن کو "اُردو" یا "اُردوے معلی" کہتے تھے۔ لیکن درحقیقت اُردوئے معلی کی بنیاد اس سے دوسو برس قبل یعنی ۱۰۲۷ء میں رکھی جاچکی تھی جبکہ سلطانی فوجوں کی چھاؤنی لاہور میں قائم ہوئی تھی، اور ولایتی سپاہیوں اور پنجابی لوگوں کی گفت و شنید اور لین دین کے سلسلہ میں ایک جدید زبان بننا شروع ہوئی جو آیندہ چلکر "اُردو" کہلائی۔ گویا زبان اُردو کا سب سے پہلا پودا وہ تھا جو پُرانی پنجابی کی زمین میں فارسی و ترکی الفاظ کی تخم ریزی سے لاہور میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد جب ۱۱۹۳ء میں مسلمان سپاہیوں کی چھاؤنی دہلی میں قائم ہوئی تو وہ پودا برج بھاشا کی میٹھی اور روچدار بولی سے پیوند کھاکر قلمی ہوگیا جسکے پھلوں کی شادابی و شیرینی ہر زبان پر چٹخارے دینے لگی۔ بہرحال علامہ مصنف کے نزدیک اُردو کی ابتدا ۱۰۲۷ء کے بعد ہوئی۔ جب لاہور میں مسلمان چھاؤنی قائم ہوئی تھی۔

اس زمانہ میں دربار دہلی کی زبان فارسی اور ملک کی زبان ہندی تھی جسے مصنف نے کھڑی بولی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اور ان دونوں زبانوں کے شیر و شکر ہونے سے ایک لشکری بولی پیدا ہوئی، جو "زبان اُردو" کہلائی۔ رفتہ رفتہ "زبان" کا لفظ متروک ہوگیا اور صرف "اُردو" استعمال ہونے لگا لیکن اس نام نے ۱۷۵۲ء کے بعد فروغ پایا۔

باب دوم میں فاضل مصنف نے ادبیات اُردو کی ابتدا سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُردو زبان میں سب سے پہلی کتاب خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۱ء لغایتہ ۱۴۲۲ء) نے "معراج العاشقین" لکھی جو کل انیس ۱۹ صفحات کا ایک مختصر رسالہ مذہب تصوف پر ہے۔ اس کے بعد دوسری کتاب اسی مصنف کے قلم سے "ہدایت نامہ" ظہور میں آئی۔ یہ بھی مذہبی ہے۔ اس باب میں مصنف نے سلسلہ وار شیخ عین الدین گنج العلم (۱۳۰۶ء لغایتہ ۱۳۹۶ء) سے لیکر سید عبد اللہ تیاسی تک بانوے ۹۲ دکنی شاعروں اور ادیبوں کا مختصر تذکرہ کیا ہے، جن میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی مصنف "سب رس" غواصی مصنف طوطی نامہ، ابن نشاطی مصنف پھول بن، طبعی مصنف قصہ بہرام و گل اندام، رستمی مصنف خاور نامہ نصرتی مصنف گلشن عشق، شمس الدین ولی اللہ دکنی، سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے حالات کو خاص

اہمیت دی ہے۔ اس طرح گویا فاضل مصنف نے شمس ولی اللہ کے بجائے حضرت عین الدین گنج العلم کو اُردو کا باوا آدم قرار دیا ہے۔

تیسرے باب میں دہلی اسکول کے ان شعرا کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے جو ۱۷۳۰ء لغایۃ ۱۸۳۰ء گذرے۔ ان میں خاص طور پر ظہور الدین حاتم (۱۶۹۹ء - ۱۷۸۱ء) مرزا جانجاناں مظہر (۱۶۹۹ء - ۱۷۸۱ء) مرزا رفیع السودا (۱۷۱۳ء - ۱۷۸۰ء) محمد تقی میر (۱۷۲۴ء - ۱۸۱۰ء) خواجہ میر درد (۱۷۱۹ء - ۱۷۸۵ء) میر غلام حسن حسن (۱۷۳۶ء - ۱۷۸۶ء) شیخ غلام ہمدانی مصحفی (۱۷۵۰ء - ۱۸۲۴ء) انشاء اللہ خاں انشا (المتوفی ۱۸۱۷ء)، ولی محمد نظیر اکبرآبادی (۱۷۴۰ء - ۱۸۳۰ء) کے حالات پر خاص زور دیا ہے۔

اسی باب میں میر و سودا کا مقابلہ کرتے ہوئے فاضل مصنف نے یہ تنقید کی ہے کہ شاعری میں میر کو مگر زبان دانی میں سودا کو فوقیت حاصل تھی۔ میر کی غزلیں اور مثنویاں اچھی ہوتی تھیں مگر قصیدہ یا ہجو گوئی میں سودا کا مقابلہ کوئی نہ کر سکتا تھا۔ میر فطری شاعر تھا اور سودا کسبی۔ یہی فرق مصنف نے مصحفی اور انشا، آتش اور ناسخ، غالب اور ذوق، داغ اور امیر میں بتایا ہے۔ ہر جوڑ میں اول الذکر فطری شاعر تھا اور دوسرا مصنوعی۔

چوتھے باب میں فاضل مصنف نے لکھنؤ اسکول کے ان شعرا کا تذکرہ کیا ہے جو انیسویں صدی میں گذرے ہیں۔ اس باب میں خلیق و ضمیر، آتش و ناسخ، انیس و دبیر کا مقابلہ کر کے ہر جوڑ میں اول الذکر کو ترجیح دی ہے۔ ناسخ کے بیان میں لکھا ہے کہ انھوں نے زبان اُردو کی تہذیب کی اور تذکیر و تانیث کے متعلق خاص قواعد مقرر کر کے ان کی پابندی کی اور زبان کو صاف کر کے چار چاند لگا دیئے۔

افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے پنڈت دیا شنکر کول نسیم لکھنوی کا حال صرف پانچ سطروں میں لکھنے پر اکتفا کی، حالانکہ گلزار نسیم کا سحر البیان مصنف زیادہ قدردانی کا مستحق تھا۔ علاوہ ازیں مثنوی میر حسن کو اول اور گلزار نسیم کو دوسرا درجہ دیا ہے۔

باب پنجم میں ذوق، غالب، داغ، امیر، تسلیم اور جلال کا تذکرہ لکھا ہے۔ ذوق کو روزمرہ کا بادشاہ اور لفظی تلازمہ کا استاد مانتے ہوئے غالب کو فطری شاعر، شہنشاہ اقلیم سخن صاحب طرز خاص اور نظم و نثر دونوں پر حاوی لکھا ہے۔ امیر و داغ کے مقابلہ میں داغ کو ترجیح دی ہے، لیکن کتاب میں ایسے زبردست استادوں کو دو صفحہ سے زیادہ جگہ نہیں دی جا سکی۔

باب ششم میں نثر اُردو کا حال ہے، جس میں مترجمین فورٹ ولیم کلکتہ اور دیگر ادبا انیسویں صدی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سر سید احمد خاں، شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد، مولانا حالی،

نواب محسن الملک، مولانا شبلی کو خاص اہمیت دی ہے۔ جو واقعی اسی قابل تھے۔ ناول نویسوں کا ذکر کرتے ہوئے مولوی نذیر احمد دہلوی کو مصلح، پنڈت رتن ناتھ سرشار کو مزاحیہ نگار اور مولانا عبد الحلیم شرر کو مورخ بیان کیا ہے۔ افسوس ہے کہ مولوی ذکاء اللہ، مولوی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ علامہ سید علی بلگرامی اور دیگر مشہور ادیبوں کا صرف تین تین چار چار سطروں میں خاتمہ کر دیا ہے۔

باب ہفتم میں اُردو کی جدید شاعری سے بحث کی ہے، اور اس کا سہرا بجا طور پر حالی، آزاد، اکبر الہ آبادی، سرور جہان آبادی اور مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے سر رکھا ہے۔

باب ہشتم خاتمۃ الکتاب پر مشتمل ہے جس میں علامہ سر اقبال کا تذکرہ کر کے ادبیات اُردو پر ایک مجمل تنقیدی نظر ڈالی ہے اور لکھا ہے انگریزی نے اُردو پر وہ اثر ڈالا ہے کہ گذشتہ چوتھائی صدی کے اندر اردو نے تقلید کے قیود اور قدامت کی زنجیریں توڑ کر پھینکدی ہیں، مناظر فطرت کو چشم بصیرت سے دیکھنے کا عام ذوق پیدا ہو گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب لوگ عموماً ایران و توران یا عرب و عجم کے قصے نہیں سناتے بلکہ ملکی تلمیحات استعمال کرتے ہیں، اور اکثر نظمیں نشۂ قومیت و وطنیت میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ اخلاقی اور اصلاحی نظموں، مضامین اور فسانوں کی بہتات ہو گئی ہے۔ باینہمہ اردو نظم کی وضع قطع اور زبان پر انگریزی کا اثر بہت کم پڑا ہے۔ یہی باعث ہے کہ ابھی اُردو زبان فارسی و عربی الفاظ سے بہت زیادہ گرانبار ہے، اور اصناف سخن میں بھی کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا۔

اُردو نثر نے بمقابلہ نظم کے زیادہ ترقی کی ہے۔ اور نثر نے پرانے رواجی قیود اور رسمی زنجیروں کو بہت کچھ توڑ دیا ہے۔ خیالات میں وسعت، گہرائی اور نفاست پیدا ہو گئی ہے۔ آزاد خیالی عام ہو چکی ہے۔ ناولوں اور فسانوں کی تعداد بیشمار ہوتی جاتی ہے، لیکن ابھی کوئی ایسا زبردست ناول نویس پیدا نہیں ہوا جس نے پلاٹ کی تکمیل اور کردار نگاری میں کمال حاصل کیا ہو۔ منشی پریم چند کی اردو اور ہندی افسانہ نگاری ضرور قابل ذکر تھی لیکن جب سے انھوں نے چھوٹے افسانے چھوڑ کر بڑے بڑے قصے لکھنے شروع کر دئیے ہیں اس وقت سے انھوں نے بخیال مصنف ترقی معکوس کی ہے، اور تاوقتیکہ وہ اپنے موجودہ رجحانات چھوڑ کر پرانی دیہاتی زندگی اور دیہی مناظر کی طرف رجوع نہ کریں گے وہ معراج کو نہیں پہونچ سکتے۔

نثر اُردو میں فلسفہ و حکمت، غیر جانبدارانہ تاریخ اور تنقید کی کمی ہے۔ تاریخ کی کتابیں ضرور ہیں مگر ان میں تحقیق و درایت کی بہت کمی ہے۔ تنقید ہنوز زبان اور محاورات کی صحت تک محدود ہے۔ شاعر کے خیالات، اس کے مفہوم پر نظر نہیں ڈالی جاتی، اور نہ اس کے کلام کا بحیثیت المجموع اندازہ کیا جاتا ہے۔ بہر حال اب اس فن میں بھی ترقی ہو رہی ہے، کیونکہ ملک سے بہت سے ادبی رسالے نکلنے لگے ہیں

اور ان کی تنقید اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے بعض مشہور شاعروں اور ادیبوں کا اس کتاب میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ مثلاً اس میں پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی، منشی نوبت رائے نظر، حضرت بیان یزدانی میرٹھی، شوکت میرٹھی، مرزا رسوا، منشی جوالا پرشاد برق وغیرہ گراں پایہ شاعروں اور ادیبوں کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ باایں ہمہ جو کچھ بھی لکھا ہے خوب لکھا ہے اور پوری تحقیق و تدقیق کے بعد لکھا ہے، یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر اُردو داں کے مطالعہ اور ہر کتب خانہ میں رہے۔ قیمت مجلد پارچہ ڈیڑھ روپیہ کاغذ عہ ملنے کا پتہ الیسوسی ایشن پریس نمبر ۵ رسل اسٹریٹ کلکتہ۔

جدید[1] اُردو شاعری

مصنفہٗ جناب مولوی عبدالقادر سروری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی، مددگار پروفیسر اُردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن۔ مجلد معہ نام طلائی، قیمت تین روپیہ۔ یہ چھوٹی تقطیع کی دلچسپ کتاب ۳۷۴ صفحات پر مشتمل اور دیباچہ کے علاوہ اس کے سولہ ابواب تین حصول پر منقسم ہیں۔ دیباچہ میں تالیف کتاب کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ "ادب قوم کی زندگی کا عکس ہوتا ہے۔ اس لئے ادب کے ارتقا اور انقلابات کی چھان بین، درحقیقت قوم کے اہم ترین نمایندوں کے ذہنی ارتقا کی تحقیق ہے۔" گویا بقول مؤلف اس کتاب میں "ادب کے ارتقا اور انقلابات کی چھان بین" اور قوم کے اہم ترین نمایندوں کے ذہنی ارتقا کی تحقیق کی گئی ہے۔ حصہ اول کے باب اول میں شعر کی ماہیت، باب دوم میں شعر کی تعریف باب سوم میں شاعری کی قسمیں اور باب چہارم میں اردو اصناف سخن بیان کرنے کے بعد فاضل مؤلف نے حصہ دوم میں قدم رکھا ہے، یہی حصہ اہم ترین بلکہ کتاب کی جان ہے اور اسی حصہ پر ہم ایک سرسری نقادانہ نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

حصہ دوم کے پہلے باب کا جو کتاب کا دراصل پانچواں باب ہے عنوان "انقلاب سے پہلے کی شاعری" رکھا گیا ہے۔ یہاں "انقلاب سے پہلے" کا مطلب وہ زمانہ ہے جو امیر و داغ پر ختم ہو گیا۔ گویا ابتدا اردو شاعری سے داغ و امیر تک جتنے شعرا گذرے وہ مؤلف کے نزدیک "متقدمین" ہو گئے۔ ان بزرگوں کی شاعری کی طرف فاضل مؤلف نے جس نظر سے دیکھا ہے، اس کا اندازہ کتاب زیر نظر کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے ہو سکتا ہے:۔

[1] ملنے کا پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن۔

"عام شاعری پست ہمتی اور اُپج کی تصنع کی ایک مسلسل داستان ہے... ...... نظیر، انیس، دبیر، غالب، ذوق، داغ کو چھوڑیئے، یہ خاک کے ہیرے ہیں اور انھیں سے اس تنزل کے دور کی شاعری زندہ ہے. ...... حق یہ ہے کہ اس دور کے شاعر قدما کے سہارے زندہ تھے، انھیں کی ہم نامی اور ہمنوائی کے طفیل شاعر مشہور ہوئے، ورنہ اکثر صورتوں میں شعریت ان کے کلام سے کوسوں دور رہے۔"

درد۔ سوز۔ اثر۔ انشار۔ جرأت اور مصحفی وغیرہ کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

"(انھوں) نے غزل کو صرف میرؔ ہی کے معیار پر لکھنے کی کوشش کی، چنانچہ ان کے کلام میں سادگی اپج، عمق، زور اور اثر غرض غزل کی تمام خوبیاں موجود ہیں. فرق صرف صناعی کا ہے۔ میرؔ کا سا دماغ انھیں مبدء فیاض کی طرف سے عطا نہیں ہوا تھا، لیکن اس قابل تحسین جماعت کے ہاتھ سے نکل کر غزل جب مذکورہ بالا گروہ کے شعرا کے تصرف میں پہونچی تو نہ صرف وہ اپنی بنیادی خصوصیات سے عاری ہو گئی بلکہ بسا اوقات اس میں شعریت کا کوئی جزو بھی باقی نہیں رہ گیا۔"

فاضل مؤلف کی اس سخت تنقید کے احاطہ میں آتش۔ ناسخ، آبادؔ تسیم لکھنوی، مومن وغیرہ مسلم الثبوت اہل کمال آجاتے ہیں۔ ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

ساتویں باب میں "انقلاب کے اثرات" سے بحث کرتے ہوئے فاضل مؤلف ارشاد فرماتے ہیں:۔

"جدید شاعری کی ابتدا اُردو میں انگریزی نظموں کے ترجموں سے ہوئی. مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے ترجمے خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔"

اور پھر خود ہی آٹھویں باب کے شروع میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اردو کی جدید شاعری کے بانیوں میں سب سے پہلی قابل قدر شخصیت محمد حسین آزاد کی ہے۔"

ہمارے نزدیک جدید اُردو شاعری کی ایجاد کا سہرا نہ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے سر ہے نہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے. بلکہ دراصل اس کی بنا نظیر اکبرآبادی نے ڈالی تھی، ان کے بعد انیس و دبیر نے اپنے مرثیوں میں منظر نگاری، کردار نویسی، اور مناظر قدرت کی عقیدتمندانہ پرستش میں وہ وہ کمالات دکھائے کہ قدیم اُردو شاعری کا چولا ہی بدل گیا۔ انیس و دبیر کے بعد اگرچہ اسی قسم کی شاعری کا سلسلہ جاری رہا لیکن غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزی ادبیات کا اثر اُردو پر پڑنے لگا تو قدرت نے مولوی محمد اسمٰعیل شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد، شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی، خان بہادر لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی وغیرہ جیسے بزرگوں کی ایک صاحب ذوقِ سلیم جماعت پیدا کی جنھوں نے ادبیات انگریزی کی

لذیذ وخوشگوار چاشنی کا خوانِ نعمت شاہجہانی میں اضافہ کر کے دونوں میں ایسا پاکیزہ اور پر لطف امتزاج پیدا کر دیا کہ اُردو شاعری کے قالبِ بیجان میں ایک روح تازہ داخل ہو گئی۔ اس لئے جدید اُردو شاعری ان تمام بزرگوں کی رہینِ منت ہے، اس کی ایجاد کا سہرا کسی خاص شخص کے سر نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو دوسروں کی حق تلفی ہوگی۔

حصۂ سوم میں فاضل مؤلف نے شعرائے انقلاب کے چار دور مقرر کئے ہیں (۱) عصرِ اصلاح جس میں آزاد۔ حالی۔ نذیر احمد۔ شرر۔ شبلی اور کیفی حیدرآبادی کو رکھا ہے۔ (۲) درمیانی زمانہ۔ اس میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی۔ شوق قدوائی، نظم طباطبائی، بینظیر شاہ، آصف، شاد کو رکھا ہے۔ (۳) عصرِ حاضر۔ اس میں دَورِ حاضر کے مشہور شعرا ہیں (۴) شعرائے مستقبل، یعنی وہ شعرا جو ہنوز کمال کو نہیں پہنچے اس حصہ میں مختلف شعرا کے کلام پر جو عالمانہ اور فاضلانہ تنقید حضرت مصنف نے کی ہے، وہ واقعی تنقید عالیہ کی قابلِ نمونہ مثال ہے۔ مثلاً منشی درگا سہائے سرور کے بارہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "اُردو شاعری میں مقامی رنگ بھرتے اور اس کو قومی اور وطنی بنانے کی بیش از بیش کوشش کی...... ان کی زندگی ایک شاعر کی حیات کا اچھا نمونہ ہے، طبیعت کو شعر سے بیحد اُنس تھا، اور بقول مسٹر رام بابو سکسینہ انھیں فنافی الشعر کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔"

مولانا حسرت موہانی کی نسبت لکھا ہے کہ "حقیقت میں میر کے بعد غزل گو شعرا نے ایسی دلکش اور شیریں زبان اپنی غزلوں کے لئے بہت کم استعمال کی، داغ سطحی اور زود فنا جذبات کی ترجمانی کرنے میں مشاق تھے، حسرت کی شاعری میں وقتی جذبات بہت کم ہیں، کلام کی صفائی کا یہ حال ہے کہ آپ دیوان کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے، آپ کو کوئی لفظ اور کوئی ترکیب ایسی نہیں ملے گی جو ذرا بھی کھٹکے...... حسرت نہ صرف غزل کا احیا کرنے والے ہیں بلکہ اُردو شاعری میں وہ ایک نئے دبستان کے بانی ہیں۔"

محمد شوکت علی خاں فانی کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ "فانی ایک مستقل رنگ کے مالک ہیں وہ اپنے رنگ خاص میں بڑی سے بڑی حقیقت کو اس سادگی و پرکاری کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں کہ بسا اوقات اہلِ نظر بھی اس سے گذر جاتے ہیں۔ جذبات کی مصوری، تخئیل کی بلندی، واقعات و واردات کی نزاکتوں کے ساتھ بہت کم ادا کی جا سکتی ہے، لیکن جناب فانی میں یہ کمال بدرجۂ اتم موجود ہے۔"

حضرت اصغر گونڈوی کے متعلق لکھا ہے کہ "موجودہ شاعروں میں فانی کو چھوڑ کر اصغر کی طبیعت

غالب سے بہت مشابہت رکھتی ہے، اکثر جگہ وہ غالب کی طرزِ فکر سے متاثر ہیں۔ فانی کے پاس غالب کا تنوع نہیں ہے۔ لیکن اصغر نے یہ کمی پوری کر دی ہے۔

پنڈت برج نراین چکبست کے بارہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ: "چکبست کا مذاقِ سخن بہت سادہ مگر شُستہ، اُن کا ذہن صناع اور ان کے شخصی خواص منفرد تھے، اسی لئے ان کی شاعری سادہ صنعت گری کا نمونہ ہے، اس کا مطالعہ جس طرح ہمارے قلوب میں انبساط پیدا کرتا ہے، اسی طرح ہماری روح اور ہمارے اخلاق کی تہذیب کا بھی غیر شعوری طور پر سبب بن سکتا ہے۔"

اس کتاب میں شعراء کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں لیکن جس عنوان سے کئی کئی تصویریں ایک ہی صفحہ پر یکجا کر دی گئی ہیں اس پر ہم قابل مصنف کو مبارکباد نہیں دے سکتے

شعرائے انقلاب کے سوانح حیات فراہم کرنے میں فاضل مصنف نے نہایت تلاش اور محنت سے کام لیا ہے۔ جس سے یہ کتاب خاص طور پر دلچسپ ہو گئی ہے۔ دلدادگان ادب اُردو کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے اور کسی لائبریری کو اس سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ کتاب حوالجات کی کتابوں میں داخل ہے، ہم فاضل مؤلف کی محنت کی داد دیتے ہیں۔ لکھائی چھپائی اچھی نہیں زبان سلیس ہے، لیکن کہیں کہیں حیدرآبادی رنگ غالب ہے۔

سلیقہ بیگم

یہ ۱۸×۲۲/۱۶ تقطیع کی ایک ننھی منّی سی کتاب ہے جو دو جز پر مشتمل ہے۔ حکیم محمود علی خانصاحب ماہر اکبرآبادی ثم دہلوی کی تصنیف لطیف ہے جسمیں گھر اور اسباب خانہ داری کی صفائی اور ترتیب کی تعلیم طبقۂ نسواں کو دی گئی ہے موقعہ بموقعہ حفظانِ صحت کے اصول بھی بتائے ہیں۔ زبان شُستہ ہونے اور کسی قدر ظرافتیہ رنگ لئے ہوئے ہے۔ جو اور بھی زیادہ باعثِ دلچسپی ہے۔ ہم مصنف کی محنت کی داد دیتے ہیں۔ کتاب غالباً مفت ملتی ہے۔ کیونکہ قیمت درج نہیں۔ مصنف صاحب سے "فراشخانہ دہلی" کے پتہ پر طلب کی جائے۔

صدائے ماہر المعروف بہ غیب کی آواز

مصنفہ حکیم محمود علیخانصاحب ماہر اکبرآبادی ثم دہلوی، کاغذ کتابت طباعت نفیس۔ چھوٹی تقطیع کے ۴۲ صفحے قیمت درج نہیں۔ یہ مختصر سا رسالہ ۲۰×۸ مذہبی و اخلاقی پند و نصائح کا مجموعہ ہے اور نصائح ایسے ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہو سکتا ہے، ہر مذہب کا شخص کتاب سے مستفید ہو سکتا ہے۔ یہ رسالہ غالباً مفت تقسیم ہوتا ہے جو کارِ خیر ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

مشاہیر زمانہ

پور داؤد (ایرانی شاعر)

(از رائے بہادر پنڈت شیو نراین شمیم)

ناظرین کو معلوم ہوگا کہ جب ڈاکٹر ٹیگور ایران گئے تھے تو وہاں اُن کی بہت آؤ بھگت ہوئی تھی۔ شاہ ایران نے اُن کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا تھا، اور ڈاکٹر ٹیگور نے بھی فارس اور ہند کی تہذیبوں پر نہایت عالمانہ تقریر کی تھی، اور شاہ ایران سے شانتی نکیتن میں کے فارسی زبان کے ایک عالم بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ شاہ عالیجاہ نے اب مشہور و معروف فاضل شاعر پور داؤد کو شانتی نکیتن میں اسی لئے بھیجا ہے۔ رسالہ ماڈرن ریویو جنوری ۱۹۳۳ء میں مسٹر اسحاق نے اس نامور فاضل کے حالات زندگی حوالۂ قلم کئے ہیں جن کو ہم مختصراً ناظرین زمانہ کی اطلاع کے لئے درج ذیل کرتے ہیں۔

پور داؤد کا نام میرزا ابراہیم خاں ہے۔ آپ صوبۂ گیلان کے دارالخلافہ رشت کے رہنے والے ہیں، اُن کے خاندان کے لوگ زمیندار اور تاجر ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۸۸۵ء کی ہے اپنے شہر میں عربی۔ فارسی کی تعلیم پاکر آپ طہران گئے جہاں حکیم حاذق میرزا محمد حسین خاں کی (جو مشہور و معروف طبیب ہیں) شاگردی میں یونانی طب پڑھی۔

۱۹۰۸ء میں وہ بغداد سے شام (Syria) پہونچے جہاں اُنھوں نے بیروت کے مدرسہ لیگ میں فرانسیسی زبان سیکھی اور ۱۹۱۰ء میں فرانس گئے جہاں ڈیڑھ برس رہکر اُنھوں نے فرانسیسی زبان کی تعلیم مکمل کی۔ بعد ازاں وہ پیرس کے قانونی مدرسہ میں داخل ہوگئے جنگ عظیم کے دنوں میں وہ سوئٹزرلینڈ۔ جرمنی۔ آسٹریا۔ رومانیا۔ بلگیریا۔ قسطنطنیہ۔ حلب میں رہے اس کے بعد وہ فرات کے دریائی راستے سے بغداد پہونچے اور اخبار رستاخیز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھوڑے ہی عرصہ کے قیام کے بعد وہ قسطنطنیہ آگئے جہاں سے وہ برلن جاکر ایرانی ادب کے

کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح آپ چند سال برلن میں مقیم رہ کر ایران کی قدیم تہذیب اور تمدن کی تحقیق اور مطالعہ میں مصروف رہے۔ اس قیام کے بعد وہ اپنی بیوی اور دختر کے ساتھ ۱۹۲۳ء میں اپنے وطن رشت میں واپس آ گئے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ ہندوستان آئے اور بمبئی میں قیام پذیر ہوئے۔ تین سال یہاں قیام رہا، اس عرصہ میں انھوں نے بزبان فارسی زرتشت کی مشہور کتاب اوستا کی تفسیر ہی۔ ۱۹۲۸ء میں آپ پھر برلن تشریف لے گئے اور کتاب یاشتہ کی تفسیر کی دوسری جلد لکھی۔ آج کل آپ خوردہ اوستا کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ پورداؤد فارسی زبان کے فاضل اجل ہونے کے علاوہ شاعر گراں پایہ بھی ہیں ان کا دیوان پوراندخت بمبئی کی ایرانی زرتشت انجمن کے زیر اہتمام و سرپرستی میں شائع ہوا ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ مسٹر دین شا ایرانی نے کیا ہے اس عالم کی اور تصنیفیں بھی ہیں مثلاً یاشتہ کی تفسیر اور تشریح۔ زبور ایرانی (گاتھا) ایران شاہ خرم شاہ وغیرہ

ایران کی قدیمی زبان پہلوی تھی، جو رفتہ رفتہ ترقی پا کر ادبی زبان بن گئی جو حافظ۔ فردوسی سعدی وغیرہ شعرا نے لکھی بعد ازاں چونکہ فارسی زبان کوئی مردہ زبان نہیں ہے بلکہ ایران میں آج تک رائج ہے لہذا زمانۂ حال میں اس میں تبدیلی و ترقی ہوئی ہے جس کی وجہ سے سیکڑوں الفاظ غیر زبانوں کے اس میں داخل ہوئے ہیں۔

پورداؤد کئی زبانوں کے مالک ہیں۔ پہلوی سے تو اُن کو خاص تعلق ہے اور انھوں نے اس کی بہت تحقیقات بھی کی ہے۔ اس تحقیق و تجسس کا اثر اُن کی تصنیفات میں ظاہر ہے۔ آج بھی ایرانی اپنی تہذیب قدیم اور تمدنِ گذشتہ پر فخر کرتے ہیں۔ اور گو ایران کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن وہ اپنی گذشتہ تاریخ کی یاد نہ صرف باقی رکھنا چاہتے ہیں بلکہ اس کو تازہ کرنے میں کوشاں ہیں۔ مسٹر اسحاق نے اپنے مضمون میں شاعر موصوف کی دو تین غزلوں کا انگریزی ترجمہ بھی دیا ہے جس کی اصل ہمیں دستیاب نہیں ہوئی۔

پورداؤد صرف عالم فاضل اور شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ محب وطن بھی ہیں، ان میں آریا خون ہے جسے وہ بھولے نہیں ہیں مجھے اُن کی ایک نظم میں سے ایک شعر سمجھ میں نہیں آیا تھا لہذا میں نے ٹوٹی پھوٹی فارسی میں ایک عریضہ بھیجا جس کا جواب اُنھوں نے نہایت خلوص سے بھیجا، اس کی چند سطریں ذیل میں نقل کیجاتی ہیں:۔

"بعقیدۂ بندہ یک ایرانی و یا ہندی باید وطن خود را مقدس بداند و بدو مانند خدا یا پیغمبرے نماز بردہ و باید بداند کہ نژاد اصلی است پیش از ہمہ چیز ایرانی یا ہندی ہستیم۔ دین عارضی است"

ایک زمانہ تھا کہ آریا قومیں ایران میں آپس میں لڑ پڑیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آریا قوم کے لوگ مختلف ملکوں کو چلے گئے۔ لیکن ایرانی تہذیب جو صدیوں میں پختہ ہوئی تھی ایران میں قائم رہی۔ زمانۂ حال میں ایران کی فضا بالکل بدلی ہوئی ہے۔ پارسیوں کی خاطر تواضع ہوتی ہے اُن سے مشورے بھی لئے جاتے ہیں۔ تہذیب کا زمانہ ہے اسلامی سلطنتیں بھی زمانۂ حال کی ضروریات سے متاثر ہو رہی ہیں۔

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ پوروداؤد کے دل میں وطن کی جو محبت جاگزیں ہے اس کا تتبع ہندیوں کو بھی کرنا چاہیئے۔ پروفیسر براؤن کی کی کتاب پریس وایرانی شاعری کے صفحہ ۲۹۲ پر ایک نظم چھپی ہے جس کے چند اشعار ہم درج کرتے ہیں۔ مقطع الیاعمدہ ہے کہ بھولنا نہ چاہیئے۔

یکے گیتی یکے یزداں پرستند ۔۔۔ یکے پیدا یکے پنہاں پرستند
یکے بودا وآں دیگر برہمن ۔۔۔ دگر زاں موسیٰ چوپاں پرستند
یکے از روے دستور اَوستا ۔۔۔ فروغ و خاورِ رخشاں پرستند
یکے ذاتِ مسیح ناصری را ۔۔۔ لسانِ حضرت سبحاں پرستند
گروہے پیروِ وخشور تاری ۔۔۔ حدیث و سنت و قرآں پرستند
فروشد عارف اندر وحدتِ ذات ۔۔۔ وجوب و جوہر وامکاں پرستند
صفاجو صوفیِ پشمینہ پوشاک ۔۔۔ مرید و مرشد و عرفاں پرستند
منجم سرگم اندر سیرِ افلاک ۔۔۔ نجوم و اخترِ گرداں پرستند
بروں کردہ ز دل مہرِ وطن را ۔۔۔ دو زلف و قامتِ خوباں پرستند

اگر پرسی ز کیشِ پورداؤد
جوانِ پارسی ایراں پرستند

یادِ رفتگاں

نواب سر محمد ذوالفقار علی خاں مرحوم

افسوس کہ ۲۶ - مئی کی صبح کو نواب سر محمد ذوالفقار علی خاں ممبر اسمبلی کا بمقام ڈیرہ دون انتقال ہوگیا۔ مرحوم مالیر کوٹلہ کے حکمران خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کی بنیاد سلاطین لودھی نے ڈالی تھی۔ آپ کے والد ماجد نواب غلام محمد خاں مرحوم تھے جنھیں اپنی جاگیر میں فوجداری کے اختیارات حاصل تھے۔ مرحوم ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ چونکہ آپ کے والد کی وفات آپ کے بچپن ہی میں ہوگئی تھی اس لئے آپ کی جاگیر کا انتظام کورٹ آف وارڈس کے ذریعہ سے ہوتا رہا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم چیفس کالج لاہور میں ہوئی تھی جہاں سے ڈپلومہ حاصل کرنیکے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ ایف۔ اے کا امتحان پاس کرکے ۱۸۹۷ء میں آپ بغرض تعلیم یورپ تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ تک پیرس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں آپ انگلستان جاکر کیمبرج میں داخل ہوگئے۔ تقریباً تین سال یورپ میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد آپ ۱۹۰۰ء میں ہندوستان واپس آئے۔ لیکن مالیر کوٹلہ کے بجائے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی تاکہ آپ کو عوام کی خدمت اور ملک کے سیاسی و اقتصادی امور میں دلچسپی لینے کا موقعہ ملے۔ یہاں سے آپ نے بمبئی کے مشہور و معروف سیاست داں اور ادیب مسٹر مالاباری کے انگریزی رسالہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں کئی مضامین لکھے مسٹر مالاباری کے انتقال کے بعد ایسٹ اینڈ ویسٹ کی عنان ادارت عملاً سردار جوگندر سنگھ اور نواب صاحب مرحوم ہی کے ہاتھوں میں آئی جس کی وجہ سے آپ کا علمی و سیاسی حلقوں میں خاصہ رسوخ پیدا ہوگیا۔ اسی سلسلہ میں آپ کی ملاقات علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ہوئی جو بعدہ گہری اور مخلصانہ دوستی ہوگئی غرض چند ہی دنوں میں آپ کے اخلاص و مروت اور اعلیٰ خاندانی اخلاق نے لاہور کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ آپ کا دولت خانہ "زرافشاں" لاہور کی اعلیٰ سوسائٹی کا مرکز تھا۔ جہاں آپ اکثر معززین شہر و اعلیٰ سرکاری حکام کو ٹینس کھیلنے اور چائے پینے کے لئے مدعو کیا کرتے تھے۔ ہندو، مسلمان اور سکھ

سبھی سے آپ کے پرخلوص تعلقات تھے۔

۱۹۰۹ء میں آپ امپریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تھے اور پھر تمام عمر مجالس آئین ساز کے ممبر رہے۔ آپ عرصہ تک پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔ کئی سال تک انجمن حمایت اسلام لاہور کے پریسیڈنٹ رہے۔ آپ اٹھارہ بیس برس تک پنجاب چیفس ایسوسی ایشن کے آنریری سکرٹری بھی رہے

نواب صاحب نے متعدد کتابیں اردو اور انگریزی میں تصنیف فرمائیں جن میں "سوانحعمری مہاراجہ رنجیت سنگھ" (اردو) "مشرق سے ایک آواز" (اے وائس فرام دی ایسٹ) (انگریزی) "علامہ سر اقبال کی شاعری پر تبصرہ" اور "سوانح شیر شاہ سوری" (انگریزی) زیادہ مشہور ہیں۔ ابھی ایک اور معرکۃ الآرا کتاب زیر تصنیف تھی کہ موت کے ہاتھوں ناتمام رہ گئی۔

۱۹۱۰ء میں آپ ریاست پٹیالہ کے وزیر اعظم مقرر ہوئے اور تقریباً تین سال وہاں رہے۔ اسی زمانہ میں سردار جوگندر سنگھ بھی آپ کے ساتھ پٹیالہ کے ہوم منسٹر تھے۔ جدید اصلاحات نافذ ہونے کے بعد یعنی ۱۹۲۰ء سے آپ مشرقی پنجاب کے مسلم حلقہ کی طرف سے کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر منتخب ہو گئے اور مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر تسلیم کئے جانے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں کونسل آف اسٹیٹ کی ممبری چھوڑ کر آپ مشرقی وسطی مسلم حلقہ پنجاب کی طرف سے لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ موجودہ اسمبلی کے انتخاب کے وقت چونکہ آپ ولایت تشریف لے جا رہے تھے اس لئے مقابلہ کے لئے کھڑے نہ ہو سکے۔ مگر بعد میں گورنمنٹ نے آپ کو اس ایوان عالیہ کا ممبر نامزد کر دیا۔ اسمبلی میں آپ مدت دراز تک سنٹرل مسلم پارٹی کے صدر رہے۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے ساتھ کام کرنے کے لئے جو سنٹرل کمیٹی مقرر ہوئی تھی اس میں بھی آپ شریک تھے۔ بلکہ اسی سلسلہ میں آپ ۱۹۲۹ء میں لندن بھی تشریف لے گئے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں آپ انڈین فرنچائز کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔ مسلم لیگ اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے آپ ہمیشہ سرگرم رکن رہے، اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور میں آپ مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ ۱۹۳۰ء میں آپ ہندوستان کی طرف سے مجلس اقوام میں ڈیلیگٹ منتخب ہو کر تشریف لے گئے اور ایک عرصہ تک آپ ہندوستانی وفد کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

نواب صاحب مرحوم کی شادی نواب سر امیر الدین خاں والی لوہارو کی حقیقی بھانجی سے ہوئی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کے آپ ہمیشہ خواہشمند رہے۔ افسوس آپ کی وفات سے ہندوستان کا ایک قابل مدبر اور نامور ادیب اٹھ گیا۔ خداوند تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

عالمِ نسواں

گذشتہ پانچ سال میں صوبہ پنجاب میں تعلیم نسواں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ اس عرصے میں اسکولوں میں لڑکیوں کی تعداد چھہتر ہزار سے دو لاکھ ہوگئی ہے۔ ۱۹۲۷ء لغایت ۱۹۳۲ء میں ایک ہزار چارسو پچاس نئے زنانہ اسکول قائم ہوئے یعنی اب پنجاب میں پانچ ہزار تئیس گرلس اسکول ہیں۔ پنجاب میں لڑکوں اور لڑکیوں کی ساتھ تعلیم (Co-education) میں بھی معتدبہ ترقی ہوئی جس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید چوتھائی صدی بعد وہاں علٰحدہ علٰحدہ اسکولوں اور کالجوں کی ضرورت نہ رہے۔ یوں بھی پنجاب میں پردہ کا رواج بہت کم ہے اور تعلیم نسواں کا شوق ترقی پر ہے

امسال مسٹر عزیز محمد قریشی صاحب رئیس لاہور کی دختر ضیاء النساء بیگم نے صرف گیارہ سال کی عمر میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا ہے۔

احاطۂ مدراس میں مختلف انجمہائے خواتین کی گیارہ نمایندوں نے جائنٹ سلیکٹ کمیٹی کو ایک عرضداشت ارسال کی ہے جس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ مجلسی حقوق کے متعلق عورتوں پر اس وقت جو حدود و قیود عائد ہیں انھیں مجوزہ دستور اساسی کے اندر ایک آئینی اعلان سے رفع کر دیا جائے اور عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیے جائیں۔ حق رائے دہی کے متعلق اس عرضداشت میں درخواست کی گئی ہے کہ فیڈرل اور صوبجاتی مجالس قانون ساز میں بلحاظ ملکیت و تعلیم عورتوں اور مردوں کیلئے مساوی شرائط ہوں اور ایوان اعلیٰ کے لئے تعلیم اور خاص جائداد کے مالک خاوند کی زوجیت کی شرط بھی ایسی رکھی جائے جس سے ایوان اعلیٰ کے لئے عورتوں کی کافی تعداد ووٹ دے سکے۔

لاجپت رائے ہال لاہور میں آل انڈیا اگروال مہیلا کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس میں بہت سی تعلیم یافتہ اگروال اور غیر اگروال خواتین نے حصہ لیا۔ شریمتی شاردا کماری دختر آنریبل جسٹس جے لال جنھوں

نے حال میں ایل ایل بی کا امتحان دیا ہے اس کانفرنس میں خاص حصہ لیا۔ کانفرنس میں تعلیم نسواں۔ کمسنی کی شادی، ازدواج بیوگان، انسداد پردہ وغیرہ کے متعلق ریزولیوشن پاس ہوئے۔

ملک کے قدامت پرست طبقہ میں بھی بدھوا بواہ کا رواج ہو رہا ہے۔ حال ہی میں جبلپور کی شریمتی شکنتلا شرما (کانیہ کبج برہمن بیوہ) کی شادی مسٹر لوکناتھ شکل ملازم الہ آباد بنک کلکتہ سے ہوئی جسمیں زوجین کے رشتہ داروں نے بھی شرکت کی۔ اسی طرح چھاؤنی جبلپور میں پنڈت ہزاری لال ساکن پٹیالہ کی دختر شریمتی چندراوتی دیوی عمر ۱۵ سال کی شادی مسٹر بھولچند سے ہوئی جو گیارہ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ مارواڑی برہمنوں میں یہ پہلا بدھوا بواہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی نے نہ صرف چھوت چھات بلکہ ذات پات کی زنجیریں توڑنے اور ملک میں قومی یگانگت پیدا کرنے پر کمر باندھ لی ہے۔ ۱۶ جون کو آپ کے صاحبزادہ شری یت دیو یداس گاندھی کی شادی شریمتی لکشمی دختر شری یت راجگوپال اچاریہ احمد آباد میں ہوئی۔ گاندھی جی ویش اور دلہن ذات کی برہمن ہیں۔

سیٹھ ہری ہر رئیس چند نگر نے "کرشن جائی ناری سکشا مندر" کو جو قسمت بڑودہ میں ایک زنانہ ہائی اسکول ہے ایک لاکھ روپیہ عطا فرمایا ہے۔ اسی طرح گورکھپور کے رئیس سید جواد علی صاحب نے مسلم گرلس اسکول لکھنؤ کو مبلغ آٹھ ہزار روپیہ اور آپ کی بیگم صاحبہ نے دو ہزار روپیہ عطا فرمایا ہے۔ اس رقم سے ایک جدید بورڈنگ ہاؤس تعمیر ہوگا۔

ٹوکیو پایہ تخت جاپان کے کالجوں کی انڈر گریجویٹ لڑکیوں نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ انھیں فوجی تعلیم و تربیت دی جائے تاکہ ضرورت کے وقت وہ بھی خندقوں میں داخل ہو کر اپنی فوجوں کی مدد کر سکیں۔ یہی جنگی روح آجکل چینی عورتوں میں بھی سرایت کر رہی ہے چنانچہ اس وقت چار سو چینی عورتیں مردانہ فوجی وردی زیب تن کئے ہوئے تلواروں اور چھوٹی بندوقوں سے مسلح ہو کر جاپانی فوجوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

رمزِ عشق و رازِ حق

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔اے)

جہاں میں عشق ہی اک شعلِ حقیقت ہے　　نہیں تو بزمِ جہاں کیا ہے عین ظلمت ہے
یہ رمز و راز کا محرم بہ شکل حیرت ہے　　جو دل میں ہے تو دل آئینۂ حقیقت ہے
یہ عشق جذبۂ اعلیٰ ترین فطرت ہے　　یہ نورِ قلب و چراغِ رہِ طریقت ہے
خدا کی یاد کہیں یہ بتوں کی الفت ہے　　کہیں مجاز کی صورت کہیں حقیقت ہے
جو گاہ بندگی و عجز و شکر و طاعت ہے　　تو گاہ وجد و فورِ جنون و وحشت ہے
یہ گاہ سوز کی لے نطق دردِ فرقت ہے　　یہ گاہ سازِ مسرت ہی کیف وصلت ہے
یہ اضطراب کی صورت سکوں کی حالت ہے　　کہ سادگیِ محبت بھی عین رنگت ہے
ہوس کا نام نہیں دردِ عشق شہوت ہے　　کہ دردِ عشق تو بس حسرتِ محبت ہے
خودی و نشۂ ہستی کا نام غفلت ہے　　سکوں تو رازِ فنا ثمرۂ شہادت ہے
یہ پیچ جتنا ہے سب نفس کی بدولت ہے　　کہ عشق روح کی سادہ ترین حرکت ہے
خدا بھی عشق کا منبع ہے بحرِ الفت ہے　　کشش ہی جذب ہی اک مخزنِ محبت ہے
یگانگی ہو تو ہو تو شریکِ محفلِ راز　　دوئی کا نام نہ ہونا ہی تو وحدت ہے
یہ ضدِ عشق دوئی ہی تو ہے بنائے شہود　　یگانگی کا نہ ہونا ہی تو کثرت ہے

جدا کئے ہے خدا سے ہمیں یہ سازِ خودی
کہ ذاتِ حق تو فقط نغمۂ محبت ہے

تبرّکاتِ شاد

(از علامہ شاد عظیم آبادی مرحوم)

جب دیکھیے مضمون ادق ملتا ہے — ہر مرتبہ بے پڑھا ورق ملتا ہے
ہر دفعہ کتابِ روز و شب کھلتی ہے — ہر روز نیا نیا سبق ملتا ہے

ہوں مثلِ حباب کیا ٹھکانا میرا — مٹ جائے گا دم بھر میں زمانہ میرا
گر سانس نہ آئے کھیل سب مٹ جائیں — چلتا ہے ہوا پہ کارخانہ میرا

مہلت کہیں اک آن تو لینے دے مجھے — کیا چیز ہے پہچان تو لینے دے مجھے
کچھ ختم نہیں ہے دورِ ساقی للہ — اس مے کو ذرا چھان تو لینے دے مجھے

لب کثرتِ مے کشی سے تھکنے نہ لگے — مستی سے مری عقل بہکنے نہ لگے
بھرنا مرے پیمانے کو ساقی جب تک — پیمانۂ زندگی چھلکنے نہ لگے

دم الفتِ معشوق کا بھرنا سیکھے — ہم زندہ دلوں سے آکے مرنا سیکھے
نالوں کی صدائیں بھی خوش آئند نہیں — بلبل سے کہو بات تو کرنا سیکھے

آئینہ ہے لا و الا حسنِ عالم گیر کا — ایک ہے دیکھو پلٹ کر دونوں رخ تصویر کا
اک ذرا کھسکا نہ پلّہ تول میں تقدیر کا — پھول تھا سنگِ ترازو کیا مری تدبیر کا
غوطہ دے لے چشمۂ کوثر کے اندر تب پہن — سلسلہ ہے حضرت مجنوں تک اس زنجیر کا
بے مروت نے کبھی آنکھیں برابر تک کیں — نالہ کس حسرت سے منہ تکتا رہا تاثیر کا
شمع پروانوں کے جلنے پر بھلا ہنستی کبھی — سر اٹھا کر دیکھ لیتی منہ اگر گلگیر کا
سب کے سب خوش ہیں کہ ہم سے ملتفت وہ شوخ ہے — واہ کیا رکھا مصوّر تو نے رخ تصویر کا

چشمِ باطن صاف کر لو دل کا دھو ڈالو غبار
کچھ سمجھ لینا ہے آساں شاد کی تحریر کا

لطفِ سخن

(از مہتہ تارا چند دت بی۔اے، ایل ایل۔بی وکیل ایبٹ آباد)

زندگی کو حباب کہتے ہیں — نقش بر روئے آب کہتے ہیں
منتظر ہم بھی ہیں اُسی دن کے — جس کو روزِ حساب کہتے ہیں
یاد جس کی ستائے پیری میں — اُس کو عہدِ شباب کہتے ہیں
اُس پہ مرتا ہوں جسکو اہل نظر — نقطۂ انتخاب کہتے ہیں
حُسن کے بار سے نگہ نہ اُٹھی — لوگ اس کو حجاب کہتے ہیں
اصطلاحِ لغاتِ عاشق میں — خونِ دل کو شراب کہتے ہیں
آرزوؤں کے اپنی مدفن کو — دلِ خانہ خراب کہتے ہیں
میں اُسی لطف کو ترستا ہوں — آپ جس کو عتاب کہتے ہیں
معتقد اس کا ہوں جسے سب لوگ — تیرِ عالی جناب کہتے ہیں

(جناب محمد زبیر روحی۔ الہ آبادی)

طاقتِ ضبطِ ستم خود آزما کر دیکھ لو — لو یہ دل ہے بندہ پرور تم ستا کر دیکھ لو
دیکھنا مدِنظر ہے گر تمھیں شانِ وفا — اپنے ہاتھوں میری ہستی کو مٹا کر دیکھ لو
میں نہیں موسیٰ کہ ڈر جاؤنگا برقِ حُسن سے — میری جانب تم نقابِ رُخ اُٹھا کر دیکھ لو
کوند جائیں پھر مری آنکھوں کے آگے بجلیاں — ہاں اسی انداز سے پھر مسکرا کر دیکھ لو
عرصۂ محشر میں ہو جائیگا اِک محشر بپا — اہلِ محشر سے ذرا اب منہ چھپا کر دیکھ لو
خود تڑپ جاؤگے سُن کر التجائے خاص کو — لَنْ ترانی کی صدا مجھکو سُنا کر دیکھ لو
کیا کہیں گے اہل دنیا سُن کے روداد جفا — لو جھکا دی میں نے گردن خوں بہا کر دیکھ لو

دیکھنا ہے حضرتِ روحی اگر اُن کا جمال
دل کو آئینہ بناؤ اور بنا کر دیکھ لو

(جناب سید افتخار حسین صاحب افتخار ڈسٹرکٹ و سشن جج کانپور)

جان سے گذرے، محشر پہونچے جلوہ تیرا دیکھا ہے
مہنگا سودا کوئی ہے کہتا، ان داموں پھر سستا ہے

رات جوانی کی گذری تو رات نہ آئی پھر کوئی
دنیا جس کو کہتے ہیں، اک رات بسے کا رستا ہے

آیا تو تو روتا تھا اور جائے گا تو رولے گا
عمر کٹے گی رو رو کر سمجھا ہے کیا جو ہنستا ہے

رونے کا کہنا ہی کیا ہے، ہنسنے میں بھی آنسو ہیں
ساری عمر کا رونا ہے، وہ روتا ہے جو ہنستا ہے

سچ پوچھو تو محشر کا میدان کچھ ایسا دور نہیں
بیچ میں بس ہم سنتے ہیں اک شہر خموشاں بستا ہے

(از جناب جلیل قدوائی ایم۔اے)

جانِ بیتاب جو ٹھہری بھی تو کیا ٹھہری ہے
دلِ مضطر سے نکل آنکھ میں آ ٹھہری ہے

نگہِ شوق ہے ذوق سے محرو نہیں
جانِ مشتاق ہے جو آنکھ میں آ ٹھہری ہے

آہ کرنا بھی غمِ ہجر میں ٹھہرا ہے گناہ
مر مٹے ہم جو یہی شرطِ وفا ٹھہری ہے

اُن کی وہ چشمِ عنایت جو کبھی دل کے لئے
وجہِ تسکین تھی سو اب ہوش رُبا ٹھہری ہے

ہائے کیا چیز ہے عشاق کی مجبوری بھی
جو تڑپ دل میں تھی کل آج دوا ٹھہری ہے

اپنے عشاق کو ممنونِ کرم فرمایا
نگہِ ناز بھی کیا قدر فزا ٹھہری ہے

اے دلِ زار بتا میری تسلی کے لئے
شرط اُن کی نگہِ ناز سے کیا ٹھہری ہے

روح ہے جسم میں اڑتے ہوے طائر کے مثال
بہرِ آرام ذرا دیر کو آ ٹھہری ہے

روحِ آزاد کو کیا لطف ملا اس میں جلیل
چند دن کو قفسِ تن میں جو آ ٹھہری ہے

(از جناب منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی بی۔اے)

جلوہ افروز کہاں برقِ سرِ طور نہیں
چشمِ بینا ہو تو پردے میں وہ مستور نہیں

ذوقِ نظارہ کہیں دید سے معذور نہیں
پردۂ قلب میں کیا جلوہ گہِ طور نہیں

تابشِ حسن حجابِ رُخِ پر نور نہیں
رخنہ گر ہو نگہِ شوق تو کچھ دُور نہیں

لطفِ پنہاں سے جو بھر جائے تو کچھ دُور نہیں
زخمِ تیغِ نگہِ ناز ہے، ناسور نہیں

فاش ہو رازِ محبت ہمیں منظور نہیں
لبِ خاموش پہ کیا نعرۂ منصور نہیں

شبِ فرقت نظر آتے نہیں آثارِ سحر
اتنی ظلمت ہے رخِ شمع پہ بھی نور نہیں

دم زدن میں ہوا طے عالمِ فانی کا سفر
کھل گیا راز کہ ہستی سے عدم دُور نہیں

اُس کے پرتو سے ہے جذبات کی دنیا آباد
آنکھ سے دُور ہے وہ۔ دل سے مگر دُور نہیں

دل مرا پھونک کے بیتاب ہے وہ برقِ نظر — خرمنِ جاں پہ بھی آنچ آئے تو کچھ دور نہیں
نظر آتا نہیں گو منزلِ مقصد کا نشاں — ذوقِ صادق یہی کہتا ہے کہ کچھ دور نہیں
مٹتے مٹتے بھی ہے نقش آرزوؤں کا باقی — دل کے آئینے سے یہ زنگ ابھی دور نہیں
رازِ سربستۂ فطرت نہ کھلا ہے نہ کھلے — میں ہوں اُس سعی میں مصروف جو مشکور نہیں
صرفِ نیرنگیٔ نظارہ ہے خود اپنی نظر — عین وحدت ہے کوئی ناظر و منظور نہیں
بربطِ زیست کو رکھ صرف نوا ہائے دروں — سازِ بیکار ہے نغموں سے جو معمور نہیں
برقؔ بے کیف گزرتے ہیں شب و روزِ حیات — مئے انگور نہیں، ساغرِ بلور نہیں

(از جناب مولوی سید دل محمد فضا جالندھری)

تاثیرِ سوزِ دل سے ہوئی بیقرار شمع — پروانے جل رہے ہیں تو ہے اشکبار شمع
مہمان ایک شب کا ہوں میں بھی تری طرح — ہستی ہے اپنی دہر میں ناپائدار شمع
کیا جانے کس کی یاد میں کسکا یہ حال ہو — سوزِ دروں کو کیوں نہ کرے آشکار شمع
پروانوں کو تو شام ہی سے تو جلا چکی — اب کون بزم میں ہو ترا غمگسار شمع
کس شعلہ رو کی یاد میں از شام تا سحر — تر کر رہی ہے دامنِ دل اشکبار شمع
کون آج بزمِ ناز میں جلوہ نما ہوا — گرد اس کے گھومتی ہے جو پروانہ وار شمع
جب خود نہ اپنے سوزِ دروں کو چھپا سکی — پھر کس الم نصیب کی ہو رازدار شمع
رونق فزائے بزم رہی شب سے تا سحر — لائی تھی صرف زندگیِ مستعار شمع
تاثیرِ عشق کا یہ نتیجہ ہے اے فضاؔ — پروانوں کے فراق میں ہے سوگوار شمع

(از بابو شیام سندر لال برقؔ وکیل سیتاپور)

مرے دل کو ابلے اشکِ ندامت شستہ و شو کر دے — بس آنا کر کے دنیا سے مجھے بے آرزو کر دے
چمن سر پر اُٹھا رکھا ہے فریادِ عنادل نے — مزا آ جائے تو گل کو اگر بے رنگ و بو کر دے
صدف کی طرح دل کو راز دارِ موجِ طوفاں کر — گہر کی طرح مجھکو غرق بحرِ آبرو کر دے
مجھے تابِ نظر باقی نہیں اے جلوۂ جاناں — پریشاں اک ذرا عارض پہ زلفِ مشکبو کر دے
گلی جاتی ہیں زنجیریں جلا جاتا ہے پیراہن — جنوں کو فکر ہے رسوا مجھے پھر کو بہ کو کر دے
مجھے اول فنا آخر فنا اے برقؔ ہونا ہے — زہے قسمت جو رخ میری طرف وہ شعلہ رو کر دے

علمی خبریں اور نوٹ

برطانوی ہند کے تقریبًا ہر شہر میں کوئی نہ کوئی کتب خانہ موجود ہے۔ لیکن ریاستوں میں جو کتبخانے ہیں اُن کی نسبت عوام کو بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ یوں تو ہندوستان کی تقریبًا ہر ریاست میں ہندی سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی کتب کے بیش بہا ذخیرے موجود ہیں لیکن مغربی طریقہ پر لائبریری قائم کرنے کا شرف اولین مہاراجہ بڑودہ کو حاصل ہے۔ ممدوح نے سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک کتبخانہ قائم کیا اور اس کا مہتمم ایک امریکن مسٹر بورڈن کو مقرر کیا۔ اس وقت تک اس کتبخانہ کے ماتحت ریاست بڑودہ میں پینتالیس شہری آٹھ سو اٹھارہ دیہاتی چار سو تریسٹھ گشتی کتبخانے اور دو سو مستقل لائبریریاں قائم ہیں جن پر ہر سال ایک لاکھ روپیہ سے زائد خرچ ہوتا ہے۔ مرکزی کتبخانے میں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود ہیں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے جدا جدا حصے ہیں۔ لڑکیوں کا حصہ ایک مرہٹہ خاتون کے ماتحت ہے۔ ریاست میں ہر ضلع، ہر پرگنہ اور ہر گاؤں میں کتبخانہ موجود ہے۔ جو گاؤں سو روپیہ یا جو پرگنہ ۳۰۰ روپیہ سالانہ آمدنی کا انتظام کر لیتا ہے اسے اتنی ہی رقم ریاست سے دیجاتی ہے۔ گشتی کتبخانوں کے لئے چھوٹے چھوٹے صندوق بنائے گئے ہیں جن میں کتابیں بھر کر دیہاتوں میں بھیجدی جاتی ہیں اور یہ صندوق ہفتہ یا عشرہ وار چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اب ریاست میسور و ٹراونکور میں بھی بڑودہ کی تقلید کی جا رہی ہے۔

ہندوستان کے اخباروں اور رسالوں کی جو حالت ہے وہ ناظرین زمانہ سے پوشیدہ نہیں۔ اب ان کا مقابلہ ذرا امریکن اخبارات سے کیجئے۔ امریکہ کا سب سے بڑا اخبار "نیویارک ٹائمس" روزانہ پانچسو صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ اس میں ایک حصہ "خاص نمبر" کے عنوان سے ہوتا ہے جس میں مقامی خبروں سے لیکر دنیا بھر کی چھوٹی بڑی تازہ خبریں درج ہوتی ہیں۔ ملکی و سیاسی مسائل پر مضامین، واقعات پر رائے زنی، مشاہیر کی رائیں اور خاص نمایندوں کے مرسلہ حالات سب درج ہوتے ہیں۔ نیویارک کے ہوٹلوں میں صبح کے ناشتہ کے ساتھ ہوٹل کا خادم آپ کو "نیویارک ٹائمس" کا ایک تازہ پرچہ بھی پیش کرے گا۔ اس اخبار

میں پندرہ دیگر مختلف ضمیمے ہونگے، اور ہر ضمیمہ کسی خاص موضوع پر کسی مشہور ماہر فن اہل قلم کا لکھا ہوا ہوتا ہے
بایں ہمہ ایک پرچہ کی قیمت صرف چھ آنہ ہوتی ہے۔ پانچسو صفحات کا اخبار اور صرف چھ آنہ میں کس قدر
حیرت انگیز بات ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس اخبار کو اشتہارات کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ
اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ یعنی ایک صفحہ کی اجرت تین ہزار پونڈ فی اشاعت مقرر ہے۔ اگر ایک
پرچہ میں سو صفحات بھی اشتہارات کے ہوئے تو تین لاکھ پونڈ روزانہ آمدنی صرف اشتہاروں سے ہوگی۔

ایسٹرن آکلٹ اکیڈیمی بنارس نے مضمون نویسی میں ایک آل انڈیا مقابلہ کا اعلان کیا ہے
جو ماہ جولائی میں ہوگا۔ عنوان مضمون یہ ہے۔ "موجودہ کساد بازاری کے اسباب۔" اور اس کے انسداد کی تدابیر"
پہلا انعام ڈیڑھ سو روپیہ اور دو انعامات پچاس پچاس روپیہ کے ہونگے۔

پانچ سال پیشتر سوویٹ روس میں پندرہ سو ستتر [۱۵۷۷] اخبار تھے جن کی مجموعی اشاعت صرف نو لاکھ
تھی۔ مگر ۱۹۳۲ء میں روس کے اخباروں کی تعداد سولہ ہزار چھ سو بیاسی ہوگئی جن کی مجموعی اشاعت
تین کروڑ پچاس لاکھ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل روس علمی، ادبی اور سیاسی معاملات
میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔ دوسری طرف عراق کو دیکھئے جہاں اخباروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر
ہے۔ حال ہی میں حکومت عراق نے ۲۲ اخبار بند کرا دیئے ہیں۔

شری ہری ہر سیٹھ ساکن چندنگر نے "زیتہ گوپال سمرتی مندر" (لائبریری) کو پچھتر ہزار روپیہ عطا
فرمایا ہے۔ اسی طرح دہلی کے مشہور تاجر محمد رفیع صاحب ساکن صدر بازار نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
کو ایک لاکھ روپیہ عطا فرمایا۔

ہندوستان کے علم دوست طبقہ میں یہ خبر مسرت سے سنی جائیگی کہ کلکتہ یونیورسٹی کی سینٹ
نے بگرہاٹ کالج کا نام بدلکر پروفلا چندر کالج رکھنا منظور کر لیا ہے۔ گورنمنٹ نے خود سفارش کی تھی کہ
اس کالج کا نام سر پی سی رائے ہندوستان کے مشہور سائنسدان کے نام پر رکھا جائے۔

اردو ٹائپ کی اصلاح و ترویج کے لئے حیدرآباد دکن میں برسوں سے کوششیں ہو رہی ہیں مگر

ہنوز ان کا عملی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ حیدر آباد کے مسٹر ایس۔ ایچ قریشی کی کوشش اور مشہور و معروف علم دوست جاگیردار نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں دہلی میں ایک لیمیٹڈ کمپنی "خوشخط نستعلیق ٹائپ فاونڈری لیمیٹڈ" کے نام سے قائم ہوئی ہے جس نے قریشی صاحب کے ایجاد کردہ ٹائپ کو خرید کر اسے ملک میں رواج دینے کا تہیہ کیا ہے اور علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے نامور پروفیسر محمد حبیب صاحب کی رہنمائی میں ایک مقتدر کمیٹی بنائی گئی ہے جو پروپیگنڈا کر کے اردو نستعلیق ٹائپ کمپنی کے حصے فروخت کرے گی۔ اس تحریک کے سرپرستوں میں ڈاکٹر سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، سر اکبر حیدری، جناب نواب بہادر سر نزل اللہ خاں اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سی۔ آئی۔ ای بھی شامل ہیں۔

افسوس ہے کہ ۱۷ مئی کو چھ سات روز تپ محرقہ میں مبتلا رہکر مولوی محبوب عالم صاحب مالک و بانی پیسہ اخبار و انتخاب لاجواب لاہور نے ۷۴ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو فن صحافت میں اس قدر عبور اور تجربہ حاصل تھا کہ آپ پنجاب میں "فادر آف جرنلزم" اور "اڈیٹر ساز" کہے جاتے تھے۔ اور واقعی اس وقت بھی ہندوستان میں درجنوں اخبار نویس ایسے ہیں جنھوں نے دفتر پیسہ اخبار میں کام سیکھا تھا۔ مرحوم انتہا درجہ کے محنتی اور جفاکش آدمی تھے۔ چالیس سال تک چودہ گھنٹہ یومیہ کام کرتے رہے تھے۔ کتابوں سے آپ کو خاص عشق تھا۔ لاہور میں اتنا بڑا ذاتی کتبخانہ کسی کا نہیں تھا جتنا کہ مرحوم کا تھا۔ مرحوم نہایت ہر دلعزیز آدمی تھے۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

راہول سنکر تیائن بہاری نامی بدھ بھکشو کو تبت سے تبتی زبان اور بدھ مت کی بہت سی کتابیں، قلمی مسودے اور بیاضیں دستیاب ہوئی ہیں چنانچہ اب یہ تمام ذخیرہ پٹنہ میوزیم میں موجود ہے جس کی نگرانی میں ان تمام قلمی بیاضوں اور مخطوطات کی ایک مفصل فہرست تیار کی گئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کتابوں کا وزن ایک سو ستر من ہے اور یہ نو سو بتیس بستوں میں بندھی ہوئی ہیں اور ہر بستہ میں دس ہزار نسخے ہیں۔ ان کتابوں میں پالی اور چینی زبانوں میں لکھی ہوئی "ترپٹکا" بھی ہیں۔ علاوہ ازیں ایک بیش قیمت قلمی کتاب ہے جو ۱۰۰۰ء سے قبل ملک بہار میں لکھی گئی، لیکن بعد میں کوئی شخص اسے تبت لے گیا۔

یادِ رفتگاں

رائے صاحب منشی رگھونندن لال مرحوم

زمانہ کے پرانے قدردانوں میں رائے صاحب منشی رگھونندن لال صاحب مرحوم رئیس انبالہ چھاؤنی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ منشی چرن گوپال بھٹناگر ساکن سکندرآباد ضلع بلندشہر کے فرزند رشید تھے۔ ماہ اگست ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان ہمیشہ علم و فضل کے لئے مشہور رہا چنانچہ مرزا غالب کے شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ آپ کے حقیقی چچا تھے۔ علاوہ ازیں آپ کے اکثر بزرگ سلاطین مغلیہ کے دیوان رہے تھے۔ رائے رگھونندن لال کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی تھی تحصیل علم کے بعد آپ ٹامسن سول انجنیرنگ کالج روڑکی میں داخل ہوئے، اور امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۶۱ء میں محکمہ تعمیرات پنجاب میں ملازم ہوئے۔ ۱۹۰۰ء میں بصلۂ خدمات "رائے صاحب" کا خطاب پایا اور ۱۹۰۲ء تک نہایت قابلیت اور ہردلعزیزی کے ساتھ محکمہ کی خدمات انجام دیکر عہدۂ سب انجینیری سے ریٹائر ہو گئے۔ ۱۹۰۳ء میں موضع دولت پور ضلع شیخوپورہ (پنجاب) میں دس مربع اکیڑ اراضی عطا ہوئی جس میں آپ نے دو بڑے اور خوبصورت باغ مع کوٹھی و دیگر عمارات بغرض آسائش حکام تعمیر کرائے جن کا سنگ بنیاد پنجاب کے لاٹ صاحب نے رکھا۔ آپ کو فن زراعت اور باغبانی سے خاص شوق تھا اور ہمیشہ کسانوں کو جدید طریقۂ کاشت کی تبلیغ کیا کرتے تھے سکندرآباد میں بھی آپکی خاصی زمینداری تھی، یہاں کی حویلی قابل دید ہے۔

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونیکے بعد آپ کو ہز ہائینس مہاراجہ سر جگجیت سنگھ بہادر والی کپورتھلہ نے اپنے جدید محل کی تعمیر کے لئے منتخب کیا جو تیس ۳۰ لاکھ روپیہ میں فرانسیسی وضع پر تیار ہوا۔ دربار سے آپ کو بہت انعام و اکرام عطا فرمایا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ نے پرنس آف ویلز کالج جموں ریاست کشمیر تعمیر کرایا۔ دربار کشمیر سے بھی بہت کچھ انعام ملا۔

آپ کی طبیعت کو صنعت و حرفت سے خاص لگاؤ تھا چنانچہ آپ ہندو کاٹن پریس کمپنی لمیٹڈ انبالہ شہر کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے بیس ۲۰ برس تک چیرمین رہے۔ ۱۹۲۷ء میں جب زیادہ ضعیف ہو گئے تو اس خدمت سے مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو اٹھاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ رادھا سوامی ست سنگ ستلج بیاس کے رکن تھے۔ زیادہ وقت گیان دھیان میں گذارتے تھے۔ آپ نے پانچ لڑکے اور چھ لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں تین لڑکے اور چار لڑکیاں عین شباب ہی میں فوت ہو گئے تھے اب دو لڑکیاں حیات ہیں۔ اور منشی مراری لال جن کی عمر ۵۰ سال ہے مرحوم کے جانشین ہیں۔

یادِ رفتگاں

رائے صاحب منشی رگھونندن لال مرحوم

زمانہ کے پرانے قدردانوں میں رائےصاحب منشی رگھونندن لال صاحب مرحوم رئیس انبالہ چھاؤنی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آپ منشی چرن گوپال بھٹناگر ساکن سکندر آباد ضلع بلندشہر کے فرزند رشید تھے۔ ماہ اگست ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان ہمیشہ علم و فضل کے لئے مشہور رہا۔ چنانچہ مرزا غالب کے شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ آپ کے حقیقی چچا تھے۔ علاوہ ازیں آپ کے اکثر بزرگ سلاطین مغلیہ کے دیوان رہے تھے۔ رائے رگھونندن لال کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی تھی تحصیل علم کے بعد آپ طامسن سول انجنیرنگ کالج روڑکی میں داخل ہوئے، اور امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۶۱ء میں محکمہ تعمیرات پنجاب میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۹۰ء میں بصلۂ خدمات "رائے صاحب" کا خطاب پایا اور ۱۹۰۲ء تک نہایت قابلیت اور ہردلعزیزی کے ساتھ محکمہ کی خدمات انجام دیکر عہدۂ سب انجنیری سے ریٹائر ہوگئے۔ ۱۹۰۳ء میں موضع دولت پور ضلع شیخوپورہ (پنجاب) میں دس مربع ایکڑ اراضی عطا ہوئی جس میں آپ نے دو بڑے اور خوبصورت باغ مع کوٹھی و دیگر عمارات بغرض آسایش حکام تعمیر کرائے جن کا سنگ بنیاد پنجاب کے لاٹ صاحب نے رکھا۔ آپ کو فن زراعت اور باغبانی سے خاص شوق تھا اور ہمیشہ کسانوں کو جدید طریقۂ کاشت کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ سکندر آباد میں بھی آپکی خاصی زمینداری تھی، یہاں کی حویلی قابل دید ہے۔

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونیکے بعد آپ کو ہز ہائینس مہاراجہ سر جگجیت سنگھ بہادر والی کپور تھلہ نے اپنے جدید محل کی تعمیر کے لئے منتخب کیا جو تینتس۳۳ لاکھ روپیہ میں فرانسیسی وضع پر تیار ہوا۔ دربار سے آپ کو بہت انعام و اکرام عطا فرمایا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ نے پرنس آف ویلز کالج جموں ریاست کشمیر تعمیر کرایا۔ دربار کشمیر سے بھی بہت کچھ انعام ملا۔

آپ کی طبیعت کو صنعت و حرفت سے خاص لگاؤ تھا چنانچہ آپ ہند کاٹن پریس کمپنی لیمیٹڈ انبالہ شہر کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے ۲۶ برس تک چیرمین رہے۔ ۱۹۲۶ء میں جب زیادہ ضعیف ہوگئے تو اس خدمت سے مستعفی ہوگئے۔ ۱۹۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو اٹھاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ رادھاسوامی ست سنگ شاخ بیاس کے رکن تھے۔ زیادہ وقت گیان دھیان میں گذارتے تھے۔ آپ نے پانچ لڑکے اور چھ لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ تین لڑکے اور چار لڑکیاں عین شباب ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ اب دو لڑکیاں حیات ہیں۔ اور منشی مراری لال جن کی عمر ۵۰ سال ہے مرحوم کے جانشین ہیں۔

گھر اور محل کی زینت

ہاف ٹون عکسی تصاویر

[illegible]

یہ تصاویر ہاف ٹون بلاک سے عمدہ آرٹ پیپر پر شایع ہوئی ہیں اور انکو عام پسندیدگی کا فخر حاصل ہے

تصاویر رنگین
فی تصویر ۲ر
نغمۂ محبت
موسم سرما
یاد بہاری
انتظار
ہدایت
گل پنج روزہ
رفیق طفلی
شکنتلا و دشینت
مشعل ہدایت
تار شکستہ
(فن تصویر کے نمونے)
کثرت میں وحدت
وقت نزع
نظر بد کا اثار
راجہ اج کا ملاپ
بھکارنی
سمندر ساشن
امید و فاداری
سیواجی اور راجہ اسا

یورپ کا ایک معرکہ
ایک قدیم مشرقی مدرسہ
مصطفےٰ کمال پاشا
کی ترکی کونسل
غسل کی تیاری
سیتہ وان اور ساوتری
راجہ کمانڈو کے بیٹے
کا قتل
باسدیو اور دیوکی نند لال
نورجہاں متعلق میکہ دوت
اکبر اعظم ار
راجہ مان سنگھ ار
اکبر اور جیتے کا شکار
دربار شاہجہاں ار
عہد مغلیہ میں شاہی
سواری کا جلوس ار
محاصرہ چتوڑ ار
پیدایش شاہزادہ سلیم
دربار جہانگیر میں
سفیر فارس
ٹیپو سلطان ار

دارا شکوہ کا سر اورنگزیب
کے سامنے پیش ہوتا ہے
دربار ماہورا ڈپیشوا
دربار شاہ عباس
موسمی تصاویر
ماہ چیت ۲ر بیساکھ ۲ر
جیٹھ ۲ر اساڑھ ۲ر
بھادوں ۲ر ماگھ ۲ر
بھاگن ۲ر ساون ۲ر
مشہور النسا
پردازان اردو
مولانا شبلی ار
شمس العلما نذیر احمد ار
شمس العلما ڈاکٹر سید علی ار
میر تعشق لکھنوی ۲ر
حضرت انیس مرحوم ۲ر
حضرت سرور ۲ر
مولوی عزیز مرزا ۲ر
بابو بالمکند گپتا ۲ر
اڈیٹر بھارت مترا ۲ر
منشی احمد علی شوق ار

مشاعرہ کیننگ کالج لکھنؤ
منعقدہ ۱۹۱۱ء ار
مرزا سلطان احمد ار
مرزا محمد رفیع سودا ۲ر
مرزا انشاء اسد خاں ار
مولانا عبد الرزاق الہ آباد ۲ر
مولانا آزاد دہلوی ار
مسٹر رام بابو سکسینہ ۲ر
منشی نوبت رائے نظر ۲ر
جناب چکبست ۲ر
حضرت صفی ۲ر
ڈاکٹر اقبال ۲ر
مولانا حسن نظامی ۲ر
لیڈران ہند
ناموران ملک
راجہ رام موہن رائے ۲ر
مسٹر دادا بھائی نوروجی ار
سر سالار جنگ ۲ر
ڈاکٹر سر ضیاء احمد خاں ار
اراکین دیانند کالج ار
مسٹر تلک ۲ر

جسٹس محمود ۲ر
بابو سریندر ناتھ بنرجی ار
سر رام کرشن بھنڈارکر ار
بابو گنگا پرشاد ورما ۲ر
کالیچرن بنرجی ار
سوامی دیوکانند ۲ر
نواب محسن الملک ۲ر
مسٹر سہاری ہاری کار
ڈاکٹر ستیش چندر
بنرجی ار
پنڈت لکشمی ناتھ ۲ر
بابو ریتا چندر بنرجی ۲ر
جسٹس لا لچند ایم اے ار
آنریبل مسٹر گوکھلے ۲ر
انجمن خادمان ہند ۲ر
مہاتما گاندھی ۲ر
پنڈت مدن موہن ار
صاحب مالوی ار
کرنل بھولا ناتھ ۲ر
پنڈت موتی لال نہرو ۲ر
لالہ لاجپت رائے ۲ر

سر ابراہیم رحمت اللہ
لالہ ہنسراج ۲ر
راجہ صاحب محمود آباد ۲ر
سر آغا خاں ار
لارڈ سنہا ار
محمد علی مولانا ۲ر
مسٹر سچد انند سنہا ۲ر
مسز سروجنی نائیڈو ۲ر
مہاتما منشی رام ۲ر
سوامی شردھانند ۲ر
سریندر ناتھ بنرجی ۲ر
ڈاکٹر ٹیگور ۲ر
بابو بھگوان داس ار
نواب سید حسن بلگرامی ار
نواب سید محمد ار
سور داس ار
ایک عالم دین کا مدرسہ ار
منشی کشن نراین ار
صاحب بھاگو ار
راز و نیاز ار
تصویر شیر محمد قوال ار

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمائیے

یادِ رفتگاں

رائے صاحب منشی رگھونندن لال مرحوم

زمانہ کے پرانے قدردانوں میں رائے صاحب منشی رگھونندن لال صاحب مرحوم مقیم انبالہ چھاؤنی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آپ منشی چرن گوپال بھٹناگر ساکن سکندرآباد ضلع بلندشہر کے فرزند رشید تھے۔ ماہ اگست ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان ہمیشہ علم و فضل کے لئے مشہور رہا۔ چنانچہ مرزا غالب کے شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ آپ کے حقیقی چچا تھے۔ علاوہ ازیں آپ کے اکثر بزرگ سلاطین مغلیہ کے دیوان رہے تھے۔ رائے رگھونندن لال کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی تھی تحصیل علم کے بعد آپ ٹامسن سول انجنیرنگ کالج روڑکی میں داخل ہوئے، اور امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۶۱ء میں محکمہ تعمیرات پنجاب میں ملازم ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں بصلۂ خدمات "رائے صاحب" کا خطاب پایا اور ۱۹۰۲ء تک نہایت قابلیت اور ہردلعزیزی کے ساتھ محکمہ کی خدمات انجام دیکر عہدۂ سب انجنیری سے ریٹائر ہوگئے بـ۱۹۰۳ء میں موضع دولت پور ضلع شیخوپورہ (پنجاب) میں دس مربع اکیڑ اراضی عطا ہوئی جس میں آپ نے دو بڑے اور خوبصورت باغ مع کوٹھی و دیگر عمارات بغرض آسایش حکام تعمیر کرائے جن کا سنگ بنیاد پنجاب کے لاٹ صاحب نے رکھا۔ آپ کو فن زراعت اور باغبانی سے خاص شوق تھا اور ہمیشہ کسانوں کو جدید طریقۂ کاشت کی تبلیغ کیا کرتے تھے سکندرآباد میں بھی آپ کی خاصی زمینداری تھی، یہاں کی حویلی قابلِ دید ہے۔

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونیکے بعد آپ کو ہز ہائینس مہاراجہ سر جگجیت سنگھ بہادر والی کپورتھلہ نے اپنے جدید محل کی تعمیر کے لئے منتخب کیا جو تیس۳۰ لاکھ روپیہ میں فرانسیسی وضع پر تیار ہوا۔ دربار سے آپ کو بہت انعام و اکرام عطا فرمایا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ نے پرنس آف ویلز کالج جموں ریاست کشمیر تعمیر کرایا۔ دربار کشمیر سے بھی بہت کچھ انعام ملا۔

آپ کی طبیعت کو صنعت و حرفت سے خاص لگاؤ تھا چنانچہ آپ ہندو کاٹن پریس کمپنی لیمیٹڈ انبالہ شہر کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے بیس۲۰ برس تک چیرمن رہے۔ ۱۹۲۷ء میں جب زیادہ ضعیف ہوگئے تو اس خدمت سے مستعفی ہوگئے۔ ۱۹۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو اٹھاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ رادھا سوامی ست سنگ شاخ بیاس کے رکن تھے۔ زیادہ وقت گیان دھیان میں گذارتے تھے۔ آپ نے پانچ لڑکے اور چھ لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں تین لڑکے اور چار لڑکیاں عین شباب ہی میں فوت ہوگئے تھے اب دو لڑکیاں حیات ہیں۔ اور منشی مراری لال جن کی عمر ۵۰ سال ہے مرحوم کے جانشین ہیں۔

ہاف ٹون عکسی تصاویر

[illegible] — [illegible]

یہ تصاویر ہاف ٹون بلاک سے عمدہ آرٹ پیپر پر شائع ہوئی ہیں اور انکو عام پسندگی کا فخر حاصل ہے

تصاویر رنگین
فی تصویر ۲ر
نغمۂ محبت
موسم سرما
باد بہاری
انتظار
ہدایت
گل پنج روزہ
رفیق طفلی
شکنتلا و دشینت
مشعل ہدایت
تار شکستہ
(فن تصویر کے نمونے)
کثرت میں وحدت
وقت نزع
نظر بد کا اتار
راجہ آج کا ملاپ
بھکارنی
سمندر ساشن
امید وفاداری
سیوا جی اور رامداس

یورپ کا ایک معرکہ
ایک قدیم مشرقی مدرسہ
مصطفےٰ کمال پاشا
کی ترکی کونسل
غسل کی تیاری
ستیہ وان اور ساوتری
راجہ کر انند کے بیٹے
کا قتل
باسدیو اور دیوکی نندلال
زوجۂ یکش متعلق میگھ دوت
اکبر اعظم ار
راجہ مان سنگھ ار
اکبر اور چیتے کا شکار
دربار شاہجہاں ار
عہد مغلیہ میں شاہی
سواری کا جلوس ار
محاصرہ چتوڑ ار
پیدائش شاہزادہ سلیم
دربار جہانگیر میں
سفیر فارس
ٹیپو سلطان ار

دارا شکوہ کا ہنر اورنگزیب
کے سامنے پیش ہوتا ہے
دربار مادھو راؤ پیشوا
دربار شاہ عباس

موسمی تصاویر

ماہ چیت ۲ر بیساکھ ۲ر
جیٹھ ۲ر اساڑھ ۲ر
بھادوں ۲ر ماگھ ۲ر
بھاگن ۲ر ساون ۲ر

مشہور انشا پردازان اردو

مولانا شبلی ار
شمس العلماء ذکاء اللہ ار
شمس العلماء ڈاکٹر سید علی ار
میر تعشق لکھنوی ۲ر
حضرت انیس مرحوم ۲ر
حضرت سرور ۲ر
مولوی عزیز مرزا ۲ر
بابو بالمکند گپتا ۲ر
ایڈیٹر بھارت متر ۲ر
منشی احمد علی شوق ار

مشاعرہ کیننگ کالج لکھنؤ
منعقدہ سنہ ۱۱ء ار
مرزا سلطان احمد ار
مرزا محمد رفیع سودا ۲ر
مرزا اسد اللہ خاں ار
مولانا عبد الرزاق الٰہ آبادی ۲ر
مولانا آزاد دہلوی ار
مسٹر رام بابو سکسینہ ۲ر
منشی نوبت رائے نظر ۲ر
جناب چکبست ۲ر
حضرت صفی ۲ر
ڈاکٹر اقبال ۲ر
مولانا حسن نظامی ۲ر

لیڈران ہند

ناموران ملک

راجہ رام موہن رائے ۲ر
مسٹر دادا بھائی نوروجی ار
سر سالار جنگ ۲ر
ڈاکٹر ضیاء احمد خاں ار
اراکین دیانند کالج ار
مسٹر تلک ۲ر

جسٹس محمود ۲ر
بابو سریندر ناتھ بنرجی ار
سر رام کرشن بھنڈارکر ار
بابو گنگا پرشاد ورما ۲ر
کالیچرن بنرجی ار
سوامی ویویکانند ۲ر
نواب محسن الملک ۲ر
مسٹر راس بہاری ۲ر
ڈاکٹر ستیش چندر
بنرجی ۲ر
پنڈت بشمبر ناتھ ۲ر
بابو پرتاپ چندر بنرجی ۲ر
جسٹس لال چند ایم اے ار
آنریبل مسٹر گوکھلے ۲ر
انجمن خادمان ہند ۲ر
مہاتما گاندھی ۲ر
پنڈت مدن موہن
صاحب مالوی ار
کرنل بھولا ناتھ ۲ر
پنڈت موتی لال نہرو ۲ر
لالہ لاجپت رائے ۲ر

سر ابراہیم رحمت اللہ
لالہ ہنسراج ۲ر
راجہ صاحب محمود آباد ۲ر
سر آغا خاں ار
لارڈ سنہا ار
محمد علی مولانا ۲ر
مسٹر سچدانند سنہا ۲ر
مسز سروجنی نائیڈو ۲ر
مہاتما منشی رام ۲ر
سوامی شردھانند ۲ر
سر بندر ناتھ بنرجی ۲ر
ڈاکٹر ٹیگور ۲ر
بابو بھگوان داس ار
نواب سید حسن بلگرامی ار
نواب سید محمد ار
سورداس ار
ایک عالم دین کا مدرسہ ار
منشی بشن نراین ار
صاحب بھاگو ار
راز و نیاز ار
تصویر شیر محمد تغلق ار

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمائیے

آپ کی خوش قسمتی اُس روز شروع ہوگی

جس روز سے آتنک نگرہ گولیوں اور طلا واجی کرن کا استعمال کرینگے

آتنک نگرہ گولیاں تمام اندرونی خرابیوں قبض بد ہضمی خون اور منی کی خرابی و کمی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت انزال رقت منی وغیرہ کو دور کرکے حیرت انگیز طاقت عطا کریں گی
قیمت ۳۲ گولیوں کی ڈبیہ صرف ۱؎، پانچ ڈبیاں للعہ

طلا واجی کرن بچپن کی غلط کاریوں سے پیدا شدہ رگوں کی کمزوری اور ڈھیلا پن اور عضو مخصوص کی جملہ خرابیوں کو دور کرکے حیرت انگیز مردمی عطا کرتی ہیں۔
قیمت فی شیشی صرف پانچ روپیہ۔

نہایت عمدہ مضامین سے مزین کتاب کام شاستر بالکل مفت طلب فرمائیں۔

کانپور ایجنٹ:۔ عبد الکریم اینڈ سنز۔ مسٹن روڈ۔ کانپور

ویدشاستری۔ جام نگر۔ کاٹھیاواڑ

ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر۔ کرا صاحب بہادر سی آر ایس فیلو آف کیمسٹری لندن

جس کی بابت لندن کلکتہ پنجاب آگرہ میڈیکل کالج کے سند یافتہ ڈاکٹروں نوابوں اور راجاؤں معزز حکما صاحبان ڈپٹی کلکٹران و معزز یورپین انگریزوں وغیرہ نے بعد تجربہ لکھا ہے کہ ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماری اور ترقی روشنی کیواسطے مفید ہے اور سب سے بہتر ثابت ہوا ہے ملک روس افریقہ کے معزز ڈاکٹروں اور ہندوستان کے حکیموں ڈاکٹروں نے آنکھوں کی بیماریوں میں ادویات کو چھوڑ کر اس سرمہ کو استعمال کیا ہے

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اسمیں کامیابی

نگاہ ناپکر سرمہ لگائیے دو ہفتہ میں روشنی بڑھ جائیگی اور جملہ نقائص دور ہوجائیں گی عینک کی ضرورت نہیں رہیگی۔ دھند ڈھلکا تا لکنا بہنا۔ سرخی سوزش آنکھوں کے سامنے اندھیرا پلکوں کے اندر کی سرخی گوہانجی دور ہوجاتی ہے کمزور نگاہ سے تاگا سوئی میں بہت جلد ڈال لیجئے۔ پربال۔ سبل سجالا پھولا۔ ابتدائی موتیابند ناخونہ۔ آنکھوں کے سامنے دھواں سا آنا بند ہوجاتا ہے لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کا تکان اور سرخی بہت جلد صاف کرتا ہے اور امراض چشم سے محفوظ رکھتا ہے۔ قیمت فی تولہ تین روپیہ ہے، محصولڈاک ۶

منیجر نگم کمپنی، نیا چوک۔ کانپور

خارش کے داغ دھبے مہاسے اور پھوڑے پھنسیاں

جڑی بوٹیوں کے بنے ہوئے طلسمی مرہم زمبک کے لگانے سے

بہت جلد اچھے ہو جاتے ہیں

کیا مکروہ داغ دھبوں یا مواد دار زخموں سے آپ کا چہرہ یا جسم بدنما ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو زمبک لگانے سے آپ اپنی جلد کو تسکین دیکر تندرست کر سکتے ہیں قبل اسکے کہ پرانا اکزیما۔ داد۔ دھندری یا دیگر قسم کا تکلیف دہ عارضہ پیدا ہو۔

زمبک ایک عجیب و غریب نباتاتی مرہم ہے۔ جادو کی طرح تمام جلن۔ خارش اور درد کو رفع کر دیتا ہے زمبک ورم کو تحلیل کرتا ہے جلد کی بدرنگی کو دور کرتا ہے اور تمام زہریلے جراثیم کو ہلاک کر دیتا ہے زمبک کی یہ تمام شفابخش تاثیر اس وجہ سے ہے کہ وہ جڑی بوٹیوں سے بنتا ہے اور نہایت لطیف ہوتا ہے۔ زمبک لگاتے ہی جسم کے اندر گہرا سرایت کر جاتا ہے اور بیماری کو اندر کی طرف سے دور کرتا ہے۔ چربی دار چکنی والی دوائیں صرف جلد کی سطح پر چپک کر رہ جاتی ہیں اور اسی وجہ سے بیکار ہوتی ہیں۔ غرض آپ کو کسی قسم کی جلدی بیماری ہو اُسے زمبک سے اچھا کیجئے۔

حیوانی چربی سے پاک و صاف ہے

تمام دوافروش زمبک کی ڈبیہ [illegible] میں فروخت کرتے ہیں

ایجنٹس: میسرز اسمتھ اسٹانسٹریٹ اینڈ کو لمیٹڈ [illegible] کلکتہ

زمبک Zam-Buk

پیپس کی ہر ٹکیہ پر
نقرئی غلاف
چڑھا ہوا ہے
PEPs
for
COUGHS
COLDS &
BRONCHITIS
ONE PASTILLE AS REQUIRED.
SEE BOOK FOR FULL DIRECTIONS.
حلق سانس لینے والی نلیوں اور
پھیپھڑوں کے ذریعہ سے فائدہ پہونچانے والی
عجیب و غریب ٹکیاں
جیوں ہی پیپس کی ٹکیہ منہ میں گھلتی ہے اس سے بیش بہا
شفا بخش ابخرے اٹھتے ہیں پیپس حلق کو تسکین دیتی
اور سانس کی نلیوں کی دکھن یا ورم کا جلد خاتمہ کر دیتی
ہے تنفس کے نازک نلیوں کو پیپس چھوت چھات
کے اثر سے پاک کر دیتی ہے اور ہر قسم کے امتلا کو
صاف کرتی ہے انفلوئنزا اور زکام کے جراثیم کو پیپس
جلد ہی برباد کر دیتی ہے یہ ہوائی نلیوں کے نزلہ اور
پھیپھڑے کے شدید تکالیف کو باز رکھتی ہے تمام دوا فروش
انگریزی ٹین کی شیشی میں پیپس فروخت کرتے ہیں
کھانسی زکام اور برانکائٹس کے لیے
پیپس
علمی ذوق رکھنے والے حضرات حسب ذیل کتابیں ضرور منگائیں
رامائن مسدس
(مصنفہ جناب منشی رام جی لال صاحب تنویر سنبھلی)
اول تو اس رامائن میں مخصوص ایک خوبی یہ ہی کہ قابل مصنف
نے شری رامچندر جی کے حرکت کو عجیب و غریب انداز میں ظاہر کیا ہے
جو بمقابلہ دیگر رامائنوں کے نیا اور انوکھا ہی اور فرسودہ مضمون
سے پاک و صاف ہی آپکے جدت طراز ذہن رسا نے ایسے ایسے نازک
نادر استعارات و دلفریب تشبیہات دلکش اس حسن و خوبی سے استعمال
کی ہیں جو دیدہ زیب جاذب نظر رنگین روحانی وجدانی لطافت سے مملو اور
معنی آفرینی میں قریب الماخذ ہیں ہر شعر چلتا ہوا جادو اور نشتر کا
کام کرتا ہے لطف محاکات و بلند پروازی خیل قابل تحسین ہر
اشعار کی نوعیت کا رنگ بالکل نیا ہے فصاحت کا دریا
لہریں لے رہا ہے غرضکہ یہ رامائن تفریح اور عبرت کا درس دینے میں
بے نظیر ہے رامائن کے اندر تو تصویریں رنگین نہایت عمدہ ہیں
حجم ۲۰۴ صفحات قیمت مجلد با تصویر تین روپیہ
پریم چند کی تازہ تصنیف
بیوہ
اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات لکھے
گئے ہیں اور ان کی ترغیبات کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک
بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں
اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش
کی گئی ہے کہ بیواؤں کے لئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے
حجم ۲۵۰ صفحات قیمت ایک روپیہ
آج ہی فرمائش بھیج دیجئے
ملنے کا پتہ
منیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور

جلد ۶۱ — اگست ۱۹۳۳ء — نمبر ۲

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم بی اے

فہرست مضامین

تصویر: نواب حیدر جنگ بہادر نظم طباطبائی مرحوم

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

زمانہ

جلد ۶۱ — اگست ۱۹۳۳ء — نمبر ۲

مرزا رسوا مرحوم

(از سید افتخار حسین صاحب بی اے۔ ایل ایل۔ بی ڈسٹرکٹ و سشن جج کانپور)

مجھ میں نہ مضمون نگاری کی مہارت ہے نہ اہلیت۔ مرزا صاحب کا ساتھ لکھنؤ میں کئی سال رہا لہٰذا دل نہیں مانتا کہ اُن کے کچھ حالات سے اہل علم و ذوق کو آگاہ نہ کروں۔ میں ۱۸۹۸ء کے آخر میں کرسچین کالج لکھنؤ میں داخل ہوا، اور اُسی کالج سے ایف۔ اے۔ بی۔ اے پاس کیا۔ آخر تک کورس میں فارسی تھی، اور روزانہ مرزا صاحب کے کمرہ میں حاضری ہوتی تھی۔ مرزا صاحب کالج مذکور میں فارسی کے پروفیسر تھے، بعد بی۔ اے پاس ہونے کے جولائی ۱۹۰۲ء میں کالج میں مرزا صاحب کے پاس حاضر ہوا۔ فرمایا کہ تم نے بی۔ اے تک ریاضی پڑھی، کچھ کام اُس سے نہ لیا۔ میں نے عرض کیا کہ پہلے قصد انجینیرنگ کا تھا اب مجبوراً قانون شروع کیا ہے، اُس سے کیا کام لے سکتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ ہیئت[1] پڑھو۔ عرض کیا کہ کس سے؟ فرمایا کہ اب اس کے محتاج نہیں ہو کہ کوئی پڑھائے۔ دنیا میں کتابیں موجود ہیں ہم تم دونوں حاصل کریں۔ میں بھی آمادہ ہو گیا۔ کیننگ کالج میں نو بجے سے دس بجے تک لا کلاس میں حاضری دیتا تھا بقیہ اوقات مرزا صاحب کے ساتھ کالج میں صرف ہوتے تھے۔ کرسچین کالج میں دو یوم ہفتہ میں یعنی سنیچر اور اتوار کو تعطیل رہتی تھی۔ یہ دو روز مرزا صاحب کے گھر پر ۹ بجے سے سات بجے شام تک بسر ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ آخر دسمبر ۱۹۰۲ء تک رہا۔ پھر میور سنٹرل کالج الہ آباد چلا گیا۔ اس طرح سے

[1] Astronomy.

مرزا صاحب کے حالات سے ایک حد تک واقفیت ہوئی۔ مرزا صاحب کے حالات کی بابت چند امور جو میرے علم میں ہیں اُنھیں بطور شذرات پریشاں (Stray Notes) کے بیان کرتا ہوں۔

مرزا صاحب کا شوقِ علم

مرزا صاحب کے والدین جیسا کہ خود اُنھیں سے مجھے معلوم ہوا بچپنے میں قضا کر گئے تھے۔ چچا چچی نے پرورش کی، قضاء الٰہی سے اُن بزرگواروں نے بھی انتقال کیا، مرزا صاحب تنہا رہ گئے مگر اسکول کی حاضری برقرار رہی۔ پڑھتے رہے اور اسباب خانہ داری فروخت کر کے لبسر کرتے رہے۔ ایک میم صاحبہ اُن کی چچی کے یہاں آیا کرتی تھیں جو بعد کو لکھنؤ سے باہر چلی گئیں۔ مرزا صاحب کا حال جب اُن کو معلوم ہوا تو اُنھیں بہت تاسف ہوا، کچھ مدد کرنی چاہی مگر مرزا صاحب کی غیور طبیعت سے واقف تھیں، لہذا وقتاً فوقتاً لفافہ میں کچھ نوٹ بھیجدیا کرتیں مگر نام کبھی نہیں لکھا تاکہ ایسا نہ ہو کہ مرزا صاحب واپس کر دیں۔ بہرحال مرزا صاحب انٹرنس پاس ہو گئے۔ اس کے بعد کل اساسہ فروخت کر کے کتابیں خریدیں اور ضروری اشیا ساتھ لیکر روڑکی کالج میں داخل ہوئے۔ اور سیری کا امتحان پاس کیا، اور کوئٹہ میں تعینات ہوئے ستّر روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور بیس روپیہ الاؤنس۔ مرزا صاحب کا خرچ نہایت محدود تھا، روپے پس انداز ہوئے دفعتاً سائنس کا شوق پیدا ہوا، چھ مہینہ کی رخصت لی بمبئی سے آلات سائنس منگائے لکھنؤ تشریف لائے، کرایہ کا مکان لیا۔ دال۔ چاول۔ گھی۔ لکڑی خرید کر رکھی، دروازہ اندر سے مقفل رہتا تھا، صرف بھشتی اور مہتر کے آنے پر کھلتا تھا۔ جب بھوک نے ستایا کھچڑی چڑھا دی جیسی بُری بھلی پکی کھالی۔ کل اوقات سائنس کے پڑھنے اور تجربہ کرنے میں صرف ہوتے تھے۔ چھ مہینہ ختم ہوئے مگر سائنس کا شوق ختم نہ ہوا، استعفا بھیجدیا۔ جب روپیہ نے اَلْعَفانہ کی تو مجبوراً کتابیں بند ہوئیں، مکان کا دروازہ کھلا۔ کرسچین کالیجیٹ اسکول میں تشریف لائے اور مجبوراً پچیس روپیہ ماہوار پر ہیڈ مولوی کی جگہ قبول کی۔ دوسری مثال مشکل سے ایسی ملے گی کہ پڑھنے کے شوق میں نوکری کو خیرباد کہا۔

بعد کو اسکول ہی سے خانگی طور پر پڑھکر پنجاب یونیورسٹی میں ایف۔ اے۔ بی۔ اے۔ کا امتحان دیا، پاس ہو گئے۔ کسی صاحب نے زمانہ کے اوراق میں خاص وجہ اُن کے بی۔ اے پاس کرنے کی لکھی ہے، مجھے اس کا علم نہیں، وجہ جو کچھ ہو یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب نے پرائیوٹ طور پر پڑھکر بی۔ اے پاس کیا یہ ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ مرزا صاحب کی انگریزی کی استعداد بہت اچھی تھی جب میں کالج میں تھا جو فارسی کا کورس تھا اُس کا انگریزی ترجمہ مرزا صاحب نے شائع کیا تھا وہ بہترین ترجمہ سمجھا جاتا تھا۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مرزا صاحب کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے، معلوم نہیں کیا تنخواہ ابتدا

میں مقرر ہوئی تھی، رفتہ رفتہ ترقی کے بعد کالج سے سو روپیہ ماہوار مرزا صاحب کو ملتے تھے۔ خدا جانے کس وجہ سے مرزا صاحب مقروض ہو گئے تھے، نصف تنخواہ قرض میں جاتی تھی نصف میں بسر کرتے تھے دو بیویاں تھیں ایک لڑکا تھا، کرایہ کا مکان، کالج کے قریب قیام تھا۔ جب میں اور مرزا صاحب ہیئت پڑھ رہے تھے تو ایک روز کالج میں مجھ سے فرمایا کہ میں نے یہ قاعدہ ایجاد کیا ہے، دیکھو اس میں کس قدر سہولت ہوتی ہے، میں نے دیکھا عرض کیا کہ اس میں شک نہیں کہ قاعدہ خوب ہے اور اس کی ایجاد میں آپ نے کمال کیا مگر اس میں غلطی کا احتمال زیادہ ہے میں نے ایک قاعدہ بتایا جسے مرزا صاحب نے بھی تسلیم کیا کہ اس میں غلطی بہت ہی خفیف رہیگی۔ پوچھا یہ قاعدہ کہاں سے معلوم ہوا، عرض کیا تفرقی حساب[1] میں۔ مرزا صاحب نے کتاب کا نام لکھ لیا۔ ایک بار چاند کی حرکت کی بابت بحث تھی کہ غایتہ تعدیل کس مقام پر ہونا چاہیئے۔ مرزا صاحب نے ایک مقام پر بتایا، میں نے اختلاف کیا، میں نے دوسرے مقام پر بتایا۔ فرمایا کہ جو میں نے کہا ہے وہ محقق طوسی کا قول ہے، میں نے عرض کیا باشد۔ محقق کا فضل ہم سے زیادہ تھا کہ وہ موجد تھے، کمال ہمارا زیادہ ہے، محقق کو صرف اسی قدر معلوم تھا جو اُن کے قبل ایجاد ہوا اور جو اُنھوں نے خود ایجاد کیا، ہم کو وہ سب معلوم ہے نیز وہ جو ان کے بعد ایجاد ہوا۔ فرمایا یہ صحیح ہے مگر مجھے غلطی سمجھاؤ۔ میں نے سمجھایا کہ علم قطع مخروطات[2] محقق کے بعد ایجاد ہوا۔ اُن کا فضل یہ تھا کہ اُنھوں نے بغیر دُوربین کے یہ معلوم کر لیا کہ سیاروں کی حرکت دائرہ میں نہیں ہے اُن کے پیش نظر دوسری کوئی شکل نہ تھی مجبوراً کہا کہ بیضوی شکل ہے حرکت ہوتی ہے، اس میں شک ہے کہ اگر حرکت بیضوی شکل میں مانی جائے تو غایتہ تعدیل اُسی مقام پر ہوگی جہاں اُنھوں نے کہا ہے یعنی داخل المرکز کی سیدھ میں، مگر یہ مسلّم ہے کہ حرکت اہلیلجی (Ellipse) شکل میں ہوتی ہے، لہذا غایتہ تعدیل داخل المرکز اور خارج المرکز کے درمیان میں ہونا چاہیئے۔ مرزا صاحب نے اسے تسلیم کیا۔ اور کتاب کا نام یعنی (Conic Sections) لکھکر رکھ لیا۔ غرضکہ اسی طرح سے کبھی میکانیات[3] کا نام اور کبھی علم المثلث (Trignometry) کا کبھی کسی اور کتاب کا نام لکھ لیا گئے یہاں بطور جملۂ معترضہ کے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مرزا صاحب کی اُس وقت تنخواہ صرف پچاس روپیہ ماہوار ہو گئی تھی، پچیس روپیہ قرض میں جاتے تھے اور پچیس روپیہ اُنھیں ملتے تھے۔ واقعہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب حیدر آباد جانا چاہتے تھے چند مہینہ کی رخصت لی اور ایک اپنے دوست کو جن کا نام نہ لونگا اپنی جگہ پر پچاس روپیہ ماہوار پر مقرر کر دیا تھا۔ جب چھ مہینہ قریب بہ ختم پہونچے تو دوست صاحب نے ایسی

---

[1] Differential Calculus [2] Conic Sections [3] Mechanics

فکر کی کہ مرزا صاحب برخاست ہو گئے اور وہ پچاس روپیہ ماہوار پر پروفیسر ہو گئے، مرزا صاحب کو خبر ہوئی تو دوڑے آئے اور پرنسپل سے واقعات کہے۔ پرنسپل نے کہا کہ ہم کو تو انھیں پچاس دینا ہوتا ہے اگر پچاس قبول کرو تو آؤ۔ مرزا صاحب نے قبول کیا اور اُن کے دوست صاحب علٰحدہ ہو گئے اور مرزا صاحب کی تنخواہ سو سے پچاس رہ گئی۔ ایک مرتبہ میں نے اس واقعہ کو مرزا صاحب سے پوچھنا چاہا فرمایا کہ جانتے ہو پھر پوچھتے کیا ہو زمانہ کا یہی رنگ ہے۔ غرضکہ یہ مرزا صاحب کا ظرف تھا کہ کبھی اپنی زبان سے ایک حرف بھی اُن کے خلاف نہیں کہا۔ بجائے ان کے اور کوئی صاحب ہوتے تو ذرا سا چھیڑ دینے پر پورا قصہ از ابتدا تا انتہا سنا ڈالتے۔ مگر مرزا صاحب کی ذات اس سے کہیں بالاتھی کہ کسی کی شکایت کا کوئی حرف زبان تک آئے۔ افسوس اب ایسی ہستیاں مفقود ہیں۔ بہرحال مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ تنخواہ کیونکر کم ہوگئی۔ جس زمانہ میں مجھ سے کتابوں کے نام لکھے صرف پچیس روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ کالج سے تنخواہ ملی تو لیکر سیدھے کتب فروش کے یہاں پہونچے، اُنتیس[۲۹] روپیہ کی کتابیں خریدیں پچیس[۱۵] روپیہ دیدیئے چار کا اگلے مہینہ کا وعدہ کیا جب گھر پہونچے بیویوں نے روپیے طلب کئے۔ ارشاد ہوا کہ خدا نے رزق کا وعدہ کیا ہے دیگا، اس وقت کتابوں کی ضرورت تھی لے آیا۔ مجھ تک ایک صاحب کے ذریعے اس کی شکایت آئی اور میں نے وعدہ کیا کہ آج سے مرزا صاحب سے کسی کتاب کا نام نہ لونگا۔

مجھے تو کوئی اور ایسا نظر نہیں آتا کہ جسے شوقِ علم میں مرزا صاحب کے مقابلہ میں بطور مثال پیش کر سکوں۔ جن صاحب کو شوقِ علم کا دعویٰ ہو وہ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ آیا وہ ایسا کر سکتے ہیں کہ مہینہ بھر تک بیوی بچے تکلیف اُٹھائیں مگر کتابیں خرید لی جائیں۔ اگر مرزا صاحب مجھ سے کتابوں کے لئے فرماتے تو کل کتابیں میرے پاس موجود تھیں میں پیش کر دیتا مگر مرزا صاحب کی غیرت اس کی مقتضی نہ تھی کہ کسی سے کسی شئے کے طالب ہوں، مجھے مرزا صاحب کی کوئی تعریف مقصود نہیں ہے اُنکی ذات اس سے مستغنی تھی، میں نے صرف واقعات عرض کئے ہیں اس سے قارئین خود نتیجہ نکال لیں۔

مرزا صاحب کی لاپروائی میں نے ہیئت جولائی سے شروع کی تھی، آخر اگست یا وسط ستمبر میں ایک بار مجھ سے فرمایا کہ چوک میں سنا ہے کہ ایک کباڑی کے پاس اقلیدس کے بارہ مقالے ہیں چلو لے آئیں میں اُن کے ساتھ ہو لیا، راستہ میں ایک دوست ملے، مرزا صاحب سے پوچھا خیریت ہے فرمایا ہاں، کہا لڑکا کیسا ہے، فرمایا کہ کہیں چلے گئے۔ پوچھا کیوں کہا کہ وہ اپنے اخراجات کے لئے زیادہ چاہتے تھے، میں کفیل نہ ہو سکا میرے یہاں رہنا پسند نہیں کیا انہیں چلے گئے۔ پوچھا کسی سے دریافت کیا۔ فرمایا دو ایک صاحبوں سے کہا تو تھا۔ میں حیرت سے مرزا صاحب کو دیکھنے لگا کہ دو مہینہ سے میرا روزانہ کا ساتھ ہے مجھے اسوقت

تک اس واقعہ کا علم ہوا اور آپ فرماتے ہیں کہ دو ایک صاحبوں سے کہا تو تھا۔ غرض کہ مرزا صاحب کو دنیا میں کسی شخص یا کسی شے کی فکر نہ تھی، فکر تھی تو علم کی، علم کے ایسی پیاس مرزا صاحب کو تھی جو کسی طرح بجھائے نہ بجھتی تھی۔ افسوس زمانہ نے مرزا صاحب کی قدر نہ کی اور اُن کی معلومات سے فائدہ نہ اُٹھایا۔

مرزا صاحب کی ہیئت دانی | مرزا صاحب اور میں دونوں نے چھ مہینہ متواتر محنت کی اور ہیئت حاصل کیا۔ مرزا صاحب نے زیچ الغ بیگی، زیچ محمد شاہی، ہندی کے پترے سامنے رکھے، اور چند انگریزی کتابیں جن میں گرینیچ کی تقویم (Almanac) بھی تھی۔ سب کو ملا کر ایک کتاب مرتب کی، زیچوں اور پتروں میں جو غلطیاں تھیں اونھیں رفع کیا اور Almanac کے درجہ پر پہونچا یا، نئی جدولیں حرکات سیارگاں کی مرتب کیں، اور اُن سے نہایت صحیح نتیجہ پر پہونچے تھے۔ ایک کتاب مرزا صاحب نے لکھی تھی ایک میں نے، میری کتاب کا یہ حشر ہوا کہ جنوری ۱۹۰۲ء میں میں الہ آباد میور سنٹرل کالج کے لاکلاس میں چلا آیا وہ مشغلہ جاتا رہا، کتاب بکس میں بند کر دی، ایک روز دیکھا کہ بچے اس کے اوراق سے کھیل رہے ہیں معلوم ہوا کہ کتاب محض کاپی کی شکل میں تھی اس میں مختلف اشکال سیارگاں کے فصل کی پیمایش وغیرہ کی بنی ہوئی تھیں بچوں کو اس سے کچھ دلچسپی ہوئی اور اسے نکالکر ضائع کر دیا۔ افسوس اور کتاب کا ماتم کر کے خاموش بیٹھ رہا۔ مرزا صاحب کی کتاب کا مجھے علم نہیں کہ کیا حشر ہوا۔

مرزا صاحب کا فلسفہ | مرزا صاحب کو فلسفہ میں بھی کماحقہ دستگاہ تھی، سنہ ۱۹۰۲ء میں جب میں لکھنؤ سے چلا گیا تو مرزا صاحب نے واعظانہ رنگ اختیار کر لیا تھا، منبر پر بیٹھکر وعظ فرمایا کرتے تھے اور ایک رسالہ الحکم جاری کیا تھا جس میں فلسفیانہ مضامین ہوا کرتے تھے۔ الحکم کے پرچے مرزا صاحب کے تبحر فلسفہ پر دال ہیں، جن صاحبوں کے پاس ہوں وہ اُنھیں دیکھکر رائے قائم کر سکتے ہیں کہ مرزا صاحب کو فلسفہ میں کس قدر دستگاہ تھی۔

مرزا صاحب کی ناول نویسی | مرزا صاحب نے کئی ناول لکھے، اُمراؤ جان اَدا۔ شریف زادہ۔ ذات شریف لیلیٰ مجنوں وغیرہ۔ اُمراؤ جان اَدا بہترین ناول ہے جو اس وقت تک میری نگاہ سے گذرا ہے۔ لکھنؤ کی طرز معاشرت کا جو سنہ ۱۸۵۷ء کے قبل تھی سچا فوٹو ہے اور اس میں اس خوبی سے مختلف مسائل پر بحث کی ہے کہ باید و شاید، مشاعرہ اس میں ایسا لاجواب ہے کہ اس کی مثال ملنی ناممکن ہے۔ کل غزلیں اُس میں مرزا صاحب کی کہی ہوئی ہیں، مگر انتہائی کمال یہ ہے کہ جس شخص کے نام سے جو غزل ہے وہ زبان۔ محاورہ عقائد ہر لحاظ سے ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اُسی شخص کی ہے۔ دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ ایک کتاب

میں کچھ مسمریزم کی بابت لکھا تھا، جس پر ایک صاحب نے فرمایا تھا کہ مرزا نہ ہوتے تو ایک صدی تک ایسی تصانیف کا پبلک میں آنا محال تھا۔ افسوس کہ ان کتابوں کی تصنیف سے مرزا صاحب کو کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ مرزا صاحب خود اشاعت کر نہیں سکتے تھے، جن صاحب نے شائع کیا انھیں کافی فائدہ ہوا مرزا صاحب کو برائے نام۔

مرزا صاحب کی عربی دانی | مرزا صاحب زبان عربی سے خوب واقف تھے، مگر عبارت پڑھنے میں اعراب میں غلطی کر جاتے تھے۔ بات صرف یہ تھی کہ خود ہی پڑھا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اعراب کا صحیح استعمال بغیر مطلب سمجھے ہوئے نہیں ہو سکتا۔ ہم کو تو صرف مطلب سے غرض ہے جب وہ سمجھ گئے تو اعراب کچھ ہی ہوں۔ میں نے ایک بار عرض کیا کہ کسی زبان کا دوسری زبان میں صحیح ترجمہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ہر قوم کی زبان اُس قوم کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی ہے، کسی دو قوم کی ضروریات یکساں نہیں۔ لہٰذا ایک زبان کے الفاظ کے لئے دوسری زبان میں الفاظ نہیں مل سکتے۔ فرمایا ایک حد تک یہ صحیح ہے مگر عربی میں الفاظ دوسری زبان کے الفاظ ترجمہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ Condescend کا ترجمہ کیا کیجیئے گا کچھ دیر غور کر کے فرمایا کہ تنزلاً کہہ سکتے ہیں۔

مرزا صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ اُن کو ہر شے کے لئے ایک دَور ہوتا تھا، کسی وقت کسی شے سے اور کسی وقت کسی شے سے رغبت ہوتی تھی۔ جس وقت جس شے کا دَور ہوا اُس کی طرف متوجہ ہوئے اور دیگر کل امور جب تک یہ دَور رہتا تھا طاق نسیان پر رکھ دیے جاتے تھے۔ اور دن رات اسی ایک شے کا دھیان رہتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ جنون کے دَورے سے مثال دے سکتے ہو۔ کبھی فلسفہ کا جنون ہے کبھی ریاضی کا، کبھی سائینس کا، کبھی کسی شے کا، کبھی کسی شے کا۔

مرزا صاحب کا مذاق | مرزا صاحب کا نہایت صاف ستھرا مذاق ہوتا تھا، مذاق میں عمومیت نہ تھی نہایت پُر معنی مذاق ہوتا تھا اُس پر جتنا غور کیجئے اُتنا ہی لطف اُٹھائیے۔ میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ مرزا صاحب کے پاس ایک صاحب رباعی لے گئے۔ اصلاح کے لئے کہا، جب اصرار کیا تو مرزا صاحب نے اُس پر غور کیا۔ رباعی میں اول تین مصرعوں میں جوانی کی کیفیت نظم تھی کہ ہم جوانی میں ایسے تھے جو تھا مصرعہ یہ تھا کہ "پیری نے کہا کہ خواب دیکھا ہوگا"۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ شاعری ایک لفظ کی ہوتی ہے۔ اگر ایک لفظ مناسب ہے تو شعر کہیں سے کہیں پہونچ جاتا ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ اول تین مصرعے ٹھیک ہیں چوتھے مصرعہ میں پیری کا لفظ مناسب نہیں ہے۔ اُن صاحب نے کہا کہ اصلاح فرما دیجئے۔ مرزا صاحب نے قلم اُٹھا کر پیری کاٹ کر بیوی لکھ دیا۔ حضار اس قدر محظوظ ہوئے کہ کچھ نہ پوچھئے نہیں۔

مرزا صاحب کی شاعری

مرزا صاحب نے کئی سو غزلیں کہیں، ایک صاحب نے لکھنؤ میں ہر ردیف کی چند غزلیں مرزا صاحب کی لکھ رکھی تھیں، میں نے بھی نقل کی تھی۔ میرے پاس جو نقل تھی اُسے ایک صاحب لے گئے اور پھر واپس نہ کیا اور مجھے بھی یاد نہ رہا کہ کن صاحب کو دیا تھا۔ آج کل لوگوں کا قول یہ ہے کہ جو کسی کو کتاب دیکھنے کو دے وہ بیوقوف اور جو واپس کرے وہ اُس سے زیادہ بیوقوف۔ مجھ سے بیوقوفی ہوئی کہ میں نے وہ کاپی دیدی، اب بھلا وہ صاحب اُسے واپس کرکے مزید بیوقوفی کا ثبوت کیوں دیتے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب نے اپنی غزلیں جمع نہ کیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ جب میں ہیئت پڑھ رہا تھا اُس دوران میں ایک روز شاعری کا ذکر آگیا۔ میں نے عرض کیا کہ جناب نے اپنا کلام اکٹھا کیا؟ یہ کہنا تھا کہ مرزا صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، درد رسیدہ دل کو ٹھیس لگ گئی، فرمایا کہ دیوان مرتب کیا، دو سو صفحہ سے زائد کا نکلا۔ جب دوسری شے کا دَور شروع ہوا دیوان مرتب شدہ طاق نسیان پر رکھدیا، ایک روز بنیئے کے یہاں سے کوئی شئے منگائی تو وہ اُسی دیوان کے ورق میں پڑیہ بندھکر آئی۔ فوراً طاق پر دیکھا، دیوان ندارد۔ بنیئے کے یہاں دوڑا گیا چند ورق باقی تھے بقیہ کی پڑیاں بندھ گئیں، معلوم ہوا کہ صاحبزادہ نے ردی سمجھکر دو پیسہ سیر بیچ ڈالا۔ مرزا صاحب بہت افسوس کرتے رہے۔ آخری الفاظ مرزا صاحب کے اس کے متعلق یہ تھے کہ کسی کا دیوان اشرفیوں میں بکا وہ دیوان دو پیسہ سیر۔ مرزا صاحب کے کلام کی بابت میری ذاتی رائے یہ ہے کہ زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی اور نہایت سلیس، غالب کی پیروی جا بجا جھلکتی تھی مگر غالب کی نادر اور بعض اوقات دور از فہم ترکیبیں نہ تھیں۔ کلام میں کافی جدت تھی، ایک غزل کا مطلع فرماتے ہیں۔

بیانِ مدعا پر یار سے جھگڑا اگر ہوتا بتادے اے دلِ بیتاب آخر تو کدھر ہوتا

اللہ اکبر کس قوت سے مصرعہ ثانی لگایا ہے اور کیسا روزمرہ کی زبان میں ادا کیا ہے۔

دوسرا مطلع فرماتے ہیں:۔

غضب ہوتا اگر فریاد و شیون میں اثر ہوتا ہمارا حال کیا ہوتا جو اُن کو دردِ سر ہوتا

حضرت داغ کی مشہور غزل ہے:۔

زیرِ دیوار ذرا جھانک کے تم دیکھو تو لو ناتواں کرتے ہیں دل تھام کے آہیں کیونکر

مرزا صاحب اس میں فرماتے ہیں:۔

ہمنشینوں سے چھپا کر تمھیں چاہیں کیونکر چھپ سکیں گی یہ محبت کی نگاہیں کیونکر

واقعہ ہے کہ محبت کی نگاہ چھپانا محال نہیں تو سخت دشوار ہے۔

ضد بھی اک وضع ہو جا ہت وہ بنا ہیں کیونکر جو انھیں چاہتے بھلا وہ اُسے چاہیں کیونکر

فرماتے ہیں:-

راہ ہر اک کی جدا اور ہر ایک طالب یار دیکھیں اس کوچہ میں ملتی ہیں یہ راہیں کیونکر

یہ فلسفہ ہے۔ پھر فرماتے ہیں:-

خانۂ آئینہ میں ان کا مقابل نکلا دیکھیں لڑتی ہیں نگاہوں سے نگاہیں کیونکر

نگاہیں لڑانے کے لئے کہاں سے مقابل پیدا کیا ہے جو کسی طرح سے کمی نہ کرے۔ جب برابر کا مقابل ہو تب ہی لطف ہے۔

ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ آخری وقت میں معشوق بالیں پر آجائے اُس کا دیدار میسّر ہو جائے۔ مرزا صاحب اس کے خلاف بتاتے ہیں اور کس قدر معشوق کا پاس ہے کہ یہ منظور ہے کہ اپنی آخری تمنا بر نہ آئے مگر اُسے تکلیف نہ ہو۔ اللہ اللہ اتنا تو معشوق کا پاس ہو۔ فرماتے ہیں

دمِ آخر مری بالیں پہ نہ لاؤ اُس کو دیکھی جائینگی یہ حسرت کی نگاہیں کیونکر

غرض مرزا صاحب کی عجیب باکمال ملکہ مجموعۂ کمالات ذات تھی اور افسوس کہ زمانہ اس باکمال شخص سے خالی ہو گیا۔

سلک جواہر

بیوقوفی کے پیچھے بے عزتی چلتی ہے، اور غصہ کے بعد مصائب وغم آکھڑے ہوتے ہیں۔

غصہ ہمیشہ بیوقوفی اور کمزوری سے پیدا ہوتا ہے، مگر یاد رکھو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ اس کا نتیجہ افسوس اور پشیمانی ہے۔

جو انسان پیشتر تمہارا دشمن تھا، وہ تمہارے میٹھے اور نرم الفاظ کو سنکر تمہارا دوست بنجائیگا۔

اپنے دل میں غور کرو کہ دنیا میں غصہ کرنے کیلئے بالکل تھوڑی ہی باتیں ہیں، اور تمہیں حیرانی ہوگی کہ سوائے بیوقوف کے کوئی بھی عقلمند آدمی ان پر غصہ نہیں کر سکتا۔

غصہ ور آدمی کے غصہ کو نرم اور محبت آمیز الفاظ اسی طرح ٹھنڈا کر دیتے ہیں جس طرح کہ جلتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا پانی۔

انتقام یعنی بدلہ لینے کے بجائے ہمیشہ معاف کرنے کے لئے تیار رہو۔ جو انسان بدلہ لینے کی تاک میں لگ رہا ہے وہ اپنے سر پر آپ ہی مصائب کا پہاڑ لا رہا ہے۔

اپنے دل میں دوسروں کو نقصان پہونچانے کا جذبہ نہ پیدا ہونے دو۔ کیونکہ یہ تمہارے لئے باعث تکلیف ہوگا۔

فلسفۂ ہنود

از رائٹ آنریبل سری نواس شاستری

(مترجمہ جناب محمد اصغر انصاری بی اے)

۱۔ آج سے تقریباً چار ہزار برس پہلے آرین نسل کی ایک شاخ شمالی ہند کے چار بڑے دریاؤں کے کنارے آباد تھی۔ قدرتی وسائل اسقدر کافی تھے کہ محنت جسمانی کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ بغیر کسی دقّت وکلفت کے زندگی کی سادہ ضروریات مہیا ہو جاتی تھیں جنگلوں کے پاک اور گہرے سکون نے عہد قدیم کے ان بزرگ رشیوں کا فطرت کے ساتھ ایک ایسا ربط قائم کر دیا تھا جسکی حقیقت سے ہم آجتک ناآشنا ہیں۔ چنانچہ اسی تعلق کے باعث یہ پاکباز لوگ فطرت کے ایسے رازوں سے آگاہ تھے جو آج ہمکو حیرت میں ڈالے ہوئے ہیں۔ ہندی دماغ جو خصوصیت کے ساتھ نعمت غور وفکر کا حامل ہے مسائل مابعد الطبیعات میں انتہائی دلچسپی لیتا تھا۔

۲۔ اس زمانہ میں فلسفہ کے متعدد مذاہب پیدا ہو گئے تھے جن میں باہم اختلاف ہوا۔ اور بالآخر یہ مذاہب اپنے مخصوص ناموں کے ساتھ پکارے جانے لگے۔ یہ مذاہب ہر قسم کی فکر ورائے کے مظہر تھے۔ ان میں سے بعض منکرین خدا تھے، بعض متشکّکین تھے بعض مادّیین بعض مثالیئین ان حضرات نے جس طریقہ سے سچائی کی تلاش کی (تلاش کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو تلاش کرنیوالے سے زیادہ اور کچھ نہ سمجھتا تھا) وہ ذہنی استدلال کا طریقہ نہ تھا بلکہ وہ اس قوت کو کام میں لاتے تھے جسکو آجکل کے زمانہ میں "وجدان" Intuition کہا جاتا ہے۔

وید کی ابتدا

۳۔ میں ٹھیک ٹھیک تو نہیں بتلا سکتا کہ "وجدان" اس "طریقۂ استدلال ذہنی" سے جس پر آج اسقدر اعتماد کیا جاتا ہے کسطرح مختلف ہے۔ لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان دانشمندان قدیم نے مناسبت

فطری کے باعث اپنے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر لی تھی کہ وہ کتاب کائنات سے حقائق و معارف، اخذ کر لیتے تھے لیکن ان کے نتائج ادراک کتابوں میں قلمبند نہوتے تھے بلکہ انکے شاگردوں کے حافظوں میں محفوظ رہتے تھے۔ ایک زمانہ میں کتاب ہی کا دوسرا نام "وید" تھا جسکے معنی علم کے ہیں۔ اس لئے یہ علم وجدانی جب بصورت کتاب مدون ہوگیا تو یہی کتاب مقدس کے نام سے موسوم ہوگیا۔ اس کتاب یعنی وید میں جو کچھ درج تھا وہ چونکہ ایک عجیب و غریب طریقہ سے حاصل ہوا تھا اس لئے خطاؤں اور غلطیوں سے مبرا سمجھا جانے لگا۔ کوئی شخص کوئی علمی نظریہ یا فلسفہ کی کوئی تعلیم اسوقت تک پیش نہ کر سکتا تھا جب تک اس کی سند اس کتاب مقدس میں نہ پالیتا۔

۴۔ بلاشبہ ایسے لوگ بھی تھے۔ جو اس سند کو تسلیم نہ کرتے تھے مثلاً بودھ مذہب والے لیکن تقریباً اسی زمانہ میں ایسے دوسرے مذاہب بھی تھے جو تمامتر اسی سند عظیم کے پیرو تھے۔ یہی وہ مذاہب ہیں جو بعد میں "صحیح العقیدہ" کہلانے لگے۔ یہ مذاہب تعداد میں چھ تھے ان چھ میں سے ہمارے زمانہ تک صرف دو مذہب باقی رہے یعنی فن تفسیر کے وہ دو مذاہب جو میمانسا (मीमांसा) کہلاتے ہیں۔

۵۔ ان میں سے پہلا مذہب تو وہ ہے جس کا تعلق محض اُن رسوم سے تھا جو وید میں بتلائے گئے ہیں اور اس لئے (جہانتک موضوع زیر بحث کا تعلق ہے) اس کا ذکر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ مراسم اب صرف عہد ماضی کی یادگار ہیں۔ میمانسا (मीमांसा) کی دوسری شاخ "ویدانت" کہلاتی ہے جسکے معنی مقصود یا نتیجہ کے ہیں۔ یعنی وید کا مقصود آخر یا وہ آخری تعلیمات جو ان معلمین اعظم نے دی تھیں۔

چار متفق علیہ باتیں

۶۔ چار امور ایسے ہیں جن پر یہ صحیح العقیدہ مذاہب بالکل متفق تھے اور یہی وہ امور ہیں جو فلسفیوں کیلئے بمنزلہ غذائے ذہنی تھے۔ پہلا خیال یہ تھا کہ "روح انسانی" باقی رہنے والی ہے۔ لفظ "انسانی" کی تخصیص اسلئے ضروری ہے کہ شرق میں نباتات و حیوانات کو بھی ذی روح باور کیا جاتا تھا۔

۷۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ ہر شخص کے اعمال بھی زندہ رہتے ہیں۔ اور اپنے غیر مختتم دور میں نتائج مرتب کرتے رہتے ہیں۔ ہم سے مختلف خواہشوں اور اغراض کے باعث کچھ نہ کچھ اعمال سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ یہ اعمال اپنے مخفی اثرات رکھتے ہیں جو زندگی اور موت کے نہ ختم ہونیوالے چکر میں اپنے آپ کو مختلف شکل و صورت میں ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

یہی کرم ([illegible]) یعنی عمل کا نظریہ ہے اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ کسی انسان کا کوئی فعل یا عمل ایسا نہیں ہوسکتا جسکا وہ ذمہ دار ہو۔ اور پھر وہ فعل یا عمل خود اسکی زندگی میں اچھے یا بُرے نتائج پیدا نہ کرے۔ اعمال اور انکے نتائج کی یہ بیرحمانہ تکرار جو ہمیشہ سے چلی آئی ہے سنسار کہلاتی ہے۔ یہ لفظ ہندی علم ادب میں اسقدر عام تھا کہ بالآخر انگریزی زبان میں بھی داخل ہوگیا۔ اسکے معنی یہ تھے کہ اس کرہ زمین پر ارواح کی آمد و شد جاری رہتی ہے۔ کوئی روح اس ظاہر ظہور موت پر فنا نہیں ہوجاتی بلکہ وہ پھر پیدا کیجاتی ہے تاکہ اپنی سابقہ زندگی کے اعمال کے نتائج کو برداشت کرے یہ سلسلہ غیر متناہی طور پر جاری رہتا ہے اسی کو تناسخ ارواح کہتے ہیں۔

دنیائے رنج و عذاب

چوتھا خیال نہایت ہی اہم ہے۔ ہماری یہ دنیا جہاں ہم پیدا ہوتے اور مرجاتے ہیں اور چولا بدلتے رہتے ہیں یقیناً ایک دنیائے رنج و عذاب ہے اس سے نجات پانا چاہئے لیکن کسطرح؟ اس دکھ سے چھٹکارا اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ایک انسان موت و زندگی کے اس ازلی دور اور چکر سے کسی نہ کسی طرح باہر نہ نکل جائے۔ ہندوستان کے تمام فلسفوں کی تعلیم کی غایت یہی بتلانا تھا کہ ایک انسان کسطرح تناسخ کے چکر سے باہر نکل سکتا ہے۔ ہر ہندی فلسفہ اس بارہ میں اپنا ایک جداگانہ طریقہ رکھتا تھا لیکن انمیں سے ویدانت کا طریقہ سب سے زیادہ معروف و مشہور ہے جسکی ہندو جماعت بکثرت مقلد ہے۔ ویدانت خود اندرونی اجزا میں تقسیم ہوگئی تھی لیکن جو طرق تربیت دنیا میں بہت مشہور ہوا وہ بدرائن اور شنکر کے ناموں سے منسوب ہے۔ بدرائن نے اپنے فلسفہ کو خلاصہ کے طور پر سُوتروں کی شکل میں بیان کیا تھا جن پر متعدد تفسیریں اور شرحیں لکھی گئیں۔ لیکن مشہور ترین تفسیر وہ ہے جو سنہ عیسوی کی ابتدا میں شنکر آچاریہ نے لکھی تھی۔ یہ اپنے عہد کے بہت بڑے فاضل تھے اور مختلف حیثیتوں سے خود ایک خلّاق طبیعت کے حکیم و فلسفی تھے۔ لیکن انکسار کا یہ عالم تھا کہ کبھی بھی اپنے آپکو ایک شارح سے زیادہ نہ سمجھا۔ شنکر کا فلسفہ ایک گہرے رنگ کا فلسفۂ وحدت الوجود تھا۔ چنانچہ آج بھی وہ لوگ جو فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اسکی منطقی دلائل اور سحت کے مقر ہیں

میں اسی فلسفۂ وحدت الوجود کے بارہ میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہندوستان کی اس مہتم بالشان حکمت و دانائی کا کچھ اندازہ کیا جاسکے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کافی وضاحت کیساتھ اس حصہ مضمون کو بیان نکرسکوں گا۔ اول تو خود موضوع بحث ہی دقیق ہے اس پر ایک مزید دشواری یہ ہے کہ میں نے

فلسفہ باقاعدہ مدرسوں میں نہیں پڑھا ہے بلکہ اپنی کاروباری زندگی کے ساتھ ساتھ کچھ معلومات حاصل کرلی ہیں۔

شاہد و مشہود

ہماری کوشش، ہر عمل یعنی ہمارے تمامی شعور میں دو جزو ایسے معلوم ہوتے ہیں جو باہم ایک دوسرے کے ضد ہیں یعنی ہمارا شعور دو متضاد امور کا مظہر ہے جنکو تم خواہ عامل و معمول کہو یا زیادہ واضح لفظوں میں شاہد و مشہود۔ شاہد و مشہود کے علاقہ باہمی نے ابتدا ہی سے حکیموں اور فلسفیوں کو متحیر کر رکھا ہے۔ اس تعلق کو سمجھانے کیلئے متعدد نظریہ پیش کئے گئے تھے لیکن شنکر نے ان سب کو رد کر کے ایک جدید نظریہ پیش کیا۔ شنکر آچاریہ کا دعوے یہ تھا کہ شاہد و مشہود اپنی اپنی جگہ دونوں حق اور واقعہ ہیں۔ یہ دونوں اسطرح مربوط ہیں کہ انھیں تفریق کرنا یا ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ایک سخت غلطی ہے۔ شنکر کہتے تھے کہ وہ حالت جسے شعور ذہنی کہا جاتا ہے اور وہ صورت جسکو اس عالم شہود کی مادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے دونوں در اصل ایک ہی تجربۂ انسانی کے دو مختلف رخ ہیں۔ شنکر کے نزدیک وہ عمیق حقیقت جو اپنے آپ کو کیفیات شعور میں ظاہر کر رہی ہے یعنی کبھی بطور شاہد اور کبھی بطور مشہود رُونما ہوتی ہے اس ساری کائنات کی ایک بنیادی حقیقت ہے

تمام چیزوں کی تہہ

اگر شاہد و مشہود کو اس بنیادی حقیقت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پھر انمیں باہم کوئی فرق نہیں یہ دونوں ایک ہیں یعنی اس بڑی حقیقت کے نقطۂ نظر سے ہمارے سارے خیالات۔ یہ عالم مادی، ہمارا نفس، اور وہ چیزیں جو ہمارے احاطۂ شعور میں آتی ہیں سب کی سب "شہودی" یا "مظہری" ہیں یعنی ہمارا نفس و مادہ یا روح و مادہ اسکے سوا کچھ نہیں ہیں کہ وہ ایسی اصل حقیقت کے پرتو یا سائے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جسکو ہندی لٹریچر میں برہم (ब्रह्म) کہا گیا ہے یہ محض ایک تسمیہ ہے۔ لیکن اس برہم کی اصلیت سے ہم واقف نہیں ہیں۔ ہمارے نفس محدود ہیں اور یہ لامحدود۔ ہمارا نفس اور یہ مادہ جسکا ہم شعور کرتے ہیں مقید ہیں لیکن برہم غیر مقید ہے۔ یہ مکان و زمان۔ اور یہ علت و معلول جنکے بالواسطہ ہمارا نفس اپنا عمل کرتا ہے انمیں سے کوئی بھی برہم کو نہیں پا سکتے۔ وہ الفاظ جو ہم استعمال کرتے ہیں وہ تصورات جو ہم قائم کرتے ہیں اور وہ صورتیں اور شکلیں جو بڑے نازک سے نازک خیالات کو نمایاں اور متمثل کر دیتی ہیں اس برہم کی تصویر کشی سے عاجز ہیں۔ وہ لفظوں سے

ماوراء اور ناقابل بیان ایک ایسی ہستی ہے جس کا ہم کوئی بعید ترین تخیل و گمان بھی نہیں کر سکتے یعنی وہ بالکل عالم مابعد الطبیعات سے تعلق ہے۔ اس کے متعلق ہم زیادہ سے زیادہ جو کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ وہ "موجود" ہے (ایک فارسی شاعر نے اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے ؎ دور بینانِ بارگاہِ الست۔ جز ازیں پے نہ بُرد اند کہ ہست) ...... اس کی ذات کا جو کچھ بھی بیان ہو سکتا ہے وہ منفیات پر مبنی ہوگا۔ کیونکہ جب ہم کوئی مثبت صفت اُسکی طرف منسوب کرتے ہیں تو وہ صفت کسی طرح بھی اس کی ذات کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی۔

ایک تنہا حقیقت

اس دنیا میں اس برہم کے سوا کوئی دوسری حقیقت نہیں ہے۔ ہاں ہم بیشمار ارواح کو جانتے ہیں ہم مادہ کو اسکی لاتعداد شکلوں میں دیکھتے ہیں لیکن یہ سب برہم کے سوا اور کچھ نہیں ہیں اس جگہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر برہم غیر فانی، غیر متغیر، ازلی و ابدی ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ تو پھر ان بیشمار مظاہر عالم کا سبب کیا ہے؟ اور انکے ظہور کی وجہ کیا ہے؟ "واقعہ یہ ہے کہ کوئی اس راز سے واقف نہیں اور نہ کوئی جان سکتا ہے"۔ لیکن انسانی دماغ عجیب چیز ہے وہ اس جواب سے کب تسکین پا سکتا ہے اسلئے فلسفیوں نے کہا "ہم بے خبر ہیں یہ مایا (माया) ہے" یعنی یہ ایک دھوکا یا ایسی نقاب یا کوئی ایسی آڑ ہے جس نے سچائی کو ہم سے چھپا دیا ہے ہم اسی باعث سچائی کو اس کی اصلی شکل وصورت میں نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن ہاں ہم اپنی محدود عقل کی بدولت بالواسطہ اُسکا ادراک کر سکتے ہیں۔

رفتہ رفتہ یہی مایا مستقل طور پر ایک دھوکا دینے والی دیوی سمجھی جانے لگی۔ کیونکہ قدیم زمانہ کی متفقہ شہادت یہی بتلاتی ہے کہ عورت ہمیشہ فریب دہندہ سمجھی جاتی تھی۔ مایا چونکہ اصل حقیقت اور اس عالم ظاہر و مشہود دونوں میں شامل ہے (اور اسی سے اُسکی اصلیت بھی ناقابل بیان ہے) اسلئے کبھی اسکو دھوکا کہا گیا اور کبھی حق کہکر پکارا گیا۔ لیکن اکثر لوگ اسکو "موجود و ناموجود" کہکر پکارتے ہیں۔ یہ مایا اگر ایک طرف برہم کو ہم سے چھپائے ہوئے ہے تو ساتھ ہی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اسی کے بالواسطہ ہم برہم کے پرتو اور سایہ سے کسیقدر آگاہ ہوجاتے ہیں۔ یہ مشہود و غیر مشہود دونوں میں شامل ہے۔ الغرض یہی وہ ناقابل بیان مایا ہے جسنے غیر محدود برہم کو ہمارے نظائر چشم سے چھپا دیا ہے۔

رنج و غم سے نجات کا طریقہ

اگر اس عالم مادی کا یعنی اس عالم شہود کا باعث مایا ہے تو پھر ان بیشمار منفرد نفوس یا ارواح کا

سبب کیا ہے؟ ان منفرد ارواح کی حقیقت اسی متذکرہ بالا نقطۂ نظر سے اسکے سوا کچھ نہیں ہو سکتی کہ مایا نے کسی نہ کسی طرح ناقابل تقسیم برہم کو بیشمار نفوس (یا ارواح) میں ظاہر کر رکھا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر موت و پیدائش کے اس ازلی چکر کی کوئی ابتدا نہیں ہے تو کیا اسکی کوئی انتہا بھی ہے یا نہیں؟ کیا انسان اس قید و بند سے آزاد ہو کر اپنے اصل مبدا، یعنی برہم میں غم ہو سکتا ہے تاکہ اس تکلیف و کرب سے نجات پالے جو اس دنیاوی زندگی کا ناگزیر لازمہ ہے؟ شنکر نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا ہے لیکن بعض ناقدین "ویدانت" کو یاس انگیز بتلاتے ہیں گو تقریباً تمام مشرقی فلسفے شروع اس تکلیف و کرب ہی کے تخیل سے ہوتے ہیں لیکن انکی انتہا اس تعلیم پر ہوتی ہے جس کے باعث ایک انسان اس کرب سے نجات پا سکتا ہے۔ ان حالات میں ویدانت کو یاس انگیز کہنا درست نہیں بہرحال موت و پیدایش کے اس چکر سے نکل جانے ہی کا نام موکش (نجات کامل) ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ موکش کسطرح حاصل ہو سکتی ہے۔ شنکر آچاریہ نے بتلایا ہے کہ مایا کے اثر سے ہماری انفرادی ارواح اپنی اصل سے غافل ہو گئی ہیں۔ اگر ہم کو اپنی اصل کا حال معلوم ہو جائے اور یہ مایا دور ہو جائے (کیونکہ اس عالم کی اصلیت کی ناواقفیت ہی کا دوسرا نام مایا ہے) تو ہم اس سنسار کے چکر سے بھی نکل جائیں گے شنکر کے فلسفہ میں علم حقیقی اور نجات کامل مترادف اصطلاحیں ہیں۔ لیکن یہ علم بغیر فضل ایزدی کے حاصل نہیں ہوتا اس کا شمار ہمارے علوم رسمی میں نہیں ہے اور نہ اس کا تعلق اس عالم شہود سے ہے یہ تو کچھ اُدھر ہی سے حاصل ہوتا ہے اگر یقین انسان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے کہ وہ خود برہم ہے تب ہم کہیں گے کہ اسکو علم حقیقی حاصل ہو گیا۔

تقسیم علوم

ویدانت جملہ رسمی علوم یعنی مابعد الطبیعیات، نفسیات، مذہب وغیرہ سے بالاتر ہے۔ یہ علوم ادنیٰ درجے کے علوم ہیں اہل ہند علوم اعلیٰ یعنی علوم الٰہیہ میں اور علوم ادنےٰ یعنی ان علوم میں جو اس عالم شہود سے متعلق ہیں فرق کرتے تھے۔ ویدانت کا پورا نظام اسی علم اعلیٰ و واقعی کے حاصل کرنے پر مبنی تھا مگر اس عرفان صحیح کے حاصل کرنے کیلئے کہ وہ خود ہی برہم ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں موکش حاصل کرنیکے لئے عبادات و اعمال صالحہ کی ضرورت ہے لیکن جن لوگوں پر خدا کا فضل اس حد تک نہیں ہوا کہ اُن کو عرفان کامل حاصل ہو جائے ان کو اسکی اجازت تھی کہ وہ برہم کی اسکی محدود و مقید شکل میں پرستش کریں۔ برہم کی عبادت دو ہی طرح ہو سکتی ہے۔ یعنی یا تو اسکو ایسا غیر ممیز، غیر مقید اور غیر محدود

یاد کیا جائے جو احاطۂ بیان سے باہر ہے یا پھر اسکی پرستش اس طرح کیجائے کہ وہ ایک صاحب شخصیت خدا ہے۔ لیکن شنکر یہ کہتے تھے کہ جو لوگ آخری صورت میں خدا کی پرستش کرکے نجات حاصل کرتے ہیں انکی نجات ایک گونہ ادنیٰ نوعیت کی ہے۔ نجات کی ایک راہ اس سے بھی بلند تر ہے جو صرف ان لوگوں کے لئے کھلی ہوئی ہے جو عبادت و اعمال صالحہ کیساتھ اس متصوفانہ علم کو حاصل کرتے ہیں۔

برہم کا ادراک

یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ دنیا سوائے برہم کے کچھ نہیں ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ہر منفرد نفس یا روح بھی برہم ہے لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ برہم دنیا ہے یا برہم منفرد روح یا نفس ہے جو منطق سے واقف ہیں انکے لئے یہ بات بالکل صاف ہے۔ ساری دقت یہ ہے کہ برہم کے بیان میں ہم منطق یا نفسیات کی معمولی زبان سے کام نہیں لے سکتے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ شنکر اچاریہ کا فلسفۂ صرف اسیقدر ہے کہ ایک ناقابل فہم وجود کی خشک عبادت کرلی جائے یا یہ کہ فلسفۂ مذکور اخلاقیات سے معرّا ہے۔ نہیں بلکہ اسکے بھی خلاف شنکر اچاریہ یہ کہتے ہیں کہ برہم کا ادراک صرف اسی کو ہوسکتا ہے جو پاک باطن و نیک نفس ہو جو برائیوں سے مجتنب رہے یعنی صرف ایسا شخص اس ادراک کو پاسکتا ہے جسکی ساری زندگی خدا کی نظروں میں اور اسکے خوف میں بسر ہوئی ہو اور جس نے اپنے رجحانات رذیلہ پر فتح پائی ہو۔

پھول

(ورڈسورتھ کی انگریزی نظم کا ترجمہ)

شام کا وقت تھا آفتاب بلند اور فلک بوس پہاڑوں سے گذر کر آہستہ آہستہ وادی مغرب میں آشیاں نشین ہو رہا تھا۔ اسکی سنہری کرنیں میدانوں۔ مرغزاروں۔ ندی۔ نالوں پر پڑ رہی تھیں۔ ہوا تیز چل رہی تھی میں سحاب کیطرح بے ارادہ قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ پھول قطار در قطار صف بصف، ہزاروں لاکھوں جھیل کے کنارے مسکرا رہے تھے اور اپنے حسن کی رعنائیوں پر ہنس رہے تھے۔ اور بلبلوں اور غمزدہ دلوں کو لبھا رہے تھے۔

جسطرح آسماں پر روشن تارے کسی حرماں نصیب معشوق کی تلاش میں ٹکٹکی لگائے زمین کو دیکھ رہے ہوں۔ اسیطرح پھول جو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں تھے جھیل کے کنارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کسی کی تلاش میں سرگرداں اور محو تھے۔ سمندر کی موجیں دیوانہ وار چٹان سے ٹکرا رہی تھیں اور انکا شور بجلی کی کڑک کی طرح گونج رہا تھا روتے روتے آنسوؤں کے ڈھیر چٹان پر جمع ہوگئے تھے جسطرح کہ میرے آنسو میرے رخساروں پر اسوقت یہ پُر کیف منظر شاعر ہی کے تخیل میں آسکتا تھا۔ اور وہی دیکھ دیکھ کر مسرور ہو سکتا تھا۔ آفتاب ساری دنیا کو منور کرنیکے بعد روانہ ہوچکا تھا اپنی سنہری آنچل سے روشنی پھیلا کر کھو چکا تھا۔۔۔۔ سناٹا تھا میں اپنی آرام گاہ میں پہونچا تنہائی کا عالم تھا۔ پھر کیا تھا سارے خیالات ذہن نشیں ہوتے گئے میری نظروں میں وہی منظر گھوم رہا تھا۔ میرا دل ان پھولوں کو دیکھ دیکھکر خوش ہو رہا تھا گویا میں بھی انہیں کے دوش بدوش جھوم رہا تھا بدمستیوں کے ترانے گا رہا تھا۔

حسرت

(از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا)

مرزا جعفر علی نام حسرت تخلص باشندۂ دہلی، عطاری کا پیشہ کرتے تھے آپ کے والد مرزا ابوالخیر دہلوی تھے۔ آپ کی دوکان لکھنؤ میں اکبری دروازے کے قریب واقع تھی۔ جب اپنا وطن ترک کرکے آپ لکھنؤ چلے گئے تو کچھ دنوں عطاری کی اور پھر بسلسلۂ شعر و شاعری مرزا جہاندار شاہ کی رفاقت میں بسر کرنے لگے۔ لیکن آخر عمر میں اس کو بھی خیرباد کہکر گوشہ نشین ہوگئے۔ اور اسی عزلت گزینی میں ۱۲۰۰ھ میں انتقال کیا۔

آپ رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ رائے صاحب ہندی نژاد ہونے کے باوجود اپنی خداداد مناسبت طبع کی بنا پر فارسی زبان کا ایسا عمدہ مذاق رکھتے تھے کہ اُن کے عہد کے شعرائے لکھنؤ میں سے اکثر انھیں سے فیضیاب سخن ہوئے۔ رائے صاحب نے چار دیوان فارسی یادگار چھوڑے جو اب نایاب ہیں۔ کبھی کبھی اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے چنانچہ ایک مطلع اس وقت تک مشہور ہے ؎

دل سدا تڑپے ہے میرا مرغ بسمل کی طرح ۔۔۔ یا کہ سیکھی مرغ بسمل نے مرے دل کی طرح

یہ نہایت دلچسپ بات ہے کہ حسرت کے سلسلہ کی ابتدا مغرب (دہلی) سے اور انتہا مشرق (بنگال و بہار) میں ہوئی۔ آپ کے مشہور شاگرد جرأت تھے۔ لیکن جرأت کے علاوہ اور بھی ممتاز شعرا آپ کے سلسلہ میں صاحب دیوان ہو گزرے ہیں، چنانچہ عبدالغفور خاں نسّاخ بھی اسی سلسلہ میں ہیں۔

کلام پر تبصرہ | ہمارے پیش نظر حسرت کا وہ مختصر مجموعۂ کلام ہے جو حسرت موہانی نے شائع کیا ہے۔ آخر الذکر نے لکھا ہے کہ مصنفات حسرت میں اُردو کلیات کے سوا اور کوئی کتاب یا تذکرہ مشہور نہیں ہے لیکن اس کلیات میں جملہ اصناف سخن کے قابل دید نمونے موجود ہیں۔ مثلاً (۱) ساقی نامہ، (۲) مثنوی در ہجو طبیب (۳) واسوخت۔ (۴) ترجیع بند، (۵) ترکیب بند، (۶) مسدس در احوال شاہجہان آباد و در منقبت، (۷) مخمسات بر غزلہائے خسرو، حزیں، حافظ، ہلالی، جامی، (۸) قصائد در حمد و در منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت علی موسیٰ رضا و حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہما۔

نیز در مدح نواب محبت خاں، نواب آصف الدولہ و نواب شجاع الدولہ وغیرہم۔ (۹) رباعیات جن کی تعداد چار سو سے متجاوز ہے۔ (۱۰) غزلوں کے دو دیوان، جن میں سے دیوان دوم بالکل پھیکا اور بے لطف ہے۔

بہرحال اس مختصر مجموعہ میں صرف ساڑھے تین سو اشعار غزلیات کے ہونگے جن کو حسرت موہانی نے اپنے انتخاب میں داخل کیا ہے۔ آپ کی رائے میں حسرت کا کلام جابجا فارسی محاوروں کے خوشگوار ترجموں سے مزین نظر آتا ہے، مثلاً :-

ہمارے کام پہ ہر چند آسمان پھرے ۔۔۔ تجھے قسم ہے جو تو اس طرف کو آن پھرے

"دو آسمان بکام ما گردد" کے ترجمے سے اس ردیف قافیئے میں ایسا بلند مطلع نکالا ہے کہ جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

جوں لالہ بہار کر رہا ہے ۔۔۔ یہ سینۂ داغدار اپنا

یہاں بہار کر رہا ہے "بہار کردن" سے لیا گیا ہے۔

حسرت موہانی آپ کے کلام کو اکثر شعرائے متقدمین کی طرح تصنع اور ناگوار رعایاتِ لفظی سے پاک اور درد و سادگیِ خیال کی بنا پر فی الجملہ میر کے کلام سے مشابہ سمجھتے ہیں، اگرچہ ترکیبوں کی توانائی اور الفاظ کی برجستگی کے لحاظ سے میر تقی کا درجہ بہت بلند لکھتے ہیں۔

آپ کے نزدیک حسرت کا خاص انداز یہ ہے کہ غزل کو اکثر قطعے پر ختم کرتے ہیں اور مضمون مسلسل سے اس قدر گرویدہ معلوم ہوتے ہیں کہ بعض غزلوں میں مطلع سے مقطع تک ایک ہی مضمون ہوتا ہے اور یہ خصوصیت آں سے گزر کر جرأت اور شاگردانِ جرأت میں بھی پائی جاتی ہے جو بلا شبہ قابل تقلید ہے۔ مثال کے لئے ایک قطعہ پیش کیا جاتا ہے :-

قفس تک پاس حسرت کے گئے سب ہمنوا ملکر ۔۔۔ کہا کیوں آج چپکی لگ گئی تجھ سے غزلخواں کو

سُن اے ناداں چمن میں آج غنچے گل کے کھلتے ہیں ۔۔۔ گلستاں کر دیا بادِ بہاراں نے بیاباں کو

اگر صیاد ظالم ہے، تو ہم سے یاں ترے بدلے ۔۔۔ کوئی لیوے اسیر اور ہے چلیں ہم تجھکو بستاں کو

یکایک وہ اسیرِ غم تڑپ کر خاک اور خوں میں ۔۔۔ لگا کہنے لہو سے بھر کے اپنی چشمِ گریاں کو

بسایا ہم نے تو اے ہمصفیرو کنجِ زنداں کو
آپ آتش دو چمن کو آہ اور پھونکو گلستاں کو

نواب شیفتہ گلشنِ بیخار میں تحریر فرماتے ہیں :-

"در فنِ نظم از تلامذۂ سرب سنگھ دیوانہ است و بہ سلامتِ عبارت و سلامتِ فکر مشہور زمانہ قلندر بخش جرأت از شاگردانِ اوست اما از استاد قصب السبق ربودہ۔"

یہ عجیب بات ہے کہ حسرت موہانی نے جو انتخاب کلیات حسرت شائع کیا ہے اُس میں وہ تمام غزلیں نیز وہ اشعار چھوڑ دیئے ہیں جو شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں تحریر فرمائے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ عمدہ اور قابل انتخاب ہیں بلکہ حسرت کے انتخاب سے بہتر ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم کو حسرت کا کلیات جو نایاب ہے دستیاب نہیں ہوا اور ہم آپ کے کلیات کو دیکھکر جو رائے قائم کرتے اُس سے معذور رہے۔ جو کچھ اس مختصر مجموعۂ کلام کو دیکھکر ہماری رائے قائم ہوئی ہے ہم وہ آیندہ پیش کریں گے۔ فی الحال شیفتہ کے منتخبہ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

گیا دل سو گیا رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اگر رو رو کے جی کھوویں تو پیدا دل نہیں ہوتا
آشیاں چھوڑ چلے اے چمن آرا ہم تو تو ہی لے جائیو سر پر یہ گلستاں اُٹھا
درس تھا مکتب میں مجھکو آہ کا یہ سبق تھا پہلی بسم اللہ کا
ہے غبار آلودہ یہاں تک اشک اس غمناک کا دستِ مژگاں میں سدا رہتا ہے سبحہ خاک کا
کل کون سے تھے خوش کہ نہیں ہو تم آج خوش ہم نے تو ایک دن بھی نہ پایا مزاج خوش
حسرت ہزار رنگ سے بولائیں جھوٹ سچ یعنی کہ نوبت آوے سخن کی قسم تلک
لیکن سمجھ کے بات کو اُس نے اُڑا دیا ق پہنچاتے ورنہ ہاتھ ہم اس کے قدم تلک
ساقی مے دے کہ اہل مجلس پانی پانی پکارتے ہیں۔
کسے منظور تھا یوں تلخ کیجئے زندگانی کو ولے کیا کیجئے حسرت بلائے ناگہانی کو
نازک دلوں کے زخم کو مرہم کبھو نہو پیراہنِ حیات پھٹے تو رفو نہ ہو
کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے لو دل تمھیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے
بزم میں بیٹھے تھے کل جتنے پری رو ہر سے دیکھکر اس کو لگے لینے بلائیں دور سے
فسانہ وصل کا جس سے دلِ بیتاب کہتا ہو وہ کہتا ہے کہ افسانہ نہیں یہ خواب کہتا ہو
یہ بھی اک ستم تھی کہ خواب میں مجھے شکل آکے دکھا گئے
کبھی نیند برسوں میں آئی تھی سو اسی طرح سے جگا گئے

ایک شعر شیفتہ نے اور انتخاب کیا ہے لیکن وہ حسرت کے انتخاب میں بھی ہے بلکہ حسرت کے یہاں غزل کے منتخبہ اشعار بھی موجود ہیں:-

مجھکو تجھ سے خدا جُدا نہ کرے　　میں ہوں تجھ سے جُدا خدا نہ کرے

ہمارے نزدیک مرزا جعفر علی حسرت کا کلام بے شبہ صاف اور سلیس ہے، تشبیہات و استعارات کم ہیں، سادگی بہت ہے، اور درد سے بھی خالی نہیں لیکن بلند مرتبہ نہیں، معمولی خیالات کا اظہار جا بجا کیا ہے البتہ آپ کا کلام دلچسپی اور دلفریبی کی شان لئے ہوئے ہے۔ چونکہ آپ نے جمیع اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اس لئے آپ کی قادر الکلامی کو مسلّم ماننا چاہیئے۔ لیکن آپ کو اول درجہ کے شعراء میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کلام میں وہ عذوبیت اور عمق نہیں ہے جس کے نظارے شعرائے بالغ نظر کے یہاں دیکھنے میں آتے ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعراء میں بھی بہت سے ایسے ہیں جن کا کلام حسرت سے بہتر ہے اور یہی نہیں کہ حسرت کے مابعد جو شعرائے درجہ دوم گزرے ہیں اُنھی کا کلام بہتر ہے بلکہ جو حسرت سے پہلے گزر گئے ہیں وہ بھی آپ سے گوئے سبقت لے گئے ہیں، مثلاً انعام اللہ خاں یقین آپ کے یہاں بعض فارسی تراکیب قابل داد ہیں۔

خود کام، تیز پری، مرغ شکستہ بال، داغ بالائے داغ، تغافل شعار، خراش ناخن غم، منع بیتابی۔

شعر۔ ضبط کرکے ہم قلق کو دل میں گھبرائے بہت　　منع بیتابی کیا پر اُس میں دکھ پائے بہت

خار خار، شعر۔

جلد آخر ہو گئی فصل بہار اب کے برس　　رہ گئے بلبل کے دل میں خار خار اب کے برس

دغدغۂ آب و آتش، شعر:۔

حسرت غذائے خون جگر کی میں خو کروں　　چھوٹے تلاش و دغدغۂ آب و آتش کاش

اگر ہمیں پورا کلام دیکھنے کا موقع ملتا تو شاید رکیک اشعار کی تعداد زیادہ مل جاتی تاہم حسرت موہانی کے انتخاب میں یہ رکیک شعر بھی داخل ہے:۔

روٹھے ہوئے جاتے ہو اب ہم سے جو تم لڑکے　　ہم بھی دملیں گے پھر سنتے ہو میاں لڑکے

متروکات آپ کے یہاں بھی ہیں اور ہونے بھی چاہیئے تھے، مثلاً:۔

مَیں بجائے مَیں نے ع

جو کہا آپ نے میں آپ کا فرسودہ کیا

تلک بجائے تک۔ ٹک بجائے ذرا۔ تم لینے نہیں دیتا بجائے تمھنے نہیں دیتا۔ خنجر کے تئیں بجائے خنجر کو۔ ہوا بجائے ہوا۔ تجھ کنے بجائے تیرے پاس۔ تجھ بن بجائے تیرے بغیر۔ خماری بجائے مخمور۔ ایکباری بجائے یکبارگی یا دفعۃً میاں خطاب بہ محبوب بالکل متروک ہے۔ پونچنے بجائے پہنچنے ۵

گر دام سے ہم چھوٹے، کیا فائدہ، گلشن تک　　تب پونچے جب نکلیں پھر بال و پر تازہ

پیارے خطاب بہ محبوب بالکل متروک ہے۔ ایدھر بجائے ادھر۔ اودھر بجائے اُدھر۔ مت ہو بجائے نہ ہو۔ جوں بجائے مانند۔ زنجیر کرنا بجائے مقید کرنا۔ کیجے بجائے کیجئے۔ تلک بجائے تک۔ ترے بن بجائے تیرے بغیر۔ سوگند بجائے قسم۔ دوانہ بجائے دیوانہ۔ دل چھٹ بجائے سوائے دل۔ چنگا بجائے اچھا۔ کہہ بیٹھے ہے بجائے کہہ بیٹھتا ہے۔ دے جاتے ہے بجائے دے بیٹھتا ہے۔ لیک بجائے لیکن۔ بدلیاں بجائے گھٹا یا بادل سے

بدلیاں آئیں بہت اور مینہ بھی برسے خوب خوب　　ساقیا ٹوٹا نہ پر اپنا خمار اب کے برس

آپ نے بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث کی طرف توجہ نہیں فرمائی، مثلاً رسم مؤنث ہے اُس کو مذکر باندھ دیا ہے۔ شعر

کسی کا حال کوئی پوچھتا نہیں ہرگز　　وفا کا رسم اُٹھا حسرت اس زمانے سے

ستم مذکر ہے اُس کو مؤنث باندھ گئے ہیں، مثلاً

یہ بھی اک ستم تھی کہ خواب میں مجھے شکل آ کے دکھا گئے
کبھی نیند برسوں میں آئی تھی سو اسی طرح سے جگا گئے

آپ کے یہاں بعض غزلیں مسلسل ہیں، مثلاً ایک غزل جس کا مطلع ہے

آنکھوں میں دم تھا سو بھی چلا بیوفا پہنچ　　آنا اگر ہے تجھکو تو جلدی سے آ پہونچ

یہ طریقہ بہت اچھا تھا نہیں معلوم متاخرین شعرا نے کیوں اس کو ترک کر دیا؟

ذیل میں وہ اشعار درج کئے جاتے ہیں جو حسرت موہانی کے انتخاب کلیات حسرت سے ہم نے انتخاب کئے ہیں:-

کیوں مرے خون سے شمشیر کو آلودہ کیا　　آپ نے رنج اُٹھایا مجھے آسودہ کیا
کیوں مچایا ہے دلِ بیتاب نے غل کیا ہوا　　صبر کیا آفت پڑی تجھ پر تحمل کیا ہوا
دل پہ نہیں اختیار اپنا　　افسوس گیا قرار اپنا
کیوں نہیں تھمتے ہیں آنسو چشم تر کو کیا ہوا　　ہو گیا دریائے خوں میرے جگر کو کیا ہوا
ایک سے ایک اس زمانے میں ہو اُس سے خوبتر　　کوئی خوش آتا نہیں میری نظر کو کیا ہوا
مجھے ٹک سانس بھی یہ دردِ غم لینے نہیں دیتا　　عجب کچھ درد ہے دل میں کہ دم لینے نہیں دیتا
اے دل اگر تڑپنا تیرا یہی رہے گا　　کاہے کو تو جیئے گا کا ہیکو جی رہے گا

کوئی اپنا نہ آشنا دیکھا — جس کو دیکھا سو بے وفا دیکھا
بھولتا ہی نہیں وہ دل سے اُسے — ہم نے سو سو طرح بُھلا دیکھا

تو نے جو منہ سے کہا میں نے سنا اور سنا — پر مرا بخشیوائے یار کہا اور سنا
منع جب کرتے تھے ہم تب تو نہ مانا اے دل — اب پشیمان ہے کیوں، غم اُسے جا اور سنا

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اُسکا نام آیا تھا — تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا۔
بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے آنا کہ گلشن میں — گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا
نہیں معلوم کیا تھا جو سحر تک شمع رویا کی — کچھ اپنا حال پروانہ سنانے شام آیا تھا

مطلب نہیں ہے شکوہ ان بے مروتوں کا — حسرت مجھے ہے رونا اس دل کی حسرتوں کا

اپنے لب تو وا نکرا اے خندۂ زخم جگر — چرخ دے گا لاکھ غم اس شادمانی کے سبب

وہ خواہ قتل کرے خواہ میری جاں بخشے — کہ مرگ و زیست پہ مختار ہے رضائے حبیب
بہشت کی مجھے ترغیب تو نہ دے واعظ — کسی کی مجھ کو تمنا نہیں سوائے حبیب

پھرے جا کے اس گلی میں یہ نہ تھی صبا کی قدرت — سو وہاں رقیب سکن کرے اب خدا کی قدرت

مجھکو روتے ہی گزری ساری رات — ہجر کی بھی بلا ہے بھاری رات
بے خبر یار مری لینے خبر آیا ہے — دین و دنیا کی نہیں مجکو خبر آجکی رات
کل کو کیا جانئے صحبت یہ رہے یا نہ رہے — ساقیا جام جو بھرنا ہے تو بھر آجکی رات

کچھ حرفِ دوستی ہو تو ہو جنگ و صلح بھی — تجھ سے امیدِ جنگ نہیں، در کنار صلح

روزِ ازل سے حسن کی جلوہ گری ہے تاہنوز — ہم بھی تجھی سے محو ہیں، بیخبری ہے تاہنوز

بوئے یوسف مگر آئی نہیں کنعاں میں ہنوز — کہ صبا ڈھونڈھ رہی ہے اس بو کو گلستاں میں ہنوز
قتل کا تو نے جو حسرت کے کیا ہے ساماں — کچھ رہا ہے مگر اس بے سروساماں میں ہنوز

باندھ رشتے سے مجھے پھینک دے صیاد قفس — میری فریاد سے کرنے لگا فریاد قفس

طوفان کر رہی ہے چمن میں بہار جوش — آئے ہیں میرے دل میں بھی ساقی ہزار جوش
مانند گل کردل میں گریبان چاک چاک — آتا ہے میرے دل میں یہی بار بار جوش

دیکھتے ہی شمع کو جاتا ہے پروانے کا ہوش — آہ پر رہتا ہے کیونکر اُس کو جلجانے کا ہوش

دونوں عالم کا ہے عرصہ تنگ وحشت پہ مری — میں قدم صحرا میں رکھوں کیا بیاباں کی بساط
گر ہے یہی بہار کی شورش تو ناصحا — مجھ سے نہ ہو سکے گی گریباں کی احتیاط

وہ جس کو معصیت سے بچائے وہی بچے — حسرت نہ کام آئے کچھ انساں کی احتیاط
ہم کو نہ مرگ نے نہ قضا نے کیا ہلاک — اس کے ستم اور اپنی وفا نے کیا ہلاک

تری فرقت میں ہر شام و سحر مجھ کو عجب مشکل — جو شب کاٹی تو دن مشکل جو دن کاٹا تو شب مشکل
کرم سے کھول جو عقدے پڑے ہیں کام میں میرے — ترے آگے ہیں سب آساں مرے نزدیک سب مشکل

ظلم کر اور نہ رکھ عاشق بدنام سے کام — اپنے تو کام میں رہ کیا ہے مرے کام سے کام

آخر ترے غم میں مر گئے ہم — بھرنا تھا جو دکھ سو بھر گئے ہم
عقبیٰ کی بھی کچھ خبر نہیں ہے — دنیا سے تو بے خبر گئے ہم
شبنم کی مثال اس چمن میں — شب آئے تھے ہم سحر گئے ہم

بھلائیں یار نے دل سے ہماری اور بھی یادیں — عجب تاثیر رکھتی ہیں الٰہی دل کی فریادیں

فرہاد و قیس کی نہ کہو جاں فشانیاں — ایسی سنا کیا ہوں میں کتنی کہانیاں

جو بیتابیٔ دل عشاق کی باطل سمجھتے تھے — مرے سینے پہ آ کر ان دنوں وہ ہاتھ دھر دیکھیں

ہوئے ہم بت کے بندے برہمن سے راہ کرتے ہیں — حرم کے رہنے والو تم سے عشق اللہ کرتے ہیں
نہ دیکھ اے شیخ تو ان کی طرف چشم حقارت سے — گدایان خرابات اک نظر میں شاہ کرتے ہیں
قفس میں ہم نہیں کچھ بولتے صیاد کے ڈر سے — چمن کے مرغ نالے اپنے خاطر خواہ کرتے ہیں

دوستوں کا دیکھنا اس دور میں ہر دم کہاں — دم غنیمت ہے عزیزو تم کہاں اور ہم کہاں

نظر آئے گی تری عشوہ نمائی ہم کو — جینے دیوے گا اگر درد جدائی ہم کو
موت آ جائے کہیں اس دل شیدائی کو — روز سمجھائے کہاں تک کوئی سودائی کو
ایسی کیا تجھ پہ بلا ٹوٹی کہ تو نے اے دل — یک بیک چھوڑ دیا صبر و شکیبائی کو

اگر دیکھے ترے وحشت زدہ کے جیب و داماں کو — تو مجنوں گور سے اٹھ کر کرے ٹکڑے گریباں کو

اس قدر سرگشتہ پھرتا ہے جو شب تاروں میں ماہ — ہے مگر اے رشک مہ تیرے گرفتاروں میں ماہ

ہر آن ہے مژگاں پہ لخت جگر تازہ — یہ نخل محبت میں دیکھا ثمر تازہ

کون سا مہ پارہ یارب بر کنار آب ہے — عکس جس کا موج پہ بیتابیٔ سیماب ہے

گر سوگ میں جی کے رہے کر دکھے ماتم میں رہے — جب تک کہ ہم جیتے رہے یا درد یا غم میں رہے

جگر سوزاں ہے دل بیتاب ہے اور چشم گریاں ہے — الٰہی دن ہے میری مرگ کا یا شام ہجراں ہے
جو ایسا ہی دل دیوانہ میرے درپے جاں ہے — تو پھر اک روز میرا ہاتھ اور اس کا گریباں ہے

تجھے کیا کہئے دردِ دل لیکن
نہیں رہتی زبان کیا کیجئے

مثالِ نقش قدم یاں سے اُٹھ نہیں سکتے
تری گلی میں نہ جانا بھلا تھا جانے سے

وصل کی کل رات تھی اور یار بھی تھا مہرباں
پر نہ نکلا کام خاطر خواہ دل کے ہاتھ سے

اُڑ گئی بس طاقتِ پرواز
نہیں صیاد اب رہا نہ کرے

سراغ پوچھوں میں کیا اشک و آہ کا دل سے
کہ اس دیار سے ہو کتنے قافلے نکلے

داغ نے قیامت کی اک بات بنائی ہے
کہتے ہیں جسے محشر سو روزِ جدائی ہے

ہے گلشنِ دوراں میں گلِ عشق عجب گل
کھینچے نہ اگر دامنِ جاں خارِ جدائی

حسرت تری باتوں سے نکلتا ہے مزا جی
خاموش ہو مت پڑھ بہت اشعار جدائی

ترے بن کس طرح یارب مری اوقات گذرے گی
ابھی سے دل کو بیتابی ہے کیونکر رات گذرے گی

تمھیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کم خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

نہ تھا منت حسن کے پھونکنے سے باغباں گزرے
ہمارے آشیاں سے برق بھی دامن کشاں گزرے

گزر اس کا ادھر ہو یا اُدھر اپنا گزارا ہو
جو اپنی گردشوں سے ایک دم بھی آسماں گزرے

(دیوان دوم)

رونا نہیں جو یارو اپنا دیار چھوٹا
مرنا ہے یہ کہ ہم سے اب کوئے یار چھوٹا

دل کو تو لے آئے اُس کوچے سے ہو کر ہم خفا
پر دل و جاں ہم پہ اب مل کر بلا لائے بہت

کچھ دل میں جنون تیرے ارمان نہ رہ جاوے
کی جیب تو سو ٹکڑے داماں نہ رہ جاوے

کنارِ مادر

(از رضوان حسین رضوان)

اے بیکسوں اور بے پروں کی پناہ دینے والی، اے مجبوروں اور درماندوں کا اپنے ساتھ نباہ کرنیوالی اے آوارہ وطنوں کی منزل، اے برباد زندگی تکیہ گاہ اے جوروں اور تصور سے بے نیاز بنا دینے والی، اے دافع آفات اے مانع بلیات اے مخزنِ شفقت و محبت، اے منبع راحت و تمکنت اے بیخبر سے باخبر، اے کنارِ مادر۔ آخر تو ناراض کیوں ہے؟ کیا مجھ سے کوئی قصور ہوا یا کوئی بےادبی؟ کہ تو ایسی خفا ہوئی جو آجتک خفا ہے۔ تجھ سے تو یہ امید ہرگز نہ تھی کہ تو یوں کبیدہ خاطر ہو جائیگی اور مجھے اس درماندگی و بیچارگی کی حالت میں چھوڑ دیگی جس سے ابھی ابھی قدرے نجات حاصل ہوئی ہے۔

(خادم التعلیم لاہور)

تہذیب

(از رائے بہادر پنڈت شیو نراین شمیم ایڈووکیٹ، لاہور)

سیولیزیشن (Civilization) جسے اُردو میں تہذیب کہتے ہیں ایسا لفظ ہے جس کی مکمل تعریف مشکل ہے، اس کے مفہوم کے بارہ میں اختلاف رائے ہے۔ بآسول جو ڈاکٹر جانسٹن کا سوانح نویس تھا لکھتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف بھی اس لفظ کی تعریف وضع نہ کر سکے اس لئے اُنھوں نے اپنی ڈکشنری میں یہ لفظ درج نہیں کیا۔ (ٹریبون ۱۲- مئی ۱۹۱۶ء)

بقول "ہر ملکے و ہر رسمے" دنیا کی مختلف قوموں میں تہذیب مختلف رہی اور اب تک مختلف ہے، مگر اب دنیا ایک ایسی شاہراہ پر گامزن ہے کہ آج نہیں تو کل تہذیب میں یکسانیت ہو جائیگی۔ وحشی قومیں مہذّب قوموں کے ساتھ ملنے لگی ہیں، نیم مہذّب اقوام بھی مہذبوں کے ساتھ اختلاط رکھتی ہیں۔ ایشیائی، یوروپین اور امریکن تہذیبیں آپس میں مل رہی ہیں۔ ایک دوسرے کی تقلید شروع ہے۔ بعض قدیم رسمیں متروک ہو رہی ہیں۔

ڈاکٹر جانسٹن کے بعد کی ڈکشنریاں اس لفظ کی تعریف یوں کرتی ہیں "لفظ تہذیب سے مراد ہے ترقی علوم و فنون، ترقی فنِ جہانبانی، اور اختلاط عمرانی"۔ (ویبسٹر ڈکشنری)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مذکور ہے۔ "زمانۂ جاہلیت کے بعد صاحبِ دماغ انسان ظہور میں آیا، جو منظم حکومت کے ماتحت خوش تعمیر مکانات میں بستا، انواع و اقسام کی صنعت اور حرفت کے ذریعہ سیکڑوں قسم کے کاروبار کرتا، ادبی اور مصوّری مشقوں سے جمالیاتی ذوق پورا کرتا ہے"۔

مو سیو ولیمس فرماتے ہیں: "جن لوگوں میں زبان کی شستگی، وسیع ادب، باترتیب سوسائٹی، مستقل طرز حکومت، مذہب اور فلسفہ کے صیغے خواہ راست یا غلط ہوں، اور جنھوں نے قدرے علوم و فنون میں ترقی کی ہو، ایسے لوگوں کو مہذب کہا جائیگا"۔

ان معنی کو زمانہ حاضرہ میں وسعت دی گئی ہے۔ چنانچہ مس وہائٹ فرماتی ہیں کہ "بقول مسٹر گولڈ تہذیب کی رفتار آہستہ آہستہ خدمت انسانی اور یگانگت کی جانب ہے"۔

تہذیب دراصل اخلاقیات ہے، بہ الفاظ دیگر تہذیب انانیت اور شخصیت پر فتح پانا اور بنی نوع انسان کے

ساتھ ہمدردی رکھنے کا نام ہے۔ (ہندوستان ریویو ستمبر ۱۹۱۸ء صفحہ ۱۶۲)

ہمارے نزدیک ہر قوم یکساں مہذب نہیں کہلا سکتی۔ تہذیب کے اقسام مختلف ہیں کسی قوم نے تہذیب کی ایک شاخ میں، دوسری قوم نے کسی اور شاخ میں ترقی کی ہے۔ تہذیب کی جتنی تعریفیں ہماری نظر سے گذریں، اُن میں ذیل کی تعریف ہم کو سب سے اچھی معلوم ہوئی:۔

"ہمیں تہذیب کو ایک ہی نقطۂ نظر سے نہ دیکھنا چاہئیے، اس کی بہت سی راہیں ہیں، ہر ایک راہ بذات خود تہذیب ہے۔ کسی قوم نے آج تک تہذیب کی ہر ایک شق حاصل نہیں کی۔ جن قوموں نے دو شقوں میں ترقی کی اُن کی تعداد بھی کم ہے۔ تمثیل کے طور پر تہذیبوں کے اقسام کو یوں بیان کر سکتے ہیں:۔

(۱) تہذیب اخلاقی جس میں مذہبی عنصر غالب ہے،

(۲) تہذیب اشیائے حسین، نہایت دلکش اور رفیع الشان جو آئندہ نسلوں کو گرویدہ اور شیدا کرتی ہے۔

(۳) علمی تہذیب یعنی سائنس۔ نیچر کے مناظر و مظاہر اور قوانین پر فتح پانا۔

(۴) تہذیب تعیش، یعنی ثروت، تزک و شان، عیش و عشرت کی نمود،

ان چاروں قسم کی تہذیبوں نے حضرت انسان کی اجتماعی زندگی پر اثر ڈالا ہے، جنھوں نے اس کو شہری زندگی سکھائی اور مہذب کہا ایا۔ شہری زندگی لفظ سیوک (Civic) سے ادا ہوتی ہے جس سے لفظ سولزائڈ بنا۔ (ہارمزورتھ کی تاریخ جلد چہارم صفحہ ۲۳۶)

مد اول۔ میں بدرجۂ اولٰی ہند اور چین آتے ہیں۔ جس ملک نے سری رام چندر، کرشن مہاراج، بدھ بھگوان پیدا کئے، جہاں وید، اپنشد، رامائن، گیتا لکھی گئی۔ ساتھ ساتھ علمی فتوحات بھی قابل تحسین ہیں۔ مد سوم کا بھی کچھ حصہ آتا ہے۔

مد دوم۔ میں اہل یونان آتے ہیں، جن کے علوم لطیفہ اور نفیسہ کی نظیر نہیں، فلسفہ، ڈراما، ادب، بھی اس کے علاوہ ہیں۔ اب سے پہلے چین اور جاپان صناعی، مصوری اور نقاشی میں مشہور تھے۔

مد سوم۔ میں فرانس، انگلینڈ، جرمنی، امریکہ، مصر آتے ہیں۔ مصر کے اہرام فن تعمیر کے بے مثل نمونے ہیں۔ جاپان بھی اسی مد میں داخل ہو رہا ہے۔ چین کئی مفید اور کار آمد اشیاء کا موجد تھا۔

مد چہارم۔ میں ایران اور رومۃ الکبریٰ آتے ہیں، ایران عیش و عشرت میں سب سے سبقت لیگیا رومن قوم کے تزک و شان، عیش و عشرت کی کیفیتوں سے تاریخ کے اوراق درخشاں ہیں۔

مگر اب زمانہ ایسا آگیا ہے کہ مختلف تہذیبیں شیر و شکر ہو رہی ہیں جس کا نتیجہ ایک مکمل اور عالمگیر تہذیب ہوگا۔

ہولی

(ایک قصّہ)

(از ڈاکٹر اعظم کریوی)

کشن پور ٹھاکروں کی بستی تھی جس کے زمیندار دلاور سنگھ اور رام سنگھ دونوں چچیرے بھائی تھے۔ بٹی دار ہوتے ہوئے بھی اُن میں کوئی نفاق نہ تھا۔ دونوں امن پسند اور صلح کل واقع ہوئے تھے۔ زمینداری کے جھگڑوں کا فیصلہ آپس ہی میں کر لیتے تھے، کبھی کچہری عدالت جانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ اسامی بھی اُن سے بہت خوش تھے، حتیٰ کہ زمینداروں کے اشارہ پر جان تک دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ گاؤں بھر میں صرف اہیروں کی برادری ہی زمینداروں سے ناراض تھی۔ جب دلاور سنگھ اور رام سنگھ کے والدین بقید حیات تھے تو ان اہیروں نے بڑا سر اٹھایا تھا جس سے سارا گاؤں پریشان ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان کی عادت تھی کہ جب رات کو گاؤں والے سو جاتے تو وہ اپنے مویشیوں سے اُن کے کھیت چرا لیتے اور صبح ہوتے ہی اپنے گھر واپس آ جاتے، موقع ملنے پر وہ چوری کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے، کئی مرتبہ وہ پکڑے گئے لیکن ہر مرتبہ معافی مانگنے پر گاؤں والوں نے انھیں چھوڑ دیا۔ پھر بھی جب وہ اپنی عادت سے باز نہ آئے تو زمینداروں نے اہیروں کو کاشتکاری سے بیدخل کر کے گاؤں سے نکال دیا جس پر ان لوگوں نے کشن پور سے کچھ فاصلے پر ایک جنگل میں اپنی بستی بسائی جو اہیروں کا پورہ کہلانے لگی جب تک دلاور سنگھ اور رام سنگھ کے والدین زندہ رہے اہیروں نے کشن پور کی طرف رخ کرنے کی بھی ہمت نہ کی لیکن اُن کے مرتے ہی وہ پھر کشن پور میں آنے جانے لگے اور نوجوان ناتجربہ کار زمینداروں سے بظاہر نہایت ادب سے ملتے تھے لیکن باطن میں اُن سے نفرت کرتے تھے اور کشن پور کی خوشحالی دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے تھے۔ جب وہ اپنے شکستہ مکانات کو دیکھتے تو انھیں وہ دن یاد آ جاتا جب وہ کشن پور سے بڑی بے عزتی کے ساتھ نکالے گئے تھے جن زمینوں کے کبھی وہ مالک تھے اب اُن پر دوسروں کا قبضہ تھا۔ گنپت ان سب کا سردار تھا اور اس کے تین لڑکے بڑے کسرتی اور لٹھ باز تھے، ان کی طاقت پر اور گنپت کی چالاکی پر اہیروں کو بڑا ناز تھا۔ دلاور سنگھ اور رام سنگھ سے دو ایک مرتبہ مل کر گنپت نے اندازہ کر لیا کہ دونوں ناتجربہ کار اور جوشیلے نوجوان ہیں جن کو بہت آسانی سے بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اب اس کا یہ روزانہ کا معمول ہو گیا کہ وہ دونوں سے مل کر اپنی خیرخواہی

جتاتا اور باتوں ہی باتوں میں ایک کی دوسرے سے بُرائی کرتا لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ کسی کو گنپت کی نیک نیتی پر شبہ نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے جلنے لگے۔ آخر کار گنپت کی شرارت اور چالبازی سے وہ دن بھی آگیا جب ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کی جان کا دشمن ہوگیا پہلے ہنر اور خوبی کی تلاش تھی اب بُرائیوں پر نظر رہنے لگی۔ ذرا ذراسی بات پر تھانہ اور کچہری تک دوڑنے لگے۔ مقدمہ بازی میں دونوں جانب سے روپیہ پانی کی طرح بہایا جانے لگا۔ وکیلوں کی فیس، پولیس کی رشوت اور اہلکاروں کے حقوق میں اُن کی جائدادیں بکنے لگیں۔ دلاور سنگھ اور رام سنگھ کے زمانے میں کبھی تھانہ دار صاحب کو گاؤں تک آنے کی ضرورت نہ ہوئی تھی، اب پولیس کا معمولی کانسٹبل اور چوکیدار بھی اپنا رعب جمانے لگا جن اسامیوں کی طرف کبھی کسی نے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ کی تھی وہ اب بیگار میں پکڑے جانے لگے۔ گنپت کا منشا پورا ہوگیا اس نے زمینداروں سے اپنی برادری کی ذلت کا انتقام لے لیا۔ اب کشن پور میں کوئی اُسے روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ تمام اہیر جو جلاوطن کر دیے گئے تھے پھر گنپت کے ساتھ کشن پور میں آکر رہنے لگے۔

(۲)

پہلے گنپت دلاور سنگھ کے یہاں زیادہ آمد و رفت رکھتا تھا لیکن اب اس کی بھنگ رام سنگھ ہی کے دروازہ پر چھننے لگی۔ اس کی مکروفریب کی باتیں دلاور سنگھ اور رام سنگھ کی نا اتفاقی کی آگ میں ایندھن کا کام کرتی تھیں۔ کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ گاؤں والوں نے دونوں زمینداروں میں صلح وصفائی کی کوشش کی لیکن گنپت کی خفیہ ریشہ دوانیوں نے اس کا موقع ہی نہ آنے دیا۔ وہ خود صلح کی کارروائی میں شامل ہوجاتا، دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ گنپت سے زیادہ صلح پسند اور کوئی نہ ہوگا مگر دراصل وہی شرارت اور نفاق کا باعث تھا۔ اور اسی کی وجہ سے صلح نہ ہونے پاتی تھی۔ بہت دنوں تک گاؤں والے گنپت کی ذہنیت سے واقف نہ ہوسکے، لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ حلقہ کے تھانہ دار صاحب کی نظر عنایت گنپت کی طرف زیادہ رہتی ہے تو وہ گنپت سے کچھ بدگمان ہوگئے۔ لیکن اب پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا۔ پہلے گنپت تنہا تھا اب تھانہ دار صاحب بھی اس کے طرفدار تھے جب وہ گاؤں میں آتے تو گنپت اپنی تمام برادری کا دودھ دہی اُن کی خدمت میں حاضر کردیتا۔ تھانہ دار صاحب بھوکے بیل کی طرح موٹی ملائی اُتار کر دودھ پیتے اور جو باقی رہتا کانسٹبلوں کو بخش دیتے۔ ہاتھ دھونے پر بھی چکناہٹ دُور نہ ہوتی تو مونچھوں پر پھیر دیتے ایسا عمدہ اور تازہ دودھ گاؤں بھر میں کسی کو نصیب نہ ہوتا تھا۔ اس کے بدلے میں گنپت اور اس کے خاندان والے گاؤں میں جھگڑا اور فساد کرتے اور داروغہ صاحب اُن

کی حرکتوں کو نظر انداز کرتے رہتے۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ ہولی کے دس دن اور باقی تھے، اس سال فصل اچھی ہوئی تھی، پھگوا کے راگ بسے رات کے وقت گاؤں میں بڑی چہل پہل رہنے لگی۔ معمولی کاشتکاروں کی عورتوں نے بھی اپنے شوہروں کو نئے نئے زیور بنوانے کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ کچھ کچھ کٹائی بھی شروع ہوگئی تھی۔ ہولی کے دن نئے گیہوں کی پوری کچوری بنے گی، اسی خیال میں چھوٹے بڑے سب مگن تھے۔ لیکن دلاور سنگھ اور اُن کے گھر والوں کو اطمینان قلب حاصل نہ تھا، اُن کے گیہوں کے کھیت پک گئے تھے۔ ان کھیتوں کی حالت سب کھیتوں سے اچھی تھی۔ رات کو سردی میں ٹھٹھر کر دلاور سنگھ اپنے کھیت کے کسی کونے میں بیٹھکر فصل کی رکھوالی کرتے تھے۔ اُن کو ڈر تھا کہ کہیں گنپت اور رام سنگھ کوئی شرارت نہ کر بیٹھیں۔ ادھر رام سنگھ بھلا دلاور سنگھ کی خوشحالی کس طرح ٹھنڈے دل سے دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے گنپت کے مشورہ سے پٹواری کو ملایا اور دلاور سنگھ کے گیہوں والے کھیت کی کاشت اپنے نام لکھالی۔ ان کی یہ کارروائی جائز تھی یا ناجائز اس سے کوئی مطلب نہیں، انسان جب جھگڑا کرنے پر آجاتا ہے تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ ہی لیتا ہے۔ دلاور سنگھ جنھوں نے کھیت کو دھوپ میں چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہا کر جوتا بارش اور سردیوں کی تیز و تند ہواؤں کا مقابلہ کرکے جس کھیت کی رکھوالی کی جس کی پیداوار پر ان کے بال بچے خوش تھے جس کے گیہوں پر ہولی منائی جانے والی تھی، اُسی کھیت پر گنپت اور رام سنگھ کی ٹیڑھی نظریں پڑ رہی تھیں اور دلاور سنگھ کو اس کی کوئی خبر نہ تھی جس دن کھیت کٹنے والا تھا اس کی شام کو دلاور سنگھ نے گاؤں کے چاروں کو اطلاع دے دی تھی۔ جب رام سنگھ کو معلوم ہوا کہ کل دلاور سنگھ کا کھیت کٹے گا تو اُنھوں نے بھی اپنے آدمیوں کو ہوشیار کر دیا، اس کے ساتھ ہی تھانہ میں بھی رپٹ لکھوا دی کہ دلاور سنگھ کل ہمارے کھیت کو کاٹنے کا ارادہ رکھتا ہے ضروری کارروائی کی جائے ورنہ بلوہ ہو جانے کا ڈر ہے۔

(۴)

صبح ہوتے ہی دونوں طرف کے آدمی کھیت پر پہونچ گئے، رام سنگھ کے "گہار" کو دیکھ کر دلاور سنگھ دنگ رہ گئے۔ وہ کچھ کہنے والے ہی تھے کہ رام سنگھ نے للکارا "کاشت ہمارے نام لکھی ہے تم یہاں کیوں آئے ہو، اپنا بھلا چاہتے ہو تو سامنے سے ہٹ جاؤ ہمارے آدمی کھیت کاٹیں گے۔" دلاور سنگھ عجیب کشمکش میں تھے۔ سامنے سے ہٹتے ہیں تو سال بھر کی کمائی جاتی ہے اور مقابلہ کرتے ہیں تو جان جاتی ہے کیونکہ فریق مخالف کی طاقت بڑھی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے تھوڑی دیر کچھ سوچا اور پھر مرنے مارنے کو تیار ہوگئے۔ وہ مٹی کے پتلے نہ تھے، لڑکپن سے انھیں پہلوانی کا شوق تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے کھیت کی پامالی کیسے دیکھ سکتے

راجپوتی خون نے جوش مارا اور وہ لاٹھی سنبھال کر آگے بڑھے، پھر کیا تھا دونوں طرف سے لاٹھیاں چلنے لگیں، گنپت کی دلی مراد برآئی وہ بھیس میں چنگاری لگا کر دور سے تماشا دیکھنے والوں میں تھا۔ دور ہی سے چلا رہا تھا "بڑھے چلو — واہ رے جوانو! بس مار لیا...... جانے نہ پائے گھبرانا نہیں دلاور سنگھ کو اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ ہے۔ ان کی ساری ہیکڑی بھلا دو!" چاروں طرف سے دلاور سنگھ کو گھیر لیا گیا تنہا آدمی پورے "گنوار" کا کہاں تک مقابلہ کرتا۔ زخموں سے چور ہو کر دلاور سنگھ زمین پر بیہوش ہو کر گرے، لیکن گرتے گرتے اُنھوں نے رام سنگھ کو بھی زمین پر لٹا دیا۔ رام سنگھ کا خیال تھا کہ داروغہ جی موقع واردات پر ضرور پہونچ جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا، کیونکہ داروغہ جی کو اس کا تجربہ تھا کہ فوجداری کے بعد خود ہی لوگ اُن کی چوکھٹ پر ناک رگڑنے آئیں گے، لڑائی میں کودنا اُن کی مصلحت کے خلاف تھا۔ چنانچہ اُن کا خیال ٹھیک تھا۔ فوجداری کے بعد دونوں طرف والے دوڑتے ہوئے رپٹ لکھانے تھانہ میں پہونچے۔ لیکن وہاں تو صرف وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو سب سے زیادہ بھینٹ دے اور صرف داروغہ جی ہی کی نہیں بلکہ ادنیٰ سپاہیوں کی بھی پیٹ پوجا کا سامان مہیا کرے۔ غریبوں کو وہاں کوئی نہیں پوچھتا امیروں کی قدر ہوتی ہے۔ داروغہ جی کو خوش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جب وہ تحقیقات کرنے کے لئے کشن پور میں پہونچے تو سارا گاؤں تھرا اُٹھا۔ ایسی بڑی فوجداری گاؤں میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ داروغہ جی کے پہونچتے ہی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی جو فوجداری میں شریک تھے وہ بھی اور جو علیحدہ تھے وہ بھی پکڑ بلائے گئے۔ گنپت کی چاندی تھی، داروغہ جی نے اُسی کے مکان پر اپنا ڈیرہ جمایا۔ گھوڑے کے سامنے ہری ہری دوب ڈال دی گئی۔ گنپت کھڑا ہو کر داروغہ جی کو پنکھا جھلنے لگا۔ دودھ دہی اور ملائی کی افراط تھی، جن کانسٹیبلوں کو گڑ کا شربت بھی مشکل سے ملتا تھا وہ دودھ کے شربت پر منہ بنانے لگے۔ اس پکڑ دھکڑ کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ رام سنگھ نے ایک ہزار پر داروغہ جی کو راضی کر لیا چونکہ دلاور سنگھ اس سے زیادہ نہ پیش کر سکے وہ مظلوم ہو کر بھی ظالم ثابت کئے گئے۔ داروغہ جی کی کوشش سے ڈاکٹر نے رام سنگھ کو "ضرب شدید" کا سرٹیفکٹ دیدیا لیکن دلاور سنگھ کو "ضرب خفیف" ہی کا سرٹیفکٹ نصیب ہوا۔ پولیس نے دلاور سنگھ کو حراست میں لے لیا اور بعد میں بڑی مشکل سے ضمانت پر رہا کیا۔

(۴)

مقدمہ چلا، تاریخیں بڑھتے لگیں۔ وہ زمیندار جو عدالت تک جانا اپنی کسر شان سمجھتے تھے انھیں کی اولاد اب اہلکاروں کی جوتیاں اُٹھانے میں بھی کوئی بے غیرتی نہ سمجھتی تھی۔ باپ دادا کی کمائی مقدمہ بازی میں اڑنے لگی، فصلیں کھڑی تھیں لیکن ان کو اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ انھیں کاٹ سکیں۔ فوجداری

سے پہلے رام سنگھ کے کچھ کھیت کٹ چکے تھے اور ان کا اناج کھلیان میں پڑا تھا وہ اُسے بھی گھر تک نہ لا سکے تھے۔ کھلیان میں اناج کا انبار دیکھکر گنپت کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی اور اُس نے اپنے ایک لڑکے کو کچھ اشارہ کر دیا ——— دوسرے دن رات کو ہولی جلنے کی مہورت تھی، گاؤں والے پھگوا گانے میں محو تھے، گنپت کا لڑکا منہ چھپائے رام سنگھ کے کھلیان میں پہونچا، ایک مرتبہ ادھر اُدھر دیکھا اور سوکھی بالیوں میں دیا سلائی دکھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جب آگ خوب پھیلی اور شعلے بلند ہوئے تو گاؤں والے دوڑے مگر اب ان کا دوڑنا بیکار تھا، دیکھتے ہی دیکھتے سارا کھلیان جل کر راکھ ہو گیا۔ گنپت نے مخبری کی کہ یہ ساری شرارت دلاور سنگھ کی ہے، میں نے خود اُن کو آگ لگا کر بھاگتے دیکھا ہے۔ رام سنگھ نے دانت پیسکر کہا "اچھی بات ہے، میں دلاور سنگھ کے گھر میں آگ نہ لگا دوں تو میرا نام رام سنگھ نہیں۔"

صبح ہوتے ہی جب دلاور سنگھ نے رام سنگھ کی دھمکی کی خبر سُنی تو وہ قابو سے باہر ہو گیا، اُس نے اپنی لاٹھی اُٹھائی اور مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا رام سنگھ کے دروازے پر جا کر آواز دی۔ "بہادر ہے تو باہر نکل آ۔ چوری چھپے وار کرنا بہادر راجپوتوں کا کام نہیں ہے۔" رام سنگھ بھی آخر راجپوت تھا، کوئی گھر پر آکر للکارے اور وہ اندر بیٹھا رہے، وہ اپنے گھر سے تڑپ کر نکلا اور باہر نکلتے ہی لاٹھی چلا دی۔ تھوڑی دیر تک دونوں نے اپنی اپنی لاٹھیوں کے خوب خوب جوہر دکھائے اور پھر ایک ساتھ ہی خون میں نہائے ہوئے زمین پر گرے۔ کچھ دیر تک تڑپے اور پھر اُن کی روحیں قید ہستی سے آزاد ہو گئیں۔ ہولی کا دن تھا، گاؤں والوں نے تو رنگ کی ہولی کھیلی، لیکن دو بھائیوں نے خون کی ہولی منائی۔

حکمت کے موتی

آسمان سے برسنے والا پانی گدلا ہوتا ہے۔ لیکن زمین سے اُبلنے والے چشمے صاف شیریں اور صحت بخش ہوتے ہیں اسیطرح باہر سے حاصل کی ہوئی خوشیاں جلدی ختم ہو کر غم کی ایک نہایت تلخ یادگار چھوڑ جاتی ہیں، لیکن اندر سے پیدا ہونیوالی خوشیاں دیرپا اور روح پرور ہوتی ہیں۔

کسی نشے کا خمار اُترنے کے بعد طبیعت کی پریشانی اور اعضا شکنی لازمی ہے۔

قناعت تمام بیماریوں کا بہترین علاج ہے۔

کسی کے صبر کی حد دریافت کرنے کی کوشش نہ کرو۔

اگر تم تھوڑے وقت اور تھوڑی دولت کی قدر نہیں کرتے تو زیادہ وقت اور زیادہ دولت کو قطعی برباد کر دوگے۔

کامیابی کی روح خیالات کی یکسوئی ہے۔

روح انیس[۱]

یہ میر انیس کے بہترین سات مرثیوں پندرہ سلاموں اور پچیس[۲۵] رباعیوں کا ایک نظر فریب اور دلآویز مجموعہ ہے، جسے مشہور ادیب سید مسعود حسن رضوی صاحب ادیب ایم۔اے صدر شعبۂ فارسی و اُردو لکھنؤ یونیورسٹی نے معہ مقدمہ، دیباچہ، فرہنگ غیر مانوس و دقیق الفاظ و حواشی مرتب فرمایا ہے، کتابت و طباعت اور اس کے ظاہری محاسن کی نسبت اسی قدر کہدینا کافی ہے کہ اسے انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد نے بصرف زر کثیر اور نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

فاضل مؤلف نے اس مجموعہ کی صحت و ترتیب میں سخت کاوش و جانفشانی سے کام لیا ہے اور واقعی اس میں مرثیوں اور دیگر کلام انیس کی روح نکالکو پیش کی گئی ہے۔ فاضل مؤلف نے دیباچہ میں واقعات کربلا کی مختصراً تشریح کے علاوہ مرثیہ، اجزائے مرثیہ، اشخاص مرثیہ، میر انیس کے حالات زندگی اور کلام پر بھی مختصر تبصرہ کیا ہے۔ آخر میں مشکل اور غیر مانوس الفاظ کی ایک فرہنگ اور مرثیوں پر حواشی درج ہیں شروع میں میر انیس کی سہ رنگی خوبصورت تصویر بھی دیگئی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں (۱) میر انیس کی تحریر کا عکس (۲) میر انیس کا مکان (۳) میر انیس کا مدفن۔ (۴) میر انیس کی ایک مجلس کی تصویر بھی شامل کی گئی ہے۔ ان تصاویر سے کتاب کی اہمیت دوبالا ہوگئی ہے۔

میر انیس مغفور کے کلام پر تبصرہ کرنا فضول ہے آپ کے کلام کے محاسن پر آبحیات، موازنہ انیس و دبیر شعر الہند اور حیات انیس میں کافی بحث کی جا چکی ہے۔

اگرچہ فرہنگ اور حواشی لکھنے میں فاضل مؤلف نے کمال محنت اور تحقیق سے کام لیا ہے تاہم بہ تقاضائے بشریت کہیں کہیں غلطیاں بھی رہگئی ہیں، مثلاً:۔

---

[۱] مطبوعہ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد۔

(۱) فرہنگ کے صفحہ ۴۲ سطر ۵ میں کنعان کے معنی یہ لکھے گئے ہیں کہ "ملک مصر کا ایک شہر جو حضرت یوسف کا وطن تھا" یہ غلط ہے کیونکہ "کنعان" کسی مصری شہر کا نام نہیں بلکہ دریائے اردن کے مغربی علاقہ کا نام تھا جو مصر میں نہیں تھا بلکہ فلسطین کا ایک حصہ تھا اور ہے۔ اگرچہ اس ملک پر ایک زمانہ میں فراعنہ مصر کا تسلط ضرور ہوگیا تھا۔ ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برطانیہ لفظ "کنعان" نیز نقشہ "ارض مقدس" جو معمولی اٹلسوں میں بھی مل سکتا ہے۔

(۲) "مدینہ۔ شہر۔ ملک عرب کا ایک مشہور شہر جو پیغمبر اسلام کا مولد و مدفن ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا ایک نہایت مقدس زیارت گاہ ہے" (صفحہ ۲۶ سطر ۳)۔ یہ بھی غلط ہے کیونکہ مدینہ پیغمبر اسلام کا "مولد" نہیں بلکہ "مدفن" ہے۔ پیغمبر اسلام کا مولد شہر مکہ ہے۔"

امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں ان خفیف غلطیوں کی اصلاح کردی جائیگی۔ بہرحال ان سے قطع نظر یہ کتاب دلدادگانِ اُردو کے لئے ہر طرح سے قابل قدر ہے۔

غالب[۱]

یہ کتاب درحقیقت غالب کی شاعری پر ایک مبسوط تنقیدی مقالہ ہے، جس میں مصنف نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ "غالب کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہوسکتا"۔ مصنف کی اس "سعی بے حاصل" کی محرک ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تحسینی تنقید معلوم ہوتی ہے، اگرچہ مصنف نے صاف صاف لفظوں میں اس کا اقبال نہیں کیا ہے تاہم دیباچہ پڑھکر یہ مستنبط کرلینا چنداں دشوار نہیں ہے۔ بہرنوع شروع سے آخر تک اس کتاب میں مصنف نے غالب پرستی کے خلاف ایک پُرزور صدائے احتجاج بلند کی ہے اور غالب کے مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ وہ غالب کی شاعری میں "بے اطمینانی کی لے" کے شاکی ہیں۔ غالب کی بے تعصبی کو مذہب کے ساتھ "آنکھ مچولی" سے تعبیر کرتے ہیں اور غالب کی وطن پرستی کے بھی منکر ہیں۔ چونکہ وہ غالب کی کسر نفسی کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہے اس لئے وہ غالب کے صوفیانہ رنگ کو بعض "آرائش مضامین" کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ جمالیاتی احساس سے محروم ہونیکی وجہ سے وہ غالب کی شاعری کی قدردانی سے معذور ہیں اور طرح طرح کے اتہامات لگاکر غالب کے دامنِ شہرت کو داغدار بنانا چاہتے ہیں لیکن غالب کے کلام کا جادو مصنف کے سر چڑھکر بولتا ہے، اور انھیں شاید بادلِ ناخواستہ غالب کے چند اشعار کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، لیکن ان اشعار پر بھی وہ "مسلسل بڑی نظم" (معلوم نہیں اس سے مصنف کی مراد

---

[۱] مصنفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف پی ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر انگریزی جامعۂ عثمانیہ مترجمہ سید معین الدین قریشی ایم اے مطبوعہ دکن لا رپورٹ پریس۔ چام باغ حیدرآباد دکن۔ قیمت عہ

مثنوی ہے یا کچھ اور) کی قید لگاتے ہیں، جو مزاجِ اُردو کے سازگار نہیں۔ اس پر بھی یہ ستم ظریفی ہے کہ وہ غیر ملکی معیار سے اجتناب کا بھی اعلان کرتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر مصنف وسعت نظر اور غیر جانبداری سے کام لیکر کلام غالب کا از سر نو مطالعہ کریں تو وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہونگے۔ بہر حال قدر دانانِ غالب کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس کا حجم ۲۴۴ صفحات ہے اور عہ قیمت یقیناً زیادہ ہے۔

اصنام خیالی

یہ کتاب مسٹر جلیل احمد قدوائی ایم۔اے کے تیرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو چھوٹی تقطیع پر شائع ہوئی ہے شروع میں بیس صفحات پر مشتمل پروفیسر محمد مجیب صاحب نے ایک محققانہ مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں یوروپین افسانوں پر عموماً اور روسی کہانیوں پر خصوصاً روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان تیرہ افسانوں میں کچھ ترجمے اور کچھ طبعزاد ہیں۔ ترجمہ کے لئے اگرچہ موسیو ترجینیف، چیخوف، موپاساں جیسے چوٹی کے افسانہ نویس منتخب کئے گئے ہیں لیکن جن افسانوں کا ترجمہ کیا گیا ہے ان کا انتخاب کچھ زیادہ قابل تعریف نہیں کہا جا سکتا ہے۔ قابل مصنف کے طبعزاد افسانے بھی مغربی افسانہ نگاروں کی تقلید میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً "رومال کی چوری" میں اسٹیونسن کا "تینگے" میں ایڈگرایلن پو کا اور "سرکاری ملازمت" میں چیخوف کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ بایں ہمہ مسٹر قدوائی کے طبعزاد افسانوں میں ایک ممتاز خصوصیت ہے جس کو اصطلاح نفسیات میں "احساس مماثلت" (Identification.) کہتے ہیں۔ یعنی جو سنتا ہے اسے وہ اپنی ہی داستان معلوم ہوتی ہے۔

ترجمہ کا کمال یہ ہے کہ وہ ترجمہ معلوم نہ ہو، افسوس ہے کہ اس مجموعہ کے ترجموں میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود نہیں ہے۔ زبان کی بھی کافی خامیاں موجود ہیں، اکثر فقرے کے فقرے اُلجھے ہوئے ہیں اور ایک آدھ مقام پر تو فاضل مصنف کا منشا سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے۔ تاہم مصنف کے ہونہار ہونے میں کلام نہیں ہے اور بہ حیثیت مجموعی کتاب قابل مطالعہ ہے۔ ملنے کا پتہ:- میسرز کتابستان سٹی روڈ الہ آباد قیمت ۱۲؍

دھرو

مصنفہ پروفیسر رام سروپ صاحب کوشل ایم۔اے ودیا بھوشن جسے رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا ہے۔ قیمت ۶؍

کچھ عرصہ سے پروفیسر رام سروپ صاحب کوشل نے چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور سبق آموز کتابوں کا ایک سلسلہ جاری کیا ہے، جس میں ابتک نصف درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کتاب زیرنظر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

کتاب کا قصہ پراچین ہندو زمانہ سے تعلق رکھتا ہے اور مختصراً یہ ہے کہ متھرا کے راجہ اُتان پاد کے سونیتی اور سوروچی نامی دو رانیاں تھیں۔ دونوں رانیوں کے عادات و خصائل میں بعد المشرقین تھا۔ سونیتی نہایت نیک، عالی ظرف، دانشمند اور وفادار تھی، مگر سوروچی تنگ ظرف، کمینہ خصلت اور بد باطن تھی لیکن چونکہ یہ چھوٹی تھی اسلئے چہیتی تھی۔ اس نے بڑی رانی کو نکلوا دیا جو جنگل میں جاکر پناہ گزین ہوئی اور یاد خدا میں مصروف ہوکر زندگی کے دن بسر کرنے لگی۔ ایک دن راجہ اُتان شکار میں سونیتی کے پاس پہونچا اور اس کو اپنے ساتھ لے آیا۔ کچھ دنوں بعد بڑی رانی کے بطن سے دھرو نامی ایک راجکمار پیدا ہوا، اسی طرح چھوٹی رانی کے دوسرا لڑکا اُتم پیدا ہوا۔ ایک دن سوتیلی ماں نے دھرو کو نہایت دلشکن طعنے دیئے جن سے متاثر ہوکر وہ ہری کی تلاش میں نکل گیا۔ جنگل میں رہکر عرصہ دراز تک ریاضت شاقہ کرتا رہا۔ بالآخر نارومنی کی زیر ہدایت عمل کرکے دھرو کامیاب ہوا۔ مطلوب حقیقی نے جلوہ دکھایا اور بھگوان نے فرمایا کہ اب تم متھرا کو جاؤ تمہاری مراد پوری ہوئی۔ تم باپ کے تخت پر بیٹھکر راج کرو۔ یہ سُنکر دھرو واپس ہوا۔ متھرا پہونچکر باپ کا قدمبوس ہوا۔ اُتم کو کسی شخص نے جنگل میں قتل کر دیا اور راجکمار دھرو نے تخت پر بیٹھکر عرصہ دراز تک داد جہانبانی دی، اور بعد مرنے کے بھگوان نے اسے دھرو ستارہ بنا دیا۔ یہ چھوٹی سی کتاب عالی ہمتی اور اولوالعزمی کا درسنامہ ہے، اور اس قابل ہے کہ بچے پڑھیں اور حوصلہ و عمل کا سبق حاصل کریں۔ کتاب فوٹو بلاک کی تصاویر سے مزین اور عمدہ زیور کتابت و طباعت سے آراستہ ہے۔ اگر اس کی زبان کسی قدر اور سلیس ہوتی تو اچھا تھا۔

گلیننگس (GLEANINGS.)

یہ کتاب ملک کے مشہور ادیب اور اہل قلم پنڈت منوہر لال زتشی کے ان چھبیس اخلاقی، ادبی، معاشرتی سیاسی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جو موصوف نے گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں وقتاً فوقتاً انگریزی زبان میں تحریر فرمائے اور جو "انڈین ریویو، مدراس"، "ہندستان ریویو الہ آباد"، اور "لیڈر" الہ آباد وغیرہ ملکی رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کے لئے مسٹر چنتامنی ایڈیٹر لیڈر نے ایک قابل قدر مقدمہ

اس کتاب کے اکثر مضامین کا مقصد اصلاح معاشرت ہے۔ اس کے متعلق قابل مصنف نے جو رائیں پیش کی ہیں وہ نہایت معقول، اہم اور قابل غور ہیں۔ اس کے تاریخی و سیاسی مضامین سے پنڈت زتشی صاحب کی وسعت نظر، اصابت رائے اور تبحر علم و فضل کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ آپ نے رہنمایان سیاست اور مصلحین معاشرت کے اغراض و مقاصد پر ہمدردانہ اور مخلصانہ پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے۔ ادبی مضامین سے مصنف کے وسیع و عمیق مطالعہ اور مبصرانہ و ناقدانہ دماغ کا پتہ چلتا ہے۔

مضامین کی زبان نہایت پاکیزہ اور سلجھی ہوئی ہے، لیکن کہیں کہیں عبارت میں فارسی زبان کی سی رنگینی پیدا ہو گئی ہے۔ بعض مضامین خصوصاً ادبی مقالات میں ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً غالب، کبیر اور کبیر پنتھ، بشن نراین درؔ اور برج نراین چکبست پر جو مضامین لکھے گئے ہیں ان میں زیادہ تفصیل سے کام لیا جا سکتا تھا

بہر حال بحیثیت مجموعی یہ کتاب بہت دلچسپ اور مفید ہے، اور ہر انگریزی داں ہندوستانی کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ ملنے کا پتہ :- انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

اجودھیا کا اتہاس[1] (ہندی)

ہندی کی یہ ڈھائی سو سے زائد صفحات کی کتاب ہے جس کے مصنف ہندی کے نامور ادیب رائے بہادر لالہ سیتا رام صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر الہ آباد ہیں اور جس کی اشاعت ہندوستانی اکیڈیمی کے زیر اہتمام ہوئی ہے، اجودھیا ہندوستان کا ایک قدیم ترین تیرتھ ہے، اس کی تاریخ گویا شمالی ہندوستان کی تاریخ ہے۔ کیونکہ زمانہ قدیم کے حکمرانوں نے اس کی مرکزی حیثیت کے باعث اس کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا۔ جہاں تک مورخ کی نگاہ کام کرتی ہے اور جہاں تک ماضی کے تاریک پردہ پر تاریخ روشنی ڈال سکی ہے ہم اجودھیا کا نام قدیم آریہ ورت کے بڑے شہروں میں پاتے ہیں۔ یہی سورج بنسی خاندان کا جس کی ابتدا منو سے منسوب کی جاتی ہے پایۂ تخت تھا۔ بھگوان بدھ کے وقت میں بھی اجودھیا کا شمار ملک کے بڑے مقامات میں تھا۔ کیونکہ گوتم بدھ نے یہاں رہکر اپنے مذہب کی تلقین کی تھی، فاہیان اور ہیوان سانگ نامی مشہور چینی سیاحوں نے بھی اپنے سفرناموں میں اجودھیا کا ذکر کیا ہے۔ اس طویل تاریخی عرصہ میں یہ شہر کئی بار اُجڑا اور بسا۔ زمانہ کے دست ستم سے نہ کوئی بچا ہے اور نہ بچے گا۔ چنانچہ اجودھیا نے بھی اچھے اور بُرے دونوں دن دیکھے، اگر کبھی اس کی فوجیں فتح کا نقارہ بجاتی ہوئیں ظفرمند لوٹیں تو غیر ملکی فاتحوں نے جن کی آنکھیں مذہب کے جوش میں اندھی ہو رہی تھیں اس کے مندروں کو مسمار اور برباد

[1] مصنفہ رائے بہادر لالہ سیتا رام صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر۔ پبلشر ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد۔ قیمت ۱۲/

بھی کیا۔ اگر یہاں کی سرزمین اپنا حال خود بیان کر سکتی تو نامعلوم عظمت کی کتنی دلکش داستانیں ہمارے گوش گذار ہوتیں۔

ہندوؤں کے لئے تو یہ شہر مکہ اور مدینہ کے بمنزلہ ہے لیکن رائے بہادر لالہ سیتارام صاحب کی تحقیقات کے بموجب اجودھیا مسلمانوں، جینیوں اور بودھوں کا بھی مقدس مقام ہے۔ ایسے شہر کا حال اور پھر ایسے قابل محقق کی زبانی جو اس مقدس خطے کے چپے چپے سے نہ صرف واقف ہی ہے بلکہ جس کو اس سرزمین کے ذرہ ذرہ سے عشق ہے کتنا دلچسپ اور سبق آموز ہوگا۔

"اجودھیا کا تھا اس" کوئی معمولی تصنیف نہیں ہے، نامور مصنف نے اس قابل دید کتاب میں اس قدیم دارالسلطنت کی شروع سے آج تک کی مکمل تاریخ قلمبند کر دی ہے۔ رائے بہادر لالہ سیتارام صاحب نے اسمیں نہ فقط سنسکرت ذرائع ہی سے کام لیا ہے بلکہ انگریزی اور فارسی کی بہت سی مستند تاریخی کتابوں سے فائدہ اُٹھایا ہے، آپ نے اس شہر کے متعلق جتنے دعوے کئے ہیں ان سب کو قابل وثوق حوالوں سے صحیح ثابت کر دکھایا ہے۔ متعدد تصویروں اور نقشوں نے اس کتاب کی دلچسپی میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے آخر میں آپ نے کئی قابل قدر ضمیمے بھی شامل کر دیئے ہیں جن سے کتاب کی علمی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے

رائے بہادر صاحب کا خیال ہے کہ موجودہ اجودھیا گپت خاندان کے مشہور آفاق فرمانروا بکرماجیت کی بسائی ہوئی ہے۔ انکی رائے کے بموجب اس چکرورتی راجہ نے اُجڑی ہوئی اجودھیا کا سراغ لگا کر اس مقام پر اپنی راجدھانی قائم کی، جنم استھان کا مندر جہاں اب ایک مسجد تعمیر ہو گئی ہے اسی مشہور و معروف راجہ کا بنوایا ہوا ہے۔ لائق مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سنہ ۱۸۹۹ء میں یگ ویدی کی کھُدائی میں جو جلے ہوئے چاول نکلے تھے وہ راجہ بکرماجیت ہی کے یگ کے چاول تھے۔ آپکا یہ قول کہاں تک درست ہے یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن جو دلائل رائے بہادر صاحب نے پیش کئے ہیں وہ قرین قیاس ضرور ہیں موجودہ اجودھیا کے متعلق آپکے نظریہ کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جنم استھان کے ستونوں کا طرز تعمیر گپت زمانہ کے فن تعمیر سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے بقیہ عمارتیں انیسویں صدی میں تعمیر ہوئی ہیں لہذا انسے کچھ پتہ نہیں چل سکتا ہے۔ ہمکو امید ہے کہ اکیڈیمی اس کتاب کا اردو ایڈیشن بہت جلد شائع کریگی۔ اس کی اشاعت اکیڈیمی کیلئے ہر آئینہ قابل فخر ہے۔

محشرستان محشر عابدی بی۔ اے نے بارہ افسانوں کو یکجا کر کے ایک کتابی صورت دی ہے جنمیں بہت سے افسانے تو دوسرے رسائل سے نقل یا ترجمہ کئے گئے ہیں اور کچھ طبعزاد ہیں۔ زبان کہیں کہیں عام فہم نہیں رہی کیونکہ بہت سے عربی اور فارسی غیر مشکل الفاظ بھر دیئے گئے ہیں، باینہمہ بعض افسانے بہت دلکش اور سبق آموز ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب ہے، قیمت مجلد ۱۲، غیر مجلد عہ مطبع عہد آفریں حیدرآباد دکن سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

یادِ رفتگاں

علامہ علی حیدر نظمؔ طباطبائی مرحوم

(از جناب عزیزؔ رشدی مدیر معاون سفینۂ نسواں)

جوہر شناس زمانہ ابھی رسواؔ کی نوحہ خوانی میں مصروف تھا کہ ۲۷۔محرم کی صبح کو اُس کا ایک قدیم آشنا یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے دنیائے فانی کو چھوڑ کر چل بسا۔ یہ وہ ہستی تھی جس کو فی الحقیقت مغتنمات ہند کہا جا سکتا ہے، یہ وہ عدیم النظیر ذات تھی کہ جس کے اُٹھ جانے کے بعد اس کے نعم البدل کی کوئی توقع نہیں۔

علامہ علی حیدر نظمؔ طباطبائی کی موت نہ صرف ایک بڑے شاعر کی، ایک بڑے ادیب کی، ایک بڑے عالم کی، بلکہ درحقیقت اسے قوم کی موت کہنا چاہیئے: ملک کی بدنصیبی خیال کیجئے تو زیادہ بیجا نہیں کیونکہ ایسی ہی یکتائے روزگار ہستیوں سے قوموں کے مردہ دلوں میں کچھ علم و ادب کی جان ڈالی جا سکتی ہے۔ یہی وہ ہستیاں ہیں کہ جن کا دم غنیمت خیال کیا جاتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے ایسے بزرگوں سے اسی رواروی چل چلاؤ میں کچھ سیکھ لیا۔

سید علی حیدر طباطبائی خلف میر مصطفےٰ حسین طباطبائی لکھنوی ۱۶ محرم روز جمعہ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) کو بمقام حیدر گنج لکھنؤ پیدا ہوئے۔ آپ حسنی النسل سادات طباطبائی سے تھے۔ آپ کا سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو حضرت امام حسین علیہ السلام کے شاید پرپوتے یا پوتے ہوتے تھے ملتا ہے۔ سولہ سال کی عمر تک آپ نے اپنے وطن میں رہکر ملا طاہر نحوی سے عربی فارسی صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ انھیں ایام میں منشی مینڈو لال زارؔ سے علوم متداولہ اور فن مشق سخن کے بارے میں ملا کرتے تھے۔ جب آپ شاہ اودھ کے شاہزادوں کی تعلیم کے لئے پروفیسر کی حیثیت سے کلکتہ بھیجے گئے تو وہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ علامہ قائمتہ الدین مرزا محمد علی مجتہد سے منقولات کا درس لیا کرتے تھے۔ طبیعت بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل تھی، یا یوں کہئے کہ قدرت نے شاعری کو جزو فطرت بنا دیا تھا، غرض اس کم سنی میں بھی مرزا کوکب وغیرہ کے مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن لیا کرتے تھے۔

پھر آپ کو شاہزادگان اودھ و میسور کی جدید درس گاہ میں جس کو والیسرائے وقت نے تیار کیا تھا عربی پروفیسری دی گئی، لیکن اس درسگاہ کا سلسلہ شاہ اودھ کے دم تک ہی رہا۔ اسی زمانہ میں حیدرآباد کے شاہی خاندان کے لڑکوں کی درسگاہ "مدرسہ اعزہ" میں ایک عالم و فاضل استاد کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، آپ میر افضل حسین صاحب مرحوم میرمجلس عدالت العالیہ کی تحریک سے حیدرآباد بلوائے گئے۔ ابتداءً آپ کا تقرر حیدرآباد میں کتب خانۂ آصفیہ (اسٹیٹ لائبریری) کی مہتممی پر ہوا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی آپ کو نظام کالج کی عربی پروفیسری پر لے لیا گیا۔ تقریباً تیس سال تک آپ طلبائے نظام کالج کو اپنے چشمۂ علم و فضل سے سیراب کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ کو سرکار سے وظیفۂ حسن خدمت ملگیا بعدۂ حضور پرنور نے آپ کو شہزادگان والاشان کی تعلیم کے لئے انتخاب فرمایا، چنانچہ آپ نواب عمادالملک مرحوم کے ساتھ یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں آپ کو حضور پرنور نے "نواب حیدر یار جنگ" کے خطاب سے ممتاز فرمایا۔ اس کے کچھ دن بعد پھر سلطان العلوم کی نظر آپ پر پڑی اور آپ اپنی علمی قابلیت و مہارت کی وجہ سے دارالترجمہ کے ناظر ادبی قرار دیئے گئے۔ جتنی کتابیں اس محکمہ سے ترجمہ ہوتیں آپ اُن کو شائع ہونے سے پہلے ایک بار ادبی نقطۂ نظر سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ پانچ چھ سال تک اس ادبی خدمت کو انجام دیکر کبرسنی کی وجہ سے مولانا جوش کو اپنی جگہ دیکر خانہ نشین ہوگئے تھے، مگر پھر بھی دارالترجمہ کی اہم کمیٹیوں میں آپ شرکت فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ وفات سے ایک دن قبل کی ایک کمیٹی میں آپ شریک رہ چکے تھے۔

باوجود ضعیفی اور خانہ نشینی کے آپ کو اپنی عدیم النظیر قابلیت نے آرام لینے کا موقعہ نہ دیا۔ حیدرآباد زنانہ کالج کے لئے عربی پروفیسر کی ضرورت محسوس ہوئی اور کوئی خاتون اس قابل نہ ملی جو اس خدمت کو انجام دے سکتی۔ آخرکار محکمہ تعلیمات نے پھر آپ ہی کو زنانہ کالج کا عربی پروفیسر مقرر کیا۔ چنانچہ آپ کے فیض تلمذ سے اُسی سال آپ کی ایک شاگرد نہ صرف بی، اے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئیں بلکہ عربی میں بھی تمام یونیورسٹی میں اول رہیں۔

علامہ مرحوم کی علمی قابلیت محتاج اظہار نہیں، تمام ہندوستان جانتا ہے۔ آپ کی پہلی تصنیف شرح دیوان غالب وہ معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس نے غالب جیسے نکتہ سنج فلسفی کے کلام کو عام فہم اور سلیس بنا دیا۔ ورنہ وہ دن بھی یاد ہیں جبکہ مرزا صاحب کے اشعار رسایل و اخبارات کے ذریعہ مذہبی مسائل کی طرح علمائے ادب کے آگے پیش ہوا کرتے تھے۔ علامہ ہی کی ذات تھی جس نے وہ شاگرد پیدا کئے تھے جو ہندوستان کی مایۂ ناز اور عدیم المثال ہستیاں خیال کی جاتی ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ آپ کے شاگردوں نے وہ جگہ

چھوڑی ہے کہ جسے آج تک ہندوستان میں کوئی پُر نہ کر سکا مثلاً مولانا عبد الحلیم شرر، مولانا ذہین مرحوم وغیرہ جنھیں مرتے دم تک اپنے ایسے استاد کی شاگردی پر ناز تھا۔ آپ کے شاگردوں میں جو صاحب اس وقت موجود ہیں ان کے علاوہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد، شہا وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مہاراجہ شاد بہادر کی نگاہ جوہر شناس نے کبھی علامہ مرحوم کے آگے اپنی شانِ امارت پیش نہ ہونے دی۔ چنانچہ جب کبھی علامہ مرحوم آپ کے پاس تشریف لاتے تو آپ تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوتے۔

علامہ مرحوم کی طبیعت میں قدرت نے شرافت کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھر دیے تھے۔ آپ کی محفل اسلامی مساوات کا نمونہ ہوتی تھی۔ آپ کی نظر، آپ کا اندازِ گفتگو، آپ کا طرزِ ملاقات، چھوٹے بڑے، ادنیٰ، اعلیٰ، امیر وغریب سب کے ساتھ بلا کسی لحاظ کے یکساں رہتا تھا۔ آپ اپنی بزم میں کبھی کسی کو یہ محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ اُس میں اور دوسروں میں کسی قسم کا فرق ہے۔ اخلاق ومروت کی یہ حالت کہ آپ خواہ کسی حالت میں ہوں اپنے ملاقاتیوں کو مایوس ہو کر واپس نہ جانے دیتے تھے۔ اور نہ ہی اپنی تکلیف کا کسی پر اظہار فرماتے۔ دادِ سخن میں بھی یہی جزو شرافت کارفرما رہتا۔ داد آپ ہر اس شعر پر دیتے جو دادخواہ ہوتا۔ خواہ وہ کہنے والا نومشق ہو یا پختہ کار شاعر۔ آپ کے مفید علمی ادبی مضامین رسائل وغیرہ میں شائع ہو کر خوب شہرت پا چکے ہیں۔ بالخصوص رسالہ زمانہ میں۔ باوجود ان مصروفیات اور ضعیفی کے بھی آپ نے حال تک رسالۂ مذکور کی قلمی اعانت فرمائی ہے۔ چنانچہ "غزل گوئی" اور اپنی خودنوشت سوانح حیات" اس کی شاہد ہیں۔

آپ کی نظموں کا ایک مجموعہ آج سے آٹھ دس سال پہلے "نظم طباطبائی" کے نام سے شائع ہو چکا تھا مگر حال میں ایک اور مجموعہ مکتبۂ ابراہیمیہ سے شائع ہو رہا ہے جس کی تقریباً تمام نظمیں ملکی جرائد میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ آپ کی مشہور و نادر تصانیف عربی زبان میں "تشریح الافلاک" اردو میں "دیوان امرءالقیس" اور "شرح دیوان غالب" ہیں۔ زمانہ حاضرہ کے اندازِ سخن پر بھی آپ نے طبع آزمائی کی تھی جس میں ایک انگریزی نظم (گریز ایلجی) کا ترجمہ "گورِ غریباں" اپنے انداز کی لاجواب نظم اور شہکار ہے۔

فنِ سخن میں بالخصوص علمِ عروض کی حد تک ہندوستان بھر میں آپکی ہستی عدیم المثال تھی۔ آپکی قصیدہ گوئی اور غزلگوئی اپنی خوبیوں کی آپ مالک ہیں۔ غرض یہ وہ جامع الکمال ہستی تھی جسکے اُٹھ جانے کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ خاکِ دکن آپکو لکھنؤ اور کلکتہ سے کھینچ لائی تھی جو اپنے میں پنہاں کر گئی۔ آپکی آخری آرام گاہ مرلی دھر کے باغ کے عقب میں واقع ہے جہاں ہندوستان کے اور بہت سے نامی گرامی علما، فضلا، شعرا وغیرہ تہِ خاک محوِ خواب ہیں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مولوی محبوب عالم صاحب مرحوم ایڈیٹر پیسہ اخبار

مولوی محبوب عالم صاحب مالک و بانی پیسہ اخبار لاہور جو ۲۰ مئی ۱۹۳۳ء کو تہتر سال کی عمر میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے ۱۸۶۳ء میں موضع بھرو کی ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے جہاں آپ کی نہیال تھی۔ آپ نے اپنا پہلا اخبار "ہمت" کے نام سے ۱۸۸۷ء میں جاری کیا جس کا موٹو "ہمتِ مرداں مددِ خدا" تھا۔ کچھ دنوں بعد مولانا نے مرحوم نے اس کا نام تبدیل کر کے "پیسہ اخبار" رکھدیا۔ اس اخبار کی اشاعت اس قدر بڑھی کہ وہ ہندوستان بھر میں اُردو کا ارزاں ترین اخبار مشہور ہوگیا۔ چونکہ اس ہردلعزیز اخبار کا سرورق سبز رنگ کا ہوتا تھا اس لئے اسے علمی حلقوں میں اکثر "خضر پوش" کہا جاتا تھا۔ یہ اخبار کئی مرتبہ ایک ایک لاکھ اور پچاس پچاس ہزار کی تعداد میں چھپا جو ایک ہندوستانی اخبار کے لئے یقیناً معراج ترقی ہے۔

۱۸۸۹ء میں پیسہ اخبار کا دفتر گوجرانوالہ سے لاہور منتقل کردیا گیا اور اپنے اولوالعزم ایڈیٹر کی قابلیت کی بدولت اس کی اشاعت میں بیش از بیش ترقی ہوئی۔ اس روزافزوں ترقی سے کاروبار کا حلقہ بھی وسیع ہوگیا اور اردو کی اخباری دنیا میں مولوی محبوب عالم کے نام کا سکہ جاری ہوگیا

چند دنوں کے بعد مولانا نے طبقۂ زمینداران کے حقوق کی حمایت وحفاظت اور ان کو فنِ زراعت، باغبانی اور پرورش مواشی کی تعلیم دینے کی غرض سے "رسالہ زمیندار، باغبان و بیطار" جاری کیا جو اپنی نوعیت کا اُردو میں پہلا رسالہ تھا۔ اسی طرح صنفِ نازک کے لئے آپ نے ایک ماہوار رسالہ "شریف بی بی" کے نام سے جاری کیا۔ اس پرچہ نے اس قدر ترقی کی اور اس کے ذریعہ سے طبقۂ نسواں میں بہت جلد درس وتدریس کا اس قدر شوق پیدا ہوا کہ ۱۸۹۵ء میں پیسہ اخبار کا ایک ایسا نادر ایڈیشن شائع کیا گیا جس کے تمام مضامین صرف خواتین کے لکھے ہوئے تھے۔

اسی سال آپ نے ایک ادبی رسالہ "انتخاب روزگار" جاری کیا جس نے کچھ دنوں بعد چولا بدلکر ہفتہ وار "انتخاب لاجواب" کی صورت اختیار کی، اور یہ رسالہ ابتک کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے، اور واقعی اسم بامسمیٰ ہے۔

مولوی محبوب عالم صاحب صورت شباہت میں کشیدہ قامت، جسیم اور وجیہ واقع ہوئے تھے۔ آپ کی صحت قابلِ رشک تھی۔ آپ کے چہرہ پر سفید اور بھری ہوئی داڑھی نہایت خوشنما اور شاندار معلوم

خندہ رو، شگفتہ پیشانی، خوش اخلاق، رحمدل اور ہمدردِ بنی نوع انسان تھے حسنِ اخلاق
جو شخص آپ سے ایک بار بھی ملاقات کرلیتا تھا ہمیشہ کے لئے آپکا گرویدہ ہوجاتا تھا
[illegible] غریب بھائیوں کو مدد ملتی تھی۔ ابتدا میں آپ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے
[illegible] بعد اس سے علیحدہ ہوگئے۔ مدت دراز تک آپ انجمن حمایت اسلام لاہور، انجمن
[illegible] پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی، پنجاب پبلک لائبریری اور بہت سی دوسری سوسائیٹیوں کے
ممبر رہے۔ آپ نے بہت سی اسلامی، تاریخی اور علمی کتابیں تصنیف و تالیف کیں بلکہ اس لحاظ سے آپ
کو پنجاب کا "بنجامن فرینکلن" کہا جائے تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔

پنجاب میں اُردو کا کوئی روزانہ اخبار نہ تھا، اس خیال سے متاثر ہوکر آپ نے ۱۶ مارچ ۱۸۹۷ء
سے "پیسہ اخبار" کو روزانہ کردیا۔ مگر ساتھ ہی ہفتہ وار پیسہ اخبار کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ۱۸۹۵ء میں
آپ نے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار "دی سن" (The Sun.) کے نام سے جاری کیا تھا لیکن یہ دو
سال بعد غروب ہوگیا۔ آپ نے بچوں کے لئے بھی ایک اخبار جاری کیا تھا جس کا نام "بچوں کا اخبار" تھا۔
مرحوم کئی زبانوں سے واقف تھے، اردو، فارسی، انگریزی، عربی، فرانسیسی، جرمن، ترکی، روسی وغیرہ
زبانوں میں بے تکلف نوشت و خواند کرسکتے تھے۔ چنانچہ اِن زبانوں کی کثیر التعداد کتابیں آپ کے کتبخانہ
میں موجود ہیں۔ فن صحافت میں آپ کو اس قدر کمال حاصل تھا کہ اُردو کے بیسیوں اخبار نویسوں نے آپ
ہی کی ماتحتی میں کام کرکے تکمیل فن کی۔ سید بشارت علی جالب مرحوم اڈیٹر "ہمدم" لکھنؤ و مالک و مدیر اخبار "ہمت"
لکھنؤ آپ ہی کے اسکول کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے۔ چنانچہ جالب صاحب مولانا کے کمالات کی اکثر تعریف
کیا کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں مولانا مرحوم پہلی مرتبہ یوروپ کی سیاحت کے لئے تشریف لے گئے۔ جنگ عظیم کے زمانہ
میں آپ نے عراق کی سیاحت کی، اور بعد ازاں مصر و ٹرکی وغیرہ کی سیر کرکے یوروپ کی سیاحت کی۔ اور ایک
نہایت دلچسپ سفرنامہ تحریر کیا جو اس قدر مقبول ہوا کہ اس کی چار ہزار جلدیں آناً فاناً فروخت ہوگئیں۔ آپ
صلح کل مذہب، مرنجاں مرنج مشرب اور اعتدال مسلک رکھتے تھے۔ افراط و تفریط سے آپ کی طبیعت نفور تھی
تعلیمی اور تعمیری کام کی طرف قوم کو ہمیشہ رغبت دلاتے رہتے تھے۔
اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کے مقتدر اخبار نویسوں کا ایک وفد انگلستان گیا جسے ملک معظم اور
ملکہ معظمہ نے قصر بکنگھم میں شرف باریابی عطا فرمایا، آپ کے علاوہ تین ہندو اور ایک یوروپین اخبار نویس بھی
اس وفد میں شامل تھے۔ ان حضرات کو جنگی بیڑے کی سیر کرائی گئی۔ لندن کے قابل دید مقامات اور سرکاری

کمالات دکھائے گئے، ہوائی جہازوں اور جہاز سازی کے کارخانوں، جنگ عظیم کے محاذات اور سرحدات کا معائنہ کرایا گیا۔

مولوی محبوب عالم اس قدر محنتی تھے کہ چالیس برس تک روزانہ چودہ گھنٹہ دماغی کام کرتے رہے پچھلے چھ سات سال آپ نے اخبار نویسی چھوڑ دی تھی، اور دماغی محنت بھی کم کردی تھی تاہم آپ اس عرصے میں سلاطین اسلام کی ایک مبسوط اور معتبر تاریخ لکھنے میں مصروف رہے جس کے لئے آپ نے مشہور و معروف مورخین کی تمام کتابیں مہیا کرلی تھیں، یہ کتاب "اسلامی بے تعصبی" کے نام سے مکمل ہو کر پریس میں دیدی گئی ہے اور اب جلد ہی شائع ہونیوالی ہے۔

آپ ہر روز صبح کے وقت چار پانچ میل چہل قدمی کیا کرتے تھے مگر وفات سے چند روز قبل بوجہ ناسازی مزاج یہ معمول چھوٹ گیا تھا۔ بخار کی شکایت ہوئی تھی جسے لاہور کے بہترین معالج بھی رفع نہ کرسکے۔ بالآخر آپ نے ۲۷ مئی کو دس بجے دن کے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور رہ گرائے عالم بقا ہوئے۔ آپ نے ایک بیوہ تین لڑکے، تین لڑکیاں اور ایک سرسبز اور ترقی یافتہ کارخانہ اپنی یادگار چھوڑا ہے خدا غریق رحمت کرے۔

مادہ تاریخ وفات منشی محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔ اے اسسٹنٹ ایڈیٹر زمانہ نے منشی محبوب عالم صاحب کی وفات حسرت آیات پر ایک برجستہ تاریخ کہی ہے جو ہدیہ ناظرین ہے۔ اس کے مصرعہ ثانی سے تاریخ نکلتی ہے۔

رفت از دار فنا حاجی و سیاح دیار
صاحب جود و کرم مالک پیسہ اخبار

۸۰۴ ۷۷ ۹۱ ۲۷۹

۱۳۵۲ھ

تیری یاد

برف کے ٹکڑے گرمی سے پسیجنا بھول جائیں، موم کے ٹکڑے آگ سے پگھلنا بھول جائیں لیکن اے جان! میں تیری یاد نہیں بھول سکتا۔

کلی پر فدا ہونیوالے مست اور سیاہ بھونرے بھنبھنانا بھول جائیں۔ پرتوں پر کوئلیں کوکیں لگانا بھول جائیں۔ لیکن اے گلشن امید! میں تیری یاد نہیں بھلا سکتا۔ جنگل میں مست ہرن چوکڑی بھرنا بھول جائیں لیکن اے محبوب میں تیری یاد نہیں بھلا سکتا۔ بوستانوں میں ننھی ننھی کلیاں چٹکنا بھول جائیں۔ خوشنما نرم و نازک پھول بھینی بھینی خوشبو سے مست بنانا بھول جائیں۔ ریتلی زمین کے ذرے چمکنا بھول جائیں لیکن اے جان تمنا! میں تیری یاد نہیں بھلا سکتا۔

(ماخوذ)

عالمِ نسواں

صوبجات متحدہ میں ابتک پانچ خاتونیں آنریری مجسریٹ مقرر ہو چکی ہیں۔ الہ آباد میں مسز پرہلاند جی بنارس میں مسز سجیوا راؤ، لکھنؤ میں مسز احمد شاہ، مین پوری میں مسز اے. بی. ٹامس، اور ایٹہ میں مسز رادھا پیاری ماتھر۔

صوبجات متحدہ کی اڑتالیس ڈسٹرکٹ بورڈوں میں سے چونتیس بورڈوں میں ایک ایک خاتون کو گورنمنٹ نے ممبری کے لئے نامزد کیا ہے۔ اسی طرح ۷۹ میونسپل بورڈوں میں سے پینتالیس بورڈوں میں خواتین ممبر منتخب یا نامزدہ حیثیت سے موجود ہیں۔

ریاست میسور کی اسمبلی نے مجلس قانون ساز میسور کے ایوان اعلیٰ کے لئے چار عورتوں کو بحیثیت ممبر نامزد کئے جانے کی سفارش کی ہے۔ اس اسمبلی میں حکومت کی طرف سے اس مطلب کا مسودۂ قانون بھی پیش کیا گیا تھا کہ ہندو عورتوں کو موروثی جائداد ملنے کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ تین خواندگیوں کے بعد یہ مسودہ اتفاق رائے سے پاس ہو گیا ہے۔

پونا میں تعلیم نسواں کے متعلق جو یونیورسٹی قایم ہے اس کے گذشتہ جلسہ تقسیم اسناد میں مسز سوبارا وان نے گریجویٹ خواتین کو خطاب کرتے ہوئے ایک قابل قدر ایڈریس دیا جسمیں ممدوحہ نے فرمایا کہ ہندوستان کی عورتیں پبلک لائف میں حصہ لینا چاہتی ہیں تو انھیں لازم ہے کہ خیالات اور جذبات کے درمیان مناسب امتیاز قایم رکھیں آپ نے اس پر بھی زور دیا کہ ہندوستان کی عورتوں کو معاشرتی معاملات میں مغربی تہذیب کی رو میں بہ جانا چاہیئے۔ بلکہ استقلال کے ساتھ اپنے ملک کی دیرینہ روایات و خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے صرف انھیں طریقوں کو اختیار کرنا چاہیئے جو اُن کی اور وطن کی ترقی کے لئے واقعی مفید ہوں۔ آپ کی رائے میں ملک کی تعلیم یافتہ خواتین کو ماضی و حال دونوں کی اعلیٰ خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے ایسا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے جس سے وہ اپنی پسماندہ اور خواب غفلت میں مبتلا بہنوں کو بھی بیدار کرسکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ہم کو ملکی معاشرت میں بعض اصلاحات کی

اشد ضرورت ہے۔ لیکن جو باتیں ہماری قدیم تہذیب کے خلاف ہیں اُن کی کورانہ تقلید ترقی یا اصلاح نہیں کہی جا سکتی۔ آپ نے موجودہ نظام تعلیم میں فوری تبدیلی کی ضرورت بتاتے ہوئے فرمایا کہ امورِ خانہ داری کی تعلیم بھی نسواں کے نصاب میں داخل ہونا چاہیے۔ ہمکو امید ہے کہ ہمارے مصلحان اور اربابِ حل وعقد ان مفید مشوروں پر توجہ فرمائیں گے۔

بمبئی کونسل میں راؤ بہادر ایس۔ کے۔ بولے ایک مسودہ قانون پیش کرنے والے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ صوبہ بمبئی میں دیو داسیوں کی مذموم رسم کو ممنوع قرار دیا جائے۔ لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ ہند نے اس مسودہ کی پیشی کی اجازت دیدی ہے۔ صوبہ بمبئی میں لڑکیوں کو مندر کے لئے وقف کر دینے کا رواج عرصہ سے جاری ہے جس کے باعث وہ اپنی زندگی ہمیشہ کے لئے اخلاقی پستی میں بسر کیا کرتی ہیں۔ اور باقاعدہ شادی نہیں کر سکتیں۔

گورنمنٹ ہند نے اپنے دفاتر میں لیڈی کلرکوں کے لئے بھی گنجائش رکھی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ اسامیاں صرف غیر شادی شدہ یا بیوہ عورتوں کو دی جائیں گی۔ شادی ہونے پر ان لیڈی کلرکوں کو اپنی ملازمت سے مستعفی ہونا پڑے گا۔

ہندوستان میں خواتین کی دو "آل انڈیا" انجمنیں ہیں جن کی طرف سے راجکماری امرت کور۔ ڈاکٹر متھو لکشمی ریڈی" اور مسز شریفہ حامد علی جائنٹ سلیکٹ کمیٹی میں شہادت دینے کے لئے منتخب ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر متھو لکشمی کی رائے میں ہندوستان کی آزاد خیال عورتیں فرقہ واری ذہنیت کے خلاف ہیں خواہ وہ کسی صورت اور شکل میں ہو۔ اور جدید آئین میں اپنے لئے کوئی خاص تحفظات یا مراعات نہیں چاہتی ہیں اُن کی رائے میں دستور اساسی کی بنیاد مرد و عورت کی مساوات پر قائم ہونی چاہیئے۔

برٹش کامن ویلتھ لیگ کی سالانہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے راجکماری امرت کور صاحبہ نے فرمایا کہ اگر ہندوستان کی عورتوں کو قابل اطمینان بنا پر حق رائے دہی عطا نہ کیا گیا تو وہ ہندوستان کے معاشرتی اور تعلیمی حلقوں میں عمدہ خدمات انجام دینے کے موقعہ سے محروم ہو جائینگی۔ آپ نے فرمایا کہ ہندوستان کی عورتوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ہندوستان کو استحکام قومیت حاصل کرنے کا طریقہ بتائیں جس کے بغیر ملک میں امن و امان نہیں ہو سکتا۔ کانفرنس میں ہندوستانی خواتین کے مطالبات کی تائید و حمایت کی گئی۔

مس سیترائی بوس۔ایم۔بی۔ ہاؤس سرجن چت رنجن سیوا سدن زنانہ ہسپتال کلکتہ میونخ یونیورسٹی (جرمنی) سے ڈاکٹر آف میڈیسن کا امتحان پاس کرکے تشریف لائی ہیں۔آپ بچوں کے علاج معالجہ میں اسپیشلسٹ قرار دی گئی ہیں۔مس بوس نے جرمنی کے مختلف اسپتالوں میں بھی کام کیا ہے۔

پنجاب ہائیکورٹ کے فاضل جج جسٹس لال کی صاحبزادی مس شاردا جے۔لال نے امسال پنجاب یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔بی کا امتحان پاس کیا ہے۔آپ پہلی پنجابی خاتون ہیں جس نے یہ امتحان پاس کیا ہے۔

شریمتی سرلا دیوی آف اڑکل کو سنٹرل کو آپریٹیو بنک کٹک کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ہے۔آپ پہلی اڑیا خاتون ہیں جنھیں یہ عہدہ نصیب ہوا۔

خط وکتابت

بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ زمانہ کانپور

جناب من۔ میں نے اپنے مضمون "نستعلیق ٹائپ" میں جس ٹائپ کو ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کی جانب منسوب کیا ہے اس کا نمونہ مجھے یہ کہہ کر دیا گیا تھا کہ ممدوح اس کے موجد و مخترع ہیں۔ علاوہ بریں مسٹر قریشی نے بھی اثنائے گفتگو میں ظاہر کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہی کے سر اس کا سہرا ہے پھر جو کچھ میں نے اُن کی ذات مجمع الصفات کی جانب منسوب کیا ہے وہ سوء اتفاق سے مجھے جہاں ملا ایک ہی کاغذ پر چھپا ہوا ملا۔اس صورت میں اگر میں نے اسے موصوف کی فکر بکر کا نتیجہ سمجھا تو قابل مواخذہ نہیں ٹھہر سکتا۔اگر ممدوح اس کے انتساب کو ناپسند فرماتے تھے تو اس کی اشاعت کی روک تھام کرنی چاہئیے تھی۔

اس ٹائپ کا موجد کوئی ہو اس کی لسنبت جو کچھ میری فہم ناقص میں آیا میں نے عرض کر دیا۔ مجھے شخصیت سے نہ جب بحث تھی اور نہ اب ہے۔

سلیم جعفر

گورِ غریباں

(از منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی بی۔اے منشی فاضل)

عبرت کا سماں گورِ غریباں سے عیاں ہے ویرانۂ خاموش پہ بستی کا گماں ہے
خوابیدہ یہاں ہستیِ گم کردہ نشاں ہے گنجینۂ نایاب تہِ خاک نہاں ہے
جو زیست لئے رولے تھے گھر دھول ہوئے ہیں
گلچہرہ حسینوں کے یہیں پھول ہوئے ہیں

راحت کدۂ اہلِ جہاں ہے یہی منزل ہنگامۂ ہستی سے سکوں ہے یہیں حاصل
آراستہ گوشے میں ہے محفل تہِ محفل مہمانوں سے خالی کوئی جا ہوگی بمشکل
کھنچ کھنچ کے چلے آتے ہیں سبکی یہ روش ہے
حیرت ہے کہ اس خاک میں کس درجہ کشش ہے

آغوشِ زمیں خاک کے پتلوں سے ہے آباد ہر ذرہ ہے اک ہستیِ برباد کی رُوداد
ہر لحظہ ہے تاراج اجل عالمِ ایجاد پیش آتی ہے انجام میں سب کو یہی افتاد
شیرازہ عناصر کا بکھر جاتا ہے آخر
پیمانہ جو ہے عمر کا بھر جاتا ہے آخر

مٹی کے کھلونوں کا ہے گھر شہرِ خموشاں برباددوں سے آباد ہے یہ خطۂ ویراں
شاہوں کا تجمل ہے یہاں خاک بداماں اسرارِ نہاں ہستیِ فانی کے ہیں عریاں
مٹنے سے اماں کس کو تہِ چرخِ بریں ہے
جو نقش اُبھرتا ہے وہ پیوندِ زمیں ہے

غافل! یہ ہے انجامِ بقا بھر کے نظر دیکھ اس منظرِ دلدوز کو بادیدۂ تر دیکھ
کیا دیکھتا ہے دہر کے جلوؤں کو اِدھر دیکھ تجھ کو اسی منزل کا ہے درپیش سفر دیکھ
اس جادۂ پُرپیچ میں رکھ پاؤں سنبھل کر
عمر اپنی یہاں وقف پئے حسنِ عمل کر

پھول

(از جناب جی۔ این۔ فرحت کانپوری بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

آہ اے ننھی سی ہستی تجھ میں کیا شے ہے نہاں
تیرے حسنِ دلربا پر ہوتے ہیں کیا کیا گماں

تو سراپا حسن ہے اور حسن خوشبو ریز ہے
یعنی تیرا ہر نفس اک بادِ عنبر بیز ہے

تیری رنگینی میں ہیں کچھ طرفہ تر رنگینیاں
تیری جلوہ ریزیوں میں طرفہ حیرت خیزیاں

تو سراپا دل ہے جس میں درد لطف آمیز ہے
اہلِ دل کو تیری بیتابی بھی عبرت خیز ہے

تیرے اندازِ جنوں کا طور ہی کچھ اور ہے
تیری بزمِ مے کا لطفِ دور ہی کچھ اور ہے

نالۂ بلبل سے سینہ تک ترا صد چاک ہے
خوفِ رسوائی نہیں وہ عاشقِ بیباک ہے

نوک سے کانٹے کی کیا لذت چشِ سوزش ہے تو
لطفِ زخمِ دل سے صرفِ جوششِ کاوش ہے تو

تیرے سینے میں دفینہ دولتِ الفت کا ہے
یاسمن یا ہارِ سینہ بھی داغِ دل فرقت کا ہے

اپنا اندازِ تبسم کچھ دلِ بلبل سے پوچھ
لطف جاں بخش تکلم کچھ دلِ بلبل سے پوچھ

باغِ عالم میں تری فطرت سراپا چشم ہے
دیکھنے کو منظرِ قدرت سراپا چشم ہے

نغمۂ توحید سننے کو ہمہ تن گوش ہے
گو کہ دنیا سے غلافِ برگ میں روپوش ہے

جوشِ فرطِ شوق سے پردے کو اپنے چاک کر
ہاں نکل آ باہر گھر سے کس کو تاک کر

اے کہ تو ہی باعثِ خوشنودیٔ طبعِ جہاں
اے کہ تیرے حسن سے ہے رونقِ کون و مکاں

اے کہ تو بزمِ جہاں میں ہے چراغِ ضو فشاں
اے کہ تیری ذات سے ہے رونقِ باغِ جہاں

ہے وجودِ حسن کا احساس تیری ذات سے
تیرا سینہ ہے مرصع گوہرِ جذبات سے

عاشقوں کے واسطے بھی تو سبق آموز ہے
با ہمہ صد چاکیٔ دل یوں جو لطف اندوز ہے

ہے تجھی سے بس دوبالا حسن لیلائے بہار
تجھ پہ سَو سَو ناز سے قربان ہو جائے بہار

تو نہ ہو گلشن میں تو بس منہ کی پھر کھائے بہار
دہر حسن افروز میں ہرگز نہ پھر آئے بہار

تیری ہستی پاک ہے اور پاک ہے تیرا وجود — شاخ گل پر تو رہا کرتا ہے سرمست سجود
کس کی الفت، کسکی فرقت کسکا تجھکو درد ہو — تیرا خالق ہے مگر وہ جس کا تجھکو درد ہے
دہر میں تیرے ہی دم سے لطفِ سوز و ساز ہے — اہل بینش کے لئے فرحت ترا انداز ہے
تو نہ ہو تو باغ عالم میں یہ عالم پھر کہاں — گریۂ بلبل کہاں اور جوشِ شبنم پھر کہاں
پھر کہاں یہ حسن پاشی پھر کہاں یہ دلبری — پھر کہاں یہ سحرکاری پھر کہاں افسوں گری
حسن کا چرچا نہ ہو اور حسن کی باتیں نہوں — وصل کی گھڑیاں نہوں اور ہجر کی راتیں نہ ہوں
بلبل و گل میں محبت کی بھی یہ گھاتیں نہوں — اور پھر دُنیا میں کیا ہو جبکہ یہ باتیں نہوں؟

تو خوشی کے وقت ہو گلدستۂ فرحت فزا — بزم میں ہوتا ہے تیرا جلوہ نکہت فزا
مندروں میں مسجدوں میں مقبروں میں بھی ہو تو — محفلوں میں گلشنوں میں اور گھروں میں بھی ہو تو
تجھکو ہندو مندروں میں لیکے جاتے ہیں سدا — تیری رنگینی سے خوش ہوتا ہے ان کا دیوتا
تو ہی تو ہے زلف بوسِ نوعروسانِ بہار — ہے تری رنگیں مزاجی سے عجب شانِ بہار
تو اگر عشرت کا ساتھی ہے تو عسرت کا بھی ہو — وصل کا حامی اگر ہے، دوست فرقت کا بھی ہے
ہاں وطن میں تجھ سے جب ہتی ہیں یہ سرگرمیاں — روزِ غربت میں بھی جب گھر آتی ہیں مایوسیاں
چھوٹنے لگتی ہے دنیا، چھوٹنے لگتے ہیں یار — غم بٹا سکتا نہیں جب کوئی اپنا غمگسار
سب دھرا رہتا ہے دنیا میں بجز رختِ سفر — روتے ہیں احباب آپس میں یہ عالم دیکھکر
پھر وہ ہندو ہو کہ عیسائی ہو یا ہو پارسی — گبر ہو، کافر ہو، مسلم ہو کہ لامذہب کوئی
تجھکو لے آتا ہے با رنج و محن عزت کے ساتھ — اور کر دیتا ہے بس زیبِ کفن عزت کے ساتھ

بزم عالم کے ہر اک کونے میں ہے جلوہ ترا — باغ عالم کے ہر اک گوشے میں ہے نقشہ ترا
تیری رنگینی ہے دنیا میں بہارِ جانفزا — تیری ہستی میں ہے اک درسِ فنا، رازِ بقا
تیری رگ رگ میں ہو پنہاں جانِ حسن و رنگ و بو — میں ہوں رہنِ عشق فرحت تو ہے جانِ آرزو
ہیں ترے اوراقِ رنگیں داستانِ آرزو — اے جہانِ آرزو، اے جانِ جانِ آرزو
تیری عزت ہر جگہ ہر وقت ہوتی ہے سدا — خواہ دردِ جاں گسل ہو، خواہ عیشِ جاں فزا
گل سے تو گلقند بنتا ہے مریضوں کے لئے — اور اُبل کر عطر بنتا ہے رئیسوں کے لئے

اے سراپا حسن! تو ہے باعثِ تحسینِ حسن　　اے ہمہ تن رنگ و خوبی تجھ سے ہی تزئینِ حسن
تجھکو مسلم لیکے جاتے ہیں مزاروں کی طرف　　پیشکش کے طور پر غفلت شعاروں کی طرف
تو ذریعہ ہے عجب تجدیدِ الفت کے لئے　　تو طریقہ ہے عجب اظہارِ عزت کے لئے
لالہ زاروں میں، چمن زاروں میں، بازاروں میں ہے　　دشت میں وادی میں ہی خاروں میں ہے غاروں میں ہے
زلف میں بالوں میں ہی، ہاتھوں میں ہے ہاروں میں ہے　　الغرض سارا جہاں تیرے گرفتاروں میں ہے
اہلِ دنیا پر نہیں محدود کچھ افسوں ترا　　ہے ازل سے والیِ فردوس بھی مجنوں ترا
باغِ رضواں کی ہے رونق تجھ سے اے رنگیں عذار　　حسن میں شعلہ ہے تو خوشبو میں ہے مشکِ تتار
تیری الفت بے گنہ تو میں گنہگاروں میں ہوں　　تو مسیحا ہے تو میں بھی تیرے بیماروں میں ہوں
تیری ہستی کس قدر مقبولِ خاص و عام ہے　　شاہ ہو یا ہو گدا ہر شخص تیرا رام ہے
قابلِ تقلید دنیا میں ترا انجام ہے　　تو رہینِ عیش ہے بیگانۂ آلام ہے

کاش ہوتا میں کسی کی ساعدِ رنگیں کا پھول　　اور پا جاتا کسی کے حسن سے حسنِ قبول
کس لئے مرہونِ رنج و غم ہے میری زندگی　　کاش میں بھی پھول ہوتا اور نہ ہوتا آدمی
ہر جگہ عزت مری ہوتی جہاں میں ہر جگہ　　عیش سے کٹتی مری کون و مکاں میں ہر جگہ
کاش پابندِ قیود و رنج و غم ہوتا نہ میں
یوں لہو کرتا نہ دل کو جان یوں کھوتا نہ میں

رباعیات فرحت

(از جی۔ این۔ فرحت کانپوری۔ بی۔ اے)

دل کو مست نگاہ کر دے ساقی　　کر دے ہاں! ہاں! تباہ کر دے ساقی
میری بخشش کو خود ہی رحمت دوڑے　　اتنا غرقِ گناہ کر دے ساقی

آنکھیں محوِ نگار کر دے ساقی　　ان میں کیفِ بہار بھر دے ساقی
میرے جذباتِ عشق بے معنی کو　　زینتِ دہِ حسنِ یار کر دے ساقی

شوہر
(مشرقی عورت کی نظر میں)

(از جناب جلیل قدوائی)

اے میرے رفیق، میرے والی
دنیا تھی بغیر تیرے خالی
راحت دنیا میں ہے تجھی سے
طاقت دنیا میں ہے تجھی سے
الفت کا ہے راگ تیرے دم سے
عورت کا سہاگ تیرے دم سے
دولت مجھ کو ملی ہے تجھ سے
عزت مجھ کو ملی ہے تجھ سے
تو مظہر بخشش و عطا ہے
تو مہر و وفا کا دیوتا ہے
پکھراج کا رنگ گل کی بو ہے
جو کچھ ہے مرے لئے سو تو ہے
فطرت میں تری جفا کشی ہے
ہڈی فولاد کی بنی ہے
خو ہے تری جفائیں سہنا
منہ سے لیکن نہ کچھ بھی کہنا
آتا نہیں تجھ کو قدر کھونا
قیمت میں ہے اشرفی کا سونا
میری خاطر ہے شاد و ناشاد
میری خاطر ہے خانہ برباد
باہر تجھکو ہزار کلفت
گھر میں لیکن مری ہے الفت
ہونٹوں کو بھی اپنے گو سیئے تو
میرا ہی دھیان ہے لیئے تو
میں نے ترے قلب کو جو چیرا
نکلا اس میں سے ایک ہیرا
اس راز کے لطف کو جو سمجھے
تیرے لئے اپنی جان دیدے
کر جاتے ہیں کام کرنے والے
مرجاتے ہیں تجھ پہ مرنے والے

میں خاک کے ڈھیر میں پڑی تھی
تو نے مجھے قلب میں جگہ دی
مٹی سے بھی کم تھی میری توقیر
تو نے جو چھوا ہوئی میں اکسیر

کنکر کو نگیں بنا کے شاہا — تو نے اُسے تاج میں لگایا
میں باغِ جہاں میں خام پھل تھی — گرمی سے تری ہوئی رسیلی
تھی ایک کلی، جو تو نے چوما — اللہ نے مجھ کو گل بنایا
تھا پردۂ دل میں جو سویدا — اس میں ہوئی اک چمک ہویدا
باتوں میں ہوا جو راگ پیدا — سینے میں ہوئی اک آگ پیدا
میں نے جو سنیں تری صدائیں — آئیں مجھ میں نئی ادائیں
سچ کہتی ہوں تجھ سے میرے راجا — میں تھی گویا خموش باجا
نغمے تھے چھپے ہوئے حیا میں — اب گونج رہے ہیں جو فضا میں
تیری فرقت میں کیوں نہ پیارے — چل جائیں دل و جگر پہ آرے
کیوں کر نہ کہوں تجھے میں سیاں — مضطر ہیں ترے لئے دل و جاں
تو قلب و جگر کا ہے سہارا — چھٹنے کا نہیں ہے تجھ سے یارا
کیا بھاگ تھے میرے واہ۔ سوامی — مجھکو جو ملی تری غلامی
ہر چند کہ میرے پاس کیا ہے — جو کچھ ہے مرا وہ سب ترا ہے
یہ شان یہ آن بان صدقے — ہے تجھ پہ یہ میری جان صدقے

الفت مجھے اپنی تو نے کیا دی
دنیا مجھ کو نئی دکھا دی

بے ثباتیِ دنیا

(از جناب جی۔ این۔ فرحت کانپوری۔ بی۔ اے)

گرم بازاری جوانی دیکھی — محفلِ عیش و کامرانی دیکھی
آنکھ جھپکی تو رنگِ محفل غائب — بے ثباتیِ دہرِ فانی دیکھی

دریا میں حباب کی صفائی دیکھی — خوب آب و ہوا کی آشنائی دیکھی
ہاں ہاں! تھا ابھی یہیں ابھی ہے غائب — دیکھی ہستی کی بے وفائی دیکھی

نو گرفتارِ محبت

(از شفیق الرحمٰن خانصاحب شفیق رامپوری)

میں بھی انکارِ زمانہ سے کبھی آزاد تھا   ہمنشیں تھے، عیش تھا، دنیا میں میں بھی شاد تھا
کچھ دنوں پہلے نہ میں یوں واقفِ فریاد تھا   آج ویرانہ ہے کل میرا بھی گھر آباد تھا

شادمانی تھی خوشی تھی عیش تھا کچھ غم نہ تھا
دیدۂ خوں بار اشکوں سے کبھی پرنم نہ تھا

تھا وقارِ شخصیت میرا بھی دنیا میں کبھی   دیکھتے تھے مجھ کو عزت کی نظر سے آدمی
دوستوں سے رات دن رہتی تھی باہم دل لگی   جب ہنسی بے ساختہ آتی تھی تو رکتی نہ تھی

امتیازی شان حاصل تھی زمانے میں مجھے
دیکھتے تھے رشک کی نظروں سے سب چھوٹے بڑے

یک بیک کچھ اس طرح بدلی زمانے کی ہوا   یعنی اک کافر کا پیکانِ نظر دل پر پڑا
جس کا درماں ہی نہ ہو وہ درد پہلو میں اٹھا   بیٹھے بیٹھے مفت میں مرنے کا ساماں ہو گیا

مونس و غمخوار جو تھے دشمنِ جاں ہو گئے
یا الٰہی کیا ہوا، یہ کیسے ساماں ہو گئے

اک ستمگر فتنہ پرور سے محبت ہو گئی   جیتے جی کے واسطے مرنے کی صورت ہو گئی
خوبیِ تقدیر سے راحت مصیبت ہو گئی   الفتِ جانکاہ گویا عین فطرت ہو گئی

سوزِ غم سے دفعتاً سامانِ راحت جل گیا
کل جو دل عشرت کدہ تھا آج ہے ماتم کدا

نشۂ عشرت سے نیامت ہی میں نوحہ خواں   نام اک کافر کا ہے آٹھوں پہر وردِ زباں
اف ری گرمیِ محبت سوزِ پنہاں الاماں   ایسی کچھ حالت ہے جس کا غیر ممکن ہو بیاں

مٹ گئیں دلچسپیاں سرمایۂ دل مٹ گیا
مختصر یہ ہے کہ جینے کا مزہ جاتا رہا

جھولا

(از جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی)

آئی آئی گھٹا سہانی   امرت سا برسانے پانی
نیل آکاش پہ رتن جڑے ہیں   چاندی کے سے پھول پڑے ہیں
کالی گھٹا نے گھر کر گھیرا   چاند سے منہ پر پانی پھیرا
چمک چمک کر رہ گئے تارے   گھٹا سے مدھم پڑ گئے سارے
پڑا ہے پالے چاند گھٹا کے   دیکھ رہی ہے گھٹا بڑھا کے
آئی جو یہ گھٹا نہ آتی   تارے گن گن رین بتاتی

رم جھم رم جھم بادل برسے   بوند بوند کو چاتک ترسے
بجلی نے پھر جوت جگا دی   پانی میں وہ آگ لگا دی
چھوڑو چھوڑو رام کہانی   ایسے سمے میں آنا کانی
جاؤ جاؤ بھر بھر لاؤ   کون سنے گا سر نہ کھپاؤ

بیری پپیہا کیا نٹ کھٹ ہے   پی کی رٹ ہے پی کی رٹ ہے
ڈالی ڈالی ڈول رہا ہے   کانوں میں امرت گھول رہا ہے
کالی کوئل بول رہی ہے   اڑنے کو پر تول رہی ہے
دیکھ کے ساڑی دھانی دھانی   دھان ہوئے ہیں پانی پانی
گھٹا گئی ہے روتی دھوتی   بہا گئی ہے گھاس پہ موتی
ہری بھری ہے سر پھلواری   پھولی پھلی ہے کیاری کیاری
ڈالی ڈالی آم لگے ہیں   پیڑوں ہی پر دام لگے ہیں

آؤ سکھی ری جھولا ڈالیں
باغ میں چل کر پینگ بڑھالیں

له ایک جانور جو [illegible]
له پپیہا

پجاری کا سپنا

(از سید مقبول حسین احمد پوری بی-اے)

سنکھ اور گھنٹا خوب بجا کر — رین بھجن مندر میں گا کر
تھالی میں پرشاد لگا کے — ٹھاکر جی پر بھوگ چڑھا کے
مندر تھا سنسان اکیلا — چاروں طرف خوشبو کا ریلا
دھرم پجاری نیند سے اونگھا — کشٹ مٹا پوجا کا سارا
دیکھا اس نے نیند میں سپنا — "جیسے میں ہوں لڑکا چھوٹا"
گردھر جی کی مورت دیکھی — پیاری پیاری بُوا جیسی
گود میں لے کر خوب کھلایا — منہ چوما اور کنٹھ لگایا
پیار سے کاندھے پر بٹھلایا — ہاتھوں ہاتھوں خوب جھلایا
ہاتھ سے چھوٹی بھاری مورت — ٹوٹی، بگڑی، پیاری صورت
غم سے وہ رویا چلایا — سپنے ہی میں شور مچایا
آنکھ کھلی تو دھیان میں آیا — یہ تو تھی سپنے کی مایا
لیکن دیکھا کوئی کھڑا ہے — سیس سے کرنیں چھوڑ رہا ہے
چہرہ چمک رہا ہے پیارا — روشن جس سے مندر سارا
ڈر سے خوب پجاری کانپا — اٹھتے اٹھتے تھر تھر کانپا
ڈر نہیں میں گردھر جی ہوں — میں وہ سپنے کا ساتھی ہوں
کیوں روئے تم مجھ سے بولو — مجھکو دیکھو آنکھیں کھولو
میں آیا ہوں مجھ سے کھیلو — اپنے ٹھاکر کو پھر لے لو
کھیل پریم کا سب سے پیارا — لو تم جیتے اور میں ہارا
پیار کرو کرتے تھے جیسے — سپنا اچھا اس جیتے سے
بھوگ نہ وہ مجھکو کاٹھ کا — سن لو میں ہوں پریم کا بھوکا

یہ سن چرنوں گرا پجاری!
"ہے ٹھاکر!! تم پریم بھکاری!!"

لطفِ سخن

(از حضرت عابد شاہجہاپنوری)

مجھے انجام سے بیگانہ کہئے ۔۔۔ یہ عالم ہے کہ اب دیوانہ کہئے
کھنچی تصویرِ ناکامی جبیں پر ۔۔۔ خموشی کو بھی اک افسانہ کہئے
ابھی ہے امتیازِ جیب و دامن ۔۔۔ اُٹھے یہ ہوش تو دیوانہ کہئے
صدائے بازگشت آتی ہے پیہم ۔۔۔ مرے ہر لفظ کو افسانہ کہئے
حرم کہتا ہے جس کو اک زمانہ ۔۔۔ کچھ آگے بڑھیئے تو بت خانہ کہئے
ہر آہِ سرد اک شرحِ خلش ہے ۔۔۔ یہاں سے راز کو افسانہ کہئے
شناسائی یہ عالم ہے لئے دل ۔۔۔ کہ چشمِ شوق کو بیگانہ کہئے
اک افسانہ مری وارفتگی ہے ۔۔۔ زمانہ کہہ اُٹھا دیوانہ کہئے
ہوا کے رخ پہ ہر ذرہ تھا دل کا ۔۔۔ اب آگے اور کیا افسانہ کہئے
دلِ مضطر وہ سرگرمِ وفا ہے ۔۔۔ کہ مٹنے پر بھی اک پروانہ کہئے
مئے کوثر ملی جنت میں عابد ۔۔۔ یہاں تک سرخدِ میخانہ کہئے

(از حضرت نیّر کاکوروی)

سمجھتا ہے دلِ ناداں کہ میں نے کب کیا کچھ ہے ۔۔۔ خدا جانے فرشتوں نے کہاں سے لکھ لیا کچھ ہے
نگاہِ ناز کہتی ہے ترا دل کیا کریں لیکر ۔۔۔ نہ اس میں جان ہی باقی نہ ہمت حوصلہ کچھ ہے
وہ اس کوچے میں کیوں آئے جسے جاں اپنی دوبھر ہو ۔۔۔ وہی آئے جسے جینے کا اپنے حوصلہ کچھ ہے
لحد پر تم نہ آنا فاتحہ بھی تم نہ دلوانا ۔۔۔ بس اتنی یاد رکھنا اس کو ہم سے واسطہ کچھ ہے
سبھی ارماں ہوئے پورے سبھی تو حسرتیں نکلیں ۔۔۔ مگر جب دیکھئے اس دل میں باقی حوصلہ کچھ ہے
خطِ تقدیر تو بہ توبہ کیا تحریرِ دشمن ہے ۔۔۔ کہ ہر اک حرف پر دھوکا ہے کچھ کا لکھ گیا کچھ ہے

دو طرفہ ہے لپا اعمال نامہ اب کریں کیا ہم
فقط شانِ رحیمی سے اُسی کی آسرا کچھ ہے

مٹا دی فردِ میری داورِ محشر نے یہ کہکر
کریں کیا شافعِ محشر نے اس پر لکھ دیا کچھ ہے

دلِ دردآشنا کو کیا کوئی سمجھائے اے ناصح
محبت میں یہی ہوتا ہے یا اس کے سوا کچھ ہے

ہنسی کیوں آج اٹھلاتی ہوئی پھرتی ہے ہونٹوں پر
کلامِ حضرتِ مخمور[1] شاید سُن لیا کچھ ہے

وہ ایسی ویسی شے منہ سے لگاتے ہی نہیں تیتر
جنھیں جامِ مئے عرفاں کا چسکا پڑگیا کچھ ہے

(از جناب سید افتخار حسین صاحب افتخار۔ ڈسٹرکٹ وسشن جج کانپور)

بتوں سے مل کے دلِ بیوفا بھی کھو بیٹھے
خدا کا گھر تو گیا، کیا خدا بھی کھو بیٹھے

صنم کو چھوڑ کے ہم جائیں تو حرم میں مگر
ملی نہ راہ تو ہم تکدا بھی کھو بیٹھے

جب امتیازِ من و تو نہیں رہا باقی
خودی تو کھو گئی لیکن خدا بھی کھو بیٹھے

سوالِ وصل سے ہم کیا بتائیں کیا پایا
رہا سہا جو تھا وہ آسرا بھی کھو بیٹھے

تلاشِ حق میں چلے افتخار لے کے خودی
خدا تو مل نہ سکا ماسوا بھی کھو بیٹھے

(از جناب منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی۔ بی۔ اے،)

کیوں آرزوے وصل میں برباد ہوا ہے
کچھ وقت سے پہلے دلِ ناشاد ہوا ہے

پھر ابر اُٹھا، میکدہ آباد ہوا ہے
پھر کیفِ اثر گلشن ایجاد ہوا ہے

آفات کا پُتلا دلِ ناشاد ہوا ہے
سرتا بقدم عشق کی روداد ہوا ہے

ٹھنڈا تپِ غم سے دلِ ناشاد ہوا ہے
اُلٹا اثرِ گرمیِ فریاد ہوا ہے

غلطیدہ بخوں ہوں، ہمہ تن شکوۂ بیداد
جو زخم ہے شکلِ لبِ فریاد ہوا ہے

پھر میرے نشیمن کی تباہی کے ہیں ساماں
پھر سوئے گلستاں رخِ صیاد ہوا ہے

پیش آیا وہی، تھا جو رقم لوحِ جبیں پر
قسمت کا نوشتہ مری روداد ہوا ہے

اقرارِ وفا کا بھی کیا اس نے زبانی
کچھ اور اشاروں سے بھی ارشاد ہوا ہے

پیغامِ قضا ہے تری برگشتہ نظر بھی
اس تیر سے خونِ دلِ ناشاد ہوا ہے

آیا ہے تصور دلِ برباد میں تیرا
اُجڑا ہوا گھر خیر سے آباد ہوا ہے

فرق آیا نہ زینت میں کبھی بزمِ جہاں کی
برباد ہوا یا کوئی آباد ہوا ہے

نازیست ہے مختارِ عمل خاک کا پتلا
جب خاک ہوا ہستیِ برباد ہوا ہے

میں شادی و ماتم کے توازن سے ہوں واقف
آنکھیں بھی بھر آئی ہیں جو دل شاد ہوا ہے

[1] تخلص مہاراج رانا والی جھالاواڑ کا

یہ برق مرے حسنِ تخیل کا ہے اعجاز	ہر شعر مرا مستحقِ داد ہوا ہے

(جناب بابو شیام سندر لال صاحب برق بی۔اے۔ وکیل سیتاپور)

آپ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہے سودائی ہے	لوگ کہتے ہیں مجھے آپ کا شیدائی ہے
باغباں پر ہے، نہ بلبل پہ، نہ گلچیں پہ اثر	کون کہتا ہے جنوں خیز بہار آئی ہے
غم غلط کرنے کو فرقت میں بھی آجاتی ہے	زلف کی یاد رفیقِ شبِ تنہائی ہے
میں نے فریاد جو کی اُن کی گلی میں جاکر	سُن کے بولے کوئی دیوانہ ہے سودائی ہے
مرنے والے لبِ جاں بخش کا دم بھرتے ہیں	تیری ہر بات میں اعجازِ مسیحائی ہے
سربلندی ہے مری سر کا جھکانا میرا	موجبِ فخر و شرف ناصیہ فرسائی ہے
اس سے باہر ہوں میں ہرگز نہ وہ مجھ سے باہر	صفتِ قالب و جاں یار سے یکجائی ہے
اے جنوں خوب کیا سب سے مجھے تونے جدا	نہ تعارف ہے کسی سے نہ شناسائی ہے
برق اس دل کی تڑپ نے نہ کہیں کا رکھا	بڑھ کے بجلی سے ہمارا دلِ شیدائی ہے

(جناب سید دل محمد صاحب فضا گیلانی معاون بزم اقبال جالندھر شہر)

اس کے نقشِ پا کے ملنے کی ہیں راہیں خاص خاص	آشنائے راز ہیں اے دل نگاہیں خاص خاص
لطف کی بارش پہ قادر ہیں نگاہیں خاص خاص	ہمسرِ چرخِ بریں ہیں بارگاہیں خاص خاص
حامیِ مظلوم سے واقف نہیں اہلِ جفا	عرشِ اعظم کو ہلا دیتی ہیں آہیں خاص خاص
آشنا اس رہگذر کے ہیں فقط اہلِ نیاز	جادۂ اُلفت میں دیکھیں خانقاہیں خاص خاص
یہ رہے پیشِ نظر، سعیِ طلب سے بیشتر	منزلِ مقصود تک پہنچی ہیں راہیں خاص خاص
مرجعِ اہلِ نظر اُن میں سے ہے اِک طور بھی	شاہدِ مستور کی ہیں جلوہ گاہیں خاص خاص
ہم نے یہ مانا کہ وہ خود بیں ہے مانوسِ حجاب	دیکھ لیتی ہیں اُسے پھر بھی نگاہیں خاص خاص
دیر و کعبہ میں رہیں اے دل وہی ناکامیاں	ہم تو سنتے تھے یہ ہیں ملنے کی راہیں خاص خاص
اے فضا ہے خوبیِ الفاظ مرغوبِ عوام	حسنِ معنی تک پہنچتی ہیں نگاہیں خاص خاص

(از جناب چندر بھوشن سنگھ عاکف۔ گتون۔ جونپور)

نکلے نہ کیونکر آہ دلِ بیقرار سے	یارب کوئی جہاں میں جدا ہو نہ یار سے
مطلب خزاں سے کچھ ہے نہ مجھکو بہار سے	اِک آرزوے وصل ہے پروردگار سے
الفت کروں میں ترک دلِ بیقرار سے	ممکن نہیں کہ ہو یہ کسی جاں نثار سے

دینے لگا جو دل اُنھیں منھ پھیر کر کہا — "کیا فائدہ ہے مجھ کو دلِ داغدار سے"

صدقے ہوا، نثار کیا، دے رہا ہوں دل — اب اور کیا سوال ہے اس خاکسار سے

بعدِ فنا بھی دیکھیے تربت پہ جشن ہے — پوشیدہ قبر ہوگئی پھولوں کے ہار سے

(از شوکت تھانوی)

وہ بے خبر ہوں کوئی لاکھ عشوہ ساز رہے — نہ امتیاز رہا ہے نہ امتیاز رہے

نمازِ شوق رہے سجدۂ نیاز رہے — وہ جانِ عشق اگر بندگی نواز رہے

مقامِ ناز ہے میرے لئے جہاں ہوں میں — جہاں نیاز کی حد ہے وہاں نیاز رہے

کہاں سے لائے گا ساقی کوئی یہ ذوقِ سلیم — ہمارے بعد درِ میکدہ نہ باز رہے

بلا سے زندگیِ ہوش مختصر ہو جائے — مگر جنوں کا مرے سلسلہ دراز رہے

میں رندِ مست ہوں ساقی جو نیت ہی آئے — تو ہر نماز سے اچھی مری نماز رہے

مری جبیں کے لئے ننگ ہے یہ سجدۂ شوق — نیاز وہ ہے کہ ہر شے سے بے نیاز رہے

ہمیں تو کام ہے اک نشترِ نوازش سے — یہی سہی کہ ترا دردِ جاں گداز رہے

ترے سپرد ہوں اے ضبطِ ننگِ رسوائی — یہ آرزو ہے کہ مرگِ وفا بھی راز رہے

پلٹ دیئے مری ہمت نے عشق کے طبقے — جہاں نشیب رہا ہے وہاں فراز رہے

وہ گردشِ نظری چاہتا ہوں اے شوکت — کہ سر جہاں ہو وہیں آستانِ ناز رہے

(از جناب فرخ بنارسی)

کس طرح ترکِ مدعا کرتے — ہم فریبِ نظر کو کیا کرتے

دل کی دنیا تباہ کر ڈالی — اور تم مجھ پہ ظلم کیا کرتے

اس تغافل کا کچھ ٹھکانا ہے — عمر گزری ہے التجا کرتے

احترامِ گناہ مشکل ہے — ورنہ ہم روز اک خطا کرتے

جو دیا اُس نے اُسکی بخشش ہے — کچھ نہ دیتا اگر تو کیا کرتے

ابتدا داستانِ ہستی کی — یاد آتی تو انتہا کرتے

رو دیئے جب ستم کی حد نہ رہی — تیرے مجبور اور کیا کرتے

اُف رے مجبوریاں محبت کی — چپ نہ رہتے اگر تو کیا کرتے

ہوش منزل میں گم ہوئے فرخ — کاش غفلت کو رہنما کرتے

علمی خبریں اور نوٹ

روس کی بالشویک حکومت ماسکو میں ایک عظیم الشان کتب خانہ تعمیر کرا رہی ہے۔ جس پر کم و بیش نو کرور روبل (روسی سکہ) خرچ ہونگے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ دنیا بھر میں سب سے بڑا کتب خانہ ہوگا۔ اور اس میں نوے لاکھ کتابیں رکھی جائیں گی جن کا بیشتر حصہ روس کے سابق حکمرانوں کے کتب خانوں پر مشتمل ہوگا۔ گویا یہ کتب خانہ برٹش میوزیم اور پیرس لائبریری دونوں سے بڑا ہوگا۔ اس کتب خانہ میں سات ریڈنگ روم بنائے جائیں گے جن میں بیک وقت سات سو آدمی مطالعہ کر سکیں گے۔ سائنس کی تحقیقات کے لئے چوبیس کمرے علیحدہ ہونگے۔

شکر ہے کہ ایشیائی سلطنتیں بھی اپنے مشاہیر کی قدر افزائی کر رہی ہیں۔ چنانچہ ایران کے شاہ رضا شاہ پہلوی نے شاہنامہ کے مشہور آفاق مصنف فردوسی کے جدید مقبرہ کی تعمیر کا فرمان جاری کیا ہے۔ فارسی زبان کے اس زبردست محسن کا مقبرہ جو باب رواں کے قریب واقع ہے حوادث روزگار کا شکار ہوکر خراب وخستہ ہوگیا تھا اور اس کی دیواریں جگہ جگہ سے شق اور منہدم ہوگئی تھیں۔ لیکن اب شاہ موصوف کے حکم سے وزارت تعلیم ایران کے اہتمام سے مقبرہ کا اکثر حصہ از سر نو تعمیر ہو چکا ہے اور جو باقی ہے وہ بھی بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہونچ جائیگا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس مقبرہ کے چاروں طرف ایران کے نامور مشاہیر کے بڑے بڑے مجسمے نصب کئے جائیں گے جنھیں دیکھکر ایرانیوں کو بزرگان سلف پر فخر و مباہات کرنیکا موقع ملیگا۔

فرینڈس لائبریری شیلانگ (آسام) کی مجلس انتظامیہ نے اعلان کیا ہے کہ مندرجہ ذیل مضامین میں سے کسی ایک پر بہترین مقالہ لکھنے والوں کو بدرجات ذیل انعام دیئے جائیں گے۔ پہلا انعام پچاس روپیہ دوسرا تیس روپیہ۔ تیسرا بیس روپیہ اور چوتھا دس روپیہ۔ مضامین یہ ہیں (۱) سائنس اور مذہب کا تعلق۔ (۲) مشرقی اور مغربی تہذیب (۳) عورتوں کی آزادی کا مشرقی تہذیب پر اثر۔ (۴) انسانی زندگی کی خوشی کے اسباب۔ مضمون انگریزی یا اردو زبان میں ہونا چاہیئے۔

مشرق و مغرب کے ادبی مذاق اور قدر دانیٔ ادب کا فرق اس واقعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ حال میں شیکسپیئر کے ڈراموں کا ایک پرانا نسخہ امریکہ کے ایک قدر دان نے ساڑھے چودہ ہزار پونڈ میں خریدا ہے۔

ہندوستان میں آئے دن اخبار اور رسالے نکلتے ہیں، لیکن بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو چند ماہ سے زیادہ زندہ رہتے ہوں۔ ہندوستان کا سب سے بڑا اخبار بھی لاکھ تو در کنار پچاس ہزار کی اشاعت کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتا اس کے مقابلہ میں انگلستان کے مشہور اخباروں کی اشاعت ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) اخبار ڈیلی میل کی سترہ لاکھ ساڑھے پینتیس ہزار کاپیاں چھپتی ہیں۔ (۲) ڈیلی ہیرلڈ کی سترہ لاکھ۔ (۳) ڈیلی اکسپریس کی سولہ لاکھ ۷۰ ہزار۔ (۴) نیوز کرانیکل کی تیرہ لاکھ ۶۰ ہزار (۵) ڈیلی ٹیلیگراف کی تین لاکھ چار ہزار۔ (۶) ٹائمس کی سترہ لاکھ پچاسی ہزار۔ (۷) مارننگ پوسٹ کی ایک لاکھ تینتیس ہزار (۸) ایوننگ نیوز کی ۹ لاکھ ۴۳ ہزار۔ (۹) اسٹار کی چار لاکھ ساڑھے بانوے ہزار۔ ان کے علاوہ ہر یکشنبہ کو چھپنے والے ہفتہ وار اخبارات کی تعداد اشاعت حسب ذیل ہے:۔ (۱) نیوز آف دی ورلڈ ۳۴ لاکھ (۲) پیپل ۳ لاکھ (۳) امپائر نیوز پندرہ لاکھ ۳۵ ہزار۔ (۴) سنڈے اکسپریس دس لاکھ ۶۵ ہزار ۹۱۔ (۵) سنڈے ڈسپیچ دس لاکھ ۱۳ ہزار۔ (۶) سنڈے ٹائمس دو لاکھ پندرہ ہزار۔ (۷) آبزرور دو لاکھ دس ہزار (۸) سنڈے ریفری ایک لاکھ

---

۲۳ اپریل سنہ رواں سے مصطفیٰ کمال پاشا کی پارٹی کے پیپل کلب نے ترکی کسانوں اور دہقانوں کو تعلیم دینے اور روزمرہ واقعات سے باخبر رکھنے کے لئے ایک نیا ماہوار اخبار جاری کیا ہے جو ایک بہت بڑے پوسٹر کی صورت میں قسطنطنیہ سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں کل مضامین ترکی زبان اور لاطینی حروف میں شائع ہوتے ہیں، صاف، خوشنما اور رنگین چھاپا جاتا ہے۔ اخبار کے بائیں سمت مصطفیٰ کمال پاشا کی تصویر ہوتی ہے اور داہنی طرف ایک سکہ کی تصویر ہوتی ہے جو ابھی جاری نہیں ہوا۔ جس کے نیچے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے کہ "خراب مال بہت کم نفع بخش ہوتا ہے"۔ یہ پوسٹر شائع ہوتے ہی تمام دیہات اور قصبات کے نمایاں مقامات میں دیواروں پر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔

یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ میر محبوب علیخاں آصف جاہ سابق نظام دکن کے اُستاد اور وزیر نواب سرور الدولہ سرور الملک نے بمقام علیگڈھ انتقال فرمایا۔ مرحوم نے قرآن شریف کی ایک تفسیر انگریزی زبان میں مکمل کی تھی جسمیں یونانی۔ رومی اور دیگر زبان کی ریسرچ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ آپکی لاش دہلی میں لیجا کر دفن کیگئی۔

جلے کٹے و دیگر قسم کی زخم اور چوٹیں
زمبک سے بہت جلد اچھے ہو جاتے ہیں
کسی قسم کے جلے کٹے زخم اور چوٹ کے لئے زمباک کو بے کھٹکے استعمال کیجئے یہ حیرت انگیز مرہم
بہت جلد فائدہ پہونچاتا. زہریلے مادہ کو دور کرتا ہے تکلیف کو تسکین دیتا اور بیماری پیدا
نہیں ہونے دیتا ہے. زمباک نایاب جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے. نہایت بیش قیمت جراثیم کش
ہے. یہ اُن کیڑوں کو ہلاک کرتا ہے جو خون میں زہر پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ سے. پھوڑا
پھنسی سوجن. خارش وچیاجن وغیرہ کی شکایت ہو جاتی ہے.
درد میں زمبک جادو کا اثر رکھتا ہے. اس کے لگانے سے خون بہنا
بند ہو جاتا ہے سوجن کم ہو جاتی ہے اور بہت جلد جسم پر نئی مضبوط
کھال نکل آتی ہے. اسکے استعمال کرنے سے
آرام ہو جانے کے بعد بدصورت دھبے
باقی نہیں رہتے.
جڑی بوٹیوں سے بنا ہوا
طلسمی مرہم
تمام دوافروشوں سے زمبک
ایک روپیہ فی شیشی یا سوا دو روپیہ
فی بکس ملتا ہے.
ایجنٹ: مسزر اسمتھ اسٹینس اسٹریٹ اینڈ کو
انٹالی. کلکتہ
ہر قسم کی حیوانی چربی سے پاک
زمبک
Zam-Buk

غدر کے بعد سے موجودہ زمانے تک کی
شاعری کی بسیط اور مستند تاریخ
جدید اردو شاعری
تصنیف
جناب عبد القادر صاحب سروری
عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد دکن)
قیمت مجلد تین روپیہ
بیوہ
اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات
لکھے گئے ہیں اور اُن کی ترغیبات کا ذکر کیا گیا
ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتی ہیں
اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی
کوشش کی گئی ہے کہ بیواؤں کو کس قسم
کی زندگی بہترین ہے۔
حجم ۲۵۰ صفحات قیمت ایک روپیہ
آج ہی فرمائش بھیجئے
ملنے کا پتہ
مینیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور
اس تکلیف دِہ کھانسی کو فوراً دُور کیجئے
سانس کے ذریعہ آرام پہونچانیوالی پیپس کی حیرت انگیز
ٹکیاں استعمال کیجئے
گلے میں سوزش پیدا کرنیوالی کھانسی یا زکام کا فوراً علاج کیجئے
شدید بیماریوں سے محفوظ رہنے کیلئے جن سے آپکے سینہ اور پھیپھڑوں
کو خطرہ ہے سانس کے ذریعہ آرام پہونچانیوالی پیپس کی ٹکیاں استعمال
کیجئے۔ ان ٹکیوں سے طاقتور شفا بخش اور جراثیم کش بخارے نکلتے
ہیں جو حلق اور سانس کی نالیوں پر براہ راست اثر انداز ہوتے
ہیں۔ کھانسنے سے گلے اور سینہ کی جو نازک جھلیاں
خراب ہوجاتی ہیں، پیپس کی ٹکیاں ان کو تسکین او-
آرام پہونچاتی ہیں اور حلق اور سینہ کے تمام نظام کو
مضبوط کر دیتی ہیں۔ الغرض پیپس کی ٹکیاں کھانسی زکام
نزلہ سوزش گلو وغیرہ کیلئے بہترین انسدادی اور شفا بخش دوا ہیں
تمام دوا فروش ایک روپیہ فی ڈبیہ فروخت کرتے ہیں۔
پیپس کی ٹکیوں پر چاندی کا ورق چڑھا ہوتا ہے۔
پیپس
Peps

منتخب کتابیں

تاریخ

تاریخ مغربی یورپ — عمر
تاریخ ہند قدیم — ۸ر
تاریخ الدولتین — عیر
تاریخ الامت (۷ حصے) — عـہ۱۲

سوانح

سیرت محمد علی — سے ر
تلاشِ حق (۲ حصے) — عـ/
حیاتِ حافظ — ۱۴ر
سیرۃ عمرو بن العاص — عہ
ٹالسٹائی — ۳ر
نمادماتِ خلق — ۱۰ر

ڈرامے

پردۂ غفلت — عہ ر
کھیتی — ۶ر
گناہ کی دیوار — ۸ر
صید زبوں — ۱۰ر

ادب

سیر المصنفین (دو حصے) — عمر
کیمیاگر (افسانے) — عہ
دیوانِ غالب (جرمنی) — عـ/
دیوانِ شیدا (”) — عـ/
انتخابِ میر — ۱۲ر
انتخابِ سودا — ۱۲ر
انتخابِ حسرت — ۱۲ر
نیرنگ (ادبی مضامین) — عہ/

متفرق

نفسیاتِ شباب — سے ر
آزادی (ترجمہ لبرٹی) — عیر
مشاہدات سائنس — عیر
ترکی جمہوریہ — عمر
اسلامی تہذیب — ۳ر
مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ — ۴ر
نہرو رپورٹ (مکمل) — عـ/

مکتبہ جامعہ۔ دہلی

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم بی۔ اے

جلد ۶۱	ستمبر ۱۹۳۳ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

تصاویر: (۱) بابو جگناتھ داس رتناکر مرحوم۔ (۲) سین گپتا مرحوم

[illegible]

بابو جگن ناتھ داس رتناکر مرحوم

جلد ۶۱ ستمبر ۱۹۳۳ء نمبر ۳

نظامی گنجوی

(از ملک محمد باقر نسیم رضوانی بی۔اے)

نام اور تخلص اس نامور شاعر کا نام بقول مولانا شبلی الیاس یوسف تھا۔ نظام الدین لقب اور تخلص نظامی تھا۔ اور ان کے والد کا نام موید تھا۔[1]

عبد النبی نے میخانہ میں انکا نام شیخ یوسف اور باپ کا نام موید بتایا ہے۔[2]

"اسم شیخ یوسف بن موید است"

لیکن مولانا نظامی کے ذیل کے شعر سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا نام الیاس تھا:۔

والیاس کالف بری ز لامش ہم بالو دو نه است نامش[3]

پروفیسر براؤن نے بھی مولانا نظامی کا نام الیاس اور اُنکے والد کا نام یوسف لکھا ہے۔[4]

ذیل کے شعر سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے باپ کا نام یوسف اور دادا کا نام موید تھا:۔

گر شد پدرم بہ نسبتِ جد یوسف پسر زکی موید[5]

---

[1] شعر العجم صفحہ ۲۹۹ مطبوعہ الناظر پریس ۱۹۱۶ء

[2] میخانہ عبد النبی صفحہ ۹ مرتبہ پروفیسر محمد شفیع صاحب۔

[3] خمسۂ نظامی (لیلےٰ مجنوں) صفحہ ۴ مطبوعہ مظفری پریس بمبئی ۱۳۱۲ء

[4] لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ جلد دوم مصنفہ ای۔جی۔براؤن۔

[5] خمسۂ نظامی صفحہ ۳۵

مولانا حافظ محمود شیرانی صاحب نے لکھا ہے کہ وہ بعض دفعہ اپنے آپ کو اویس بھی نظم کرتے ہیں
(ملاحظہ ہو اُردو جنوری ۱۹۲۶ء)

یارب تو مرا کا ویس نام — در عشق محمدی تمام
زاں جنبہ کہ محمدی جمال است — روزیم کن آنچہ در خیال است

(خمسہ نظامی ص ۴۰۵)

اس کی توجیہہ یہ کی جا سکتی ہے کہ یہاں پر مولانا نظامی نے اپنے آپ کو حضرت رسول کریم کے عشق کی نسبت سے اویس[۱] کہہ لیا ہے۔

تاریخ پیدائش و وفات | مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں "تفرش وطن ہے۔" (شعرالعجم ص ۲۹۹)

عبدالنبی مصنف میخانہ فرماتے ہیں:-

"در کتب معتبر چناں بنظر رسیدہ کہ مولد شریفش از گنجہ است، فاما والد امجد آں منبع فصاحت و بلاغت از قراہان قم است، چنانچہ ازیں بیت کہ در سکندر نامہ فرمودہ اند مفہوم میشود

اگر من چو گنجے بگنجہ گم — ولے از قراہان شہر قم

(میخانہ عبدالنبی مرتبہ پروفیسر محمد شفیع صاحب)

پروفیسر براؤن فرماتے ہیں کہ مولانا نظامی گنجہ میں پیدا ہوئے۔

(لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم)

اور میرے خیال میں یہ بیان صحیح ہے۔ کیونکہ مولانا نظامی نے کہیں بھی تفرش کو اپنا وطن نہیں بتایا۔ گو بعض لوگ مندرجہ ذیل اشعار سے یہ استخراج کرتے ہیں کہ ان کا وطن تفرش تھا:-

چو دُر گرچہ در بحرِ گنجہ گم — ولے از قہستان شہر قم
بتفرش دہی است تا نام او — نظامی از آنجا شدہ نام جو (مقدمہ خمسہ نظامی ص ۳)

مگر یہ اشعار اور میخانہ کا شعر موجودہ سکندر ناموں میں کہیں نہیں ملتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا نظامی کا مولد و مسکن گنجہ تھا۔ جیسا کہ وہ بارہا اس کا ذکر کرتے ہیں۔

نظامی کہ در گنجہ شد شہر بند — مباد از سلام تو نا بہرہ مند
(خمسہ نظامی (سکندر نامہ) ص ۱۲۱)

---

[۱] حضرت اویس کے متعلق روایت ہے کہ آپ حضرت رسول کریم کے غائبانہ معتقد تھے، اور جب آپکو خبر ملی کہ جنگ اُحد میں آنحضرت کا ایک دانت شہید ہوا ہے تو آپ نے وفور عقیدت سے اپنے تمام دانت نکال دیئے تھے۔

مولانا نظامی کی تاریخ ولادت کی اطلاع صحیح طور پر کہیں سے نہیں ملتی۔ اور مختلف تنقید نگاروں نے اُن کی تاریخ وفات مختلف لکھی ہے۔ تذکرہ دولت شاہی میں اُن کا سن وفات ۵۷۶ھ، آتشکدہ میں ۵۸۸ھ، جہاں آرا میں ۵۹۰ھ، کشف الظنون میں ۵۹۶ھ، صبح صادق میں ۶۰۲ھ، تقی کاشی نے ۶۰۶ھ اور میخانہ میں ۵۰۲ھ دیا ہے۔

چونکہ مولانا نظامی کی ایک تصنیف شرفنامہ ۵۹۶ھ میں مکمل ہوئی تھی، اور چونکہ عام تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ وہ ترسٹھ ۶۳ سال کی عمر تک زندہ رہے اس لئے اس سے یہ استخراج کیا جاتا ہے کہ وہ ۵۳۳ھ میں پیدا ہوئے تھے، مگر یہ سب قیاس آرائی ہے، وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مندرجہ ذیل طریقہ سے اُن کی صحیح تاریخ ولادت معلوم ہو سکتی ہے۔ اُنھوں نے لیلیٰ مجنوں میں اپنی عمر اُنچاس ۴۹ سال بتائی ہے۔

زیں سحرِ سحرگہے کہ رانم مجموعۂ ہفت سبع خوانم (خمسۂ نظامی صفحہ ۱۰۱)

اور چونکہ لیلیٰ مجنوں ۵۸۴ھ میں ختم ہوئی ہے

کآراستہ شد بہ بہتریں حال در سلخ رجب بہ ثے و نادال

تاریخ عیاں کہ داشت با خود ہشتاد و چہار بعد پانصد (خمسۂ نظامی صفحہ ۲۰۷)

اِس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۵۸۴ - ۴۹ = ۵۳۵ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

بعض سکندر ناموں میں الملک القاہر عزالدین مسعود کی بھی تعریف کی ہے:۔

طرف دار موصل بفرزانگی قدرخانِ مشرق بمردانگی

سر سر فرازان و گردن کشاں ملک عزِّ دیں قاہرِ شہ نشاں (خمسۂ نظامی صفحہ ۲۵۷)

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ عزالدین مسعود کی تخت نشینی کے بعد بھی بقید حیات تھے۔ عزالدین مسعود اپنے باپ نورالدین ارسلان شاہ والیٔ موصل کی وفات کے بعد ۶۰۷ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نظامی ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں بھی موجود تھے۔

خاندان اور لواحقین | ان کی صغر سنی میں ہی اُن کے والد کی وفات ہوئی، اور اُن کی والدہ بھی جو کہ رئیسہ کرد تھیں عرصہ تک زندہ نہ رہیں۔ وہ اپنی والدہ کے متعلق فرماتے ہیں:۔

گر مادرِ من رئیسۂ کرد مادر صفتانہ پیشِ من مرد

غم بیشتر از قیاس خوردہ است گرداب فزوں ز قد مرد است (خمسۂ نظامی صفحہ ۲۰۹)

اُن کا ایک بھائی تھا جس کا نام قوامی مطرزی تھا بعض کا خیال ہے کہ مطرزی اُن کا چچا تھا:۔

"تذکرہ نویسانِ قدیم ہمہ شیخ را گنجوی نوشتہ اند و قوامی مطرزی را بعضے برادر بعضے عم آں جناب دانند" (مقدمۂ خمسۂ نظامی صفحہ ۳)

اُن کا ایک ماموں بھی تھا جن کا نام موصوف نے خواجہ حسن بتایا ہے، وہ اُن کے کفیل تھے اس لئے اُن کی وفات پر افسوس کرتے ہیں،

گر خواجہ حسن کہ خال من بود خالی شد لشکر و بالِ من بود (خمسۂ نظامی ص۲۰۹)

اُنھوں نے تین دفعہ شادی کی، مگر بد قسمتی سے ایک ایک مثنوی کے آغاز پر ایک ایک بیوی رہگرائے عالم جاودانی ہوئی جب خسرو شیریں شروع کی تو آپ ایک بیوی کا نوحہ یوں لکھتے ہیں:-

سبک رو چوں بُتِ خفچاق من بود گماں افتاد و خود کافاق من بود

ہمایوں پیکرے نغز و خردمند فرستادہ بمن دارائے دربند

چو ترکاں گشتہ سوئے کوچ محتاج بترکی دادہ رختم را بتاراج (خمسۂ نظامی ص۲۱۱)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیوی کنیز تھیں جو شاہ دربند نے تحفے میں دی تھی۔

جب لیلیٰ مجنوں شروع کی تو دوسری بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے۔

چو بر گنجِ لیلےٰ کشیدم حصار دگر گوہرے کردم آنجا نثار (خمسۂ نظامی ص۶۶)

شرفنامہ کے اختتام پر تیسری وفات پاتی ہیں۔

ملک بیشتر ز انکہ آزادہ بود ازاں بہ کنیزے مرا دادہ بود

ہماں مہر و خدمتگری پیشہ داشت ہماں کاردانی در اندیشہ داشت

پیادہ نہادہ رخش ماہ را فرس طرح کردہ بسے شاہ را

خجستہ گلے خونِ من خورد او بجز من نہ کس در جہاں مرد او

چو چشمم مرا چشمۂ نور کرد ز چشمِ منش چشم او دور کرد

ربا نیدہ چرخ آنچنانش ربود کہ گفتی کہ تا بود ہرگز نبود

بہ خوشنودیِ کاں مرا بود ازو چگویم خدا باد خوشنود ازو (خمسۂ نظامی ص۲۶۶)

اولاد میں صرف ایک فرزند محمد نامی تھا سب سے پہلے اس کا ذکر خسرو شیریں میں کرتے ہیں:-

ببیں اے ہفت سالہ قرۃ العین مقام خویشتن در قاب قوسین

منت پروردم و روزی خداداد نہ بر تو نامِ من نامِ خدا باد (خمسۂ نظامی ص۱۰۸)

جب لیلیٰ مجنوں لکھی گئی تو محمد چودہ برس کے تھے۔

آں روز کہ ہفت سالہ بودی چوں گل بچمن حوالہ بودی

اکنوں کہ بچاردہ رسیدی چوں سرو بااوج سر کشیدی (خمسۂ نظامی ص۲۰۰)

اوپر جیسا کہ لکھا گیا ہے لیلیٰ مجنوں ۵۸۴ھ میں ختم ہوئی تھی اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ محمد (۵۸۴ - ۱۴) ۵۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔

سوانح حیات | معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نظامی نے عمر کا اکثر حصہ تحصیل و اکتساب علم میں گذارا ہے۔ ملا عبد النبی لکھتے ہیں۔

"در آوانِ جوانی و عنفوانِ زندگانی اوقات صرف علوم نقلی و عقلی فرمودہ، تا در چہل سالگی باستسعادِ صحبت حضرت شیخ جمال الدین موصلی مستعسد گشت۔ خدمت آں سرِ دفتر اصحاب کرامت کردہ در پنجاہ سالگی بسلوک مشغول شدہ و چہل چلہ داشت تا رتبۂ خود را از ہمت اکسیر ریاضت بمرتبۂ اولیٰ رسانیدہ اند۔ چنانچہ دریں مصرع سکندر نامہ اشارت بدیں معنے فرمودہ اند۔

کہ چلہ چہل گشت و خلوت ہزار

اما مؤلف مخزن اخبار در تالیف خود آوردہ کہ حضرت شیخ ہفتاد چلہ داشتہ۔" (میخانۂ عبد الغنی ص۹)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظامی کی عمر کا کثیر حصہ ایک جگہ پر گذرا ہے۔ لیکن حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ وہ آدمی جسے فطرت کی طرف سے ایسا دماغ ودیعت ہوا تھا کسی طرح چالیس پچاس سال تک بیکار بیٹھا نہ رہا ہوگا (اُردو جنوری ۱۹۲۶ء) اور میرے خیال میں اُن کا یہ گمان بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ مثنوی مخزن الاسرار تقریباً چالیس سال کی عمر میں لکھی گئی تھی جس سے پتہ چلتا ہے کہ نظامی اس مدت سے قبل بھی اس تصنیف میں مشغول تھے۔

طبع کہ با عقل بدلاّلگیست منتظر نقد چہل سالگیست

تا بچہل سال کہ بالغ شود خرج سفرہاش مبالغ شود

یار کنوں باید ت افسوں بخواں در بن چل سالگی اکنوں بخواں

(خمسۂ نظامی ص۱۲۱)

نظامی کے کوائف حیات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے سوائے اس کے کہ اُن کا نقطۂ نگاہ دیگر شعراء کی نسبت اعلیٰ و ارفع تھا۔ اُنھوں نے بھی رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے کئی بادشاہوں کی مدح لکھی ہے۔ تاہم اُنھوں نے قصائدنگاری سے حتی المقدور گریز کیا ہے، اور بالعموم وہ خداوندان ارضی کی بارگاہوں سے دُور ہی رہے۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں "اس زمانے کے تمام بڑے بڑے سلاطین نے ان کی قدردانی کو

۱؎ لیکن ہفت آسمان میں دولت شاہی اور آتشکدہ کے حوالے سے مذکور ہے کہ نظامی اخی فرخ زنجانی کے مرید تھے

"و شیخ از مریدانِ اخی فرخ زنجانی بودہ" (میخانۂ عبد الغنی)

لازمۂ سلطنت سمجھا اور فرمائش کرکے ان سے اپنے نام پر کتابیں لکھوائیں............
سب سے پہلے جس کو یہ عزت نصیب ہوئی وہ بہرام شاہ تھا۔ نظامی نے مخزن اسرار ۵۵۹ھ میں اسی کے نام پر لکھی، اور صلے میں اس نے پانچ ہزار اشرفیاں ایک قطار شتر اور انواع واقسام کے بیش قیمت کپڑے بھیجے۔" (شعر العجم صفحہ ۲۹۰)

لیکن حافظ محمود شیرانی صاحب کو اس بیان سے اختلاف ہے۔ (اُردو جنوری ۱۹۲۶ء)

وہ فرماتے ہیں کہ "مخزن کے انعام کے متعلق سب سے قدیم وہ بیان ہے، جو ابن بی بی نے مختصر سلجوق نامہ میں دیا ہے۔ میں بجنسہ یہاں اس کو نقل کرتا ہوں۔

"ملک فخرالدین بہرام شاہ صاحب سیرت نیکو وعلو ہمت و فرط رحمت بود و در ایام پادشاہی او مملکت از زنجان در کمال خورسندگی بود و کتاب مخزن الاسرار را نظامی گنجہ بنام او کرد و بجذ منتش تحفہ فرستاد پنجہزار دینار و پنج سر استر راہوار جائزہ فرمود" (منقول از راحت الصدور مرتبہ ڈاکٹر محمد اقبال حاشیہ ص ۲۱)

انعام کی روایت نہایت عام ہے، لیکن میں نظامی کے ان بیانات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، جو شیرین خسرو میں محفوظ ہیں، اور گذشتہ بیانات کے بالکل منافی ہیں۔ فرماتے ہیں

چو عالی ہمتی گردن برافراز	طناب ہرزہ از گردن بینداز
بخورسندی طمع را دیدہ بردوز	زچون من قطرۂ دریائے آموز
کہ چندیں گنج بخشیدم بشاہے	وزاں خرمن نجستم برگ کاہے
ببے برگی سخن را راست کردم	نہ او داد و نہ من درخواست کردم
مرا زیں بس کہ پر کردم جہاں را	ولی نعمت شدم دریا و کاں را

(خمسہ صفحہ ۱۰۸)

مخزن کے بعد ہی شیریں خسرو تصنیف ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ مخزن کے صلہ نہ ملنے کی شکایت شیریں خسرو ہی میں کی جائیگی۔ اشعار بالا سے صرف یہی ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ بہرام شاہ نے کوئی صلہ نہیں دیا۔

تصنیفات | اُن کی تصنیفات کا مجموعہ ایک دیوان اور خمسہ پر مشتمل ہے، خمسے میں مندرجۂ ذیل پانچ مثنویاں ہیں۔

(۱) مخزن الاسرار

مخزن الاسرار ۵۶۳ھ میں زیر تصنیف تھی کیونکہ اسمیں ملک فخرالدین بہرام شاہ کی مدح کی گئی ہے جس کا سن تاجپوشی ۱۱۶۷ء ۵۶۳ھ ہے۔[1]

[1] دیکھو Mohammadan Dynasties مصنفہ لین پول صفحہ ۱۵۳۔

شاہ فلک تاج سلیمان نگیں | مفخر آفاق ملک فخر دیں
نسبت داؤدی او کردہ جست | بر شرفش نام سلیماں درست
رایت اسحاق از و عالی است | مسندش اگر ہست سماعیلی است
یک دلہ شش طرف ہفت گاہ | نقطۂ نہ دائرہ بہرام شاہ (خمسۂ نظامی ص ۱۵)

یہ مثنوی ۵۷۲ھ میں ختم ہوئی تھی۔

بود حقیقت بہ شمار درست | بست و چہارم ز ربیع نخست
از گہ ہجرت شدہ تا ایں زماں | پانصد و ہفتاد و دو افزوں بر آں (خمسۂ نظامی)

بہت سے نسخوں میں آخری شعر یوں ملتا ہے۔

از گہ ہجرت شدہ تا ایں زماں | پانصد و پنجاہ و نہ افزوں بر آں

اس سے مولانا شبلی اور کئی دیگر تنقید نگاروں نے مثنوی کے اختتام کا سن ۵۵۹ھ قرار دیا ہے۔ مگر ۵۷۲ھ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مندرجہ بالا ثبوت کے علاوہ مولانا نظامی نے ۵۷۰ھ کا ذکر بھی اس مثنوی میں کیا ہے۔

پانصد و ہفتاد بس ایام خواب | روز بلند است بمجلس شتاب (خمسۂ نظامی ص ۹)

پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ کتاب ۵۹۱ھ (۱۱۹۵-۹۶ء) میں ختم ہوئی ہے۔ بجانے اُس نے یہ سن کہاں سے لیا ہے۔
مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ یہ مثنوی بہرام شاہ کی فرمایش پر لکھی گئی تھی۔ (شعرالعجم صفحہ ۲۹۰)
لیکن پروفیسر محمود شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ مولانا نظامی نے کتاب خود لکھی اور بعد میں بہرام شاہ کو پیش کر دی چنانچہ اس کی تائید میں وہ ذیل کا شعر پیش کرتے ہیں۔

بر ہمہ شاہاں ز پے ایں مجال | قرعہ زدم نام تو آمد بفال (خمسۂ نظامی ص ۱۱)

اور حقیقت بھی یہی ہے، اس کے علاوہ اس مثنوی کا کوئی صلہ بھی نہیں دیا گیا تھا جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے

چو عالی ہمتی کردن بر افراز | طناب ہرزہ از گردن بینداز
بجز رسندی طبع را دیدہ بردوز | ز چوں من قطرۂ دریائے آموز
کہ چندیں گنج بخشیدم بشاہے | وزاں خرمن نجستم برگ کاہے
بہ بے برگی سخن را راست کردم | نہ او داد و نہ من درخواست کردم
مرا ایں بس کہ پر کردم جہاں را | ولی نعمت شدم دریا و کاں را (خمسۂ نظامی ص ۱۰۰)

مخزن اسرار نظامی کی سب سے پہلی اور سب سے چھوٹی مثنوی ہے۔ اور دوسری مثنویوں سے اس کا رنگ بالکل جدا ہے اور بیشتر حدیقۂ سنائی کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس میں مختلف عنوانات کے تحت میں اخلاقی مسائل پر بحث کی گئی ہے، اور اُن کی توضیح بعد میں اخلاقی حکایات سے کیگئی ہے، اس میں ۲۲۰۰ اشعار ہیں۔" (مقدمہ خمسۂ نظامی صہ)

(ب) خسرو شیریں

خسرو شیریں ۵۷۶ھ میں ختم ہوئی۔

گذشتہ پانصد و ہفتاد و شش سال ۔۔۔ نزد بر خط خوباں کس چنیں فال

(خمسۂ نظامی صہ ۱۹۹)

بعض نسخوں میں "پانصد و ہفتاد و شش سال" کے بجائے "پانصد و پنجاہ و شش سال" (۵۶۹) ملتا ہے۔ مگر یہ غلط ہے، کیونکہ اس مثنوی میں طغرل بن ارسلان کی مدح کی گئی ہے جو ۵۷۳ھ/۱۱۷۷ء[1] میں تخت نشین ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۵۷۳ھ میں زیر تصنیف تھی۔

ملک طغرل کہ دارائے وجود است ۔۔۔ سپہر دولت و دریائے جود است

بسلطانی بتاج و تخت پیوست ۔۔۔ بجائے ارسلاں بر تخت بنشست

من ایں گنجینہ را درمے کشادم ۔۔۔ اساس ایں عمارت مے نہادم

(خمسۂ نظامی صفحہ ۱۵۴)

طغرل بن ارسلان کے ساتھ ساتھ ہی کتاب اتابک محمد کو پیش کی جاتی ہے وہ دو گانوں صلہ میں دیتا ہے۔ مگر سند کے تیار ہونے سے قبل ۵۸۱ھ میں فوت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا چھوٹا بھائی قزل ارسلان تخت نشین ہوتا ہے تو اُسے بھی یہ کتاب پیش کی جاتی ہے۔ قزل ارسلان ایک موضع حمدونیان انعام میں دیتا ہے۔

گرفت اندر کنار از دلنوازی ۔۔۔ بموئے چوں سلیماں کرد بازی

چو خوبا حمد و با اخلاص من کرد ۔۔۔ دہ حمدونیاں را خاص من کرد

بملو کی خطے دارم مسلسل ۔۔۔ بتوقیع قزل شاہی مسجل

(خمسۂ نظامی صفحہ ۱۹۱-۱۹۲-۱۹۳)

---

[1] عہد حکومت از ۵۷۳ھ/۱۱۷۷ء لغایتہ ۵۸۱ھ/۱۱۸۵ء بحوالہ Mohammadan Dynasties مصنفہ لین پول صفحہ ۱۰۱

[2] قزل ارسلان کی تاریخ وفات لین پول نے ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء دی ہے۔ Mohammadan Dynasties صفحہ ۱۷۱

نظامی کی خواہش تھی کہ ایک گاؤں سلطان سے مل جائے اور ایک شاہزادوں سے لے۔

یکے دہ زاں دودہ ،اداد باید خود از شہزادگاں دیگر کشاید

(خمسۂ نظامی صفحہ ۱۹۲)

مگر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دوسرا گاؤں بھی ملا یا نہیں۔ اس اثنا میں قزل ارسلان ایک شب اپنے بستر میں مقتول پایا جاتا ہے جامع التواریخ نے اس واقعہ کا سن ۵۸۷ھ بتایا ہے لین پول نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

خسرو شیریں ایک رومان ہے اس میں مولانا نظامی نے نفس مضمون اور طرز میں سنائی کے بجائے فردوسی کی پیروی کی ہے لیکن نظم رزمیہ نہیں۔ اس میں ۶۳۰۰ اشعار ہیں۔

(مقدمہ خمسۂ نظامی صفحہ ۲)

لیلےٰ و مجنوں

شبلی نعمانی اور ملا عبدالنبی کا خیال ہے کہ یہ مثنوی خاقان کبیر منوچہر کی فرمایش پر لکھی گئی تھی۔

(شعر العجم صفحہ ۲۹۵ - میخانہ صفحہ ۹)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب منوچہر کے بیٹے خاقان کبیر ابوالمظفر اخستان کی فرمایش پر لکھی گئی تھی۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار سے واضح ہوتا ہے۔

خاقانِ جہاں ملک معظم مطلق ملک الملوک عالم
صاحب جہت جلال و تمکیں یعنی کہ جلال دولت و دیں
تاج ملکاں ابوالمظفر زیبندۂ ملک ہفت کشور
شروان شہ آفتاب سایہ کیخسرو کیقباد پایہ
شاہ سخی اخستاں کہ نامش مہریست کہ مہر شد غلامش
بہرام نژاد و مشتری مہر دُرِّ صدف ملک منوچہر

(خمسۂ نظامی صفحہ ۲۰۴)

اس کے علاوہ یہ مثنوی ۵۸۴ھ میں ختم ہوتی ہے:-

در پانصد و ہشتاد و ہشت بر سر بگذشتہ ز ہجرت پیمبر
ہم فاتحہ ایش ہست مسعود ہم عاقبتیش باد محمود

(خمسۂ نظامی صفحہ ۲۹۱)

اور منوچہر کا عہد حکومت ۵۱۴ھ سے لیکر ۵۴۵ھ تک رہتا ہے۔ اور ۵۴۵ھ میں اخستان بن منوچہر سریر آرائے سلطنت ہوتا ہے۔ ۵۹۳ھ تک حکومت کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب کی تکمیل منوچہر کے عہد حکومت کے بعد ہوئی۔

یہ مثنوی ۵۸۴ھ (۱۱۸۸-۸۹ء) میں شروع کی گئی:-

آراستہ شد بہ بہتریں حال ۔۔۔ در سلخ رجب بہ ثا دفا دال

تاریخ عیاں کہ داشت با خود ۔۔۔ ہشتاد و چہار بعد پانصد (خمسۂ نظامی صفحہ ۲۰۴)

اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ مثنوی چار سال کے عرصہ میں یعنی ۵۸۸ھ میں ختم ہو جاتی ہے نظامی مثنوی کے لکھنے کے وقت ۴۹ سال کے تھے:-

زیں سحر سحر گہے کہ رانم ۔۔۔ مجموعۂ ہفت سبع خوانم

(خمسۂ نظامی صفحہ ۱۰)

یہ مثنوی بہت مقبول ہوئی ہے، بالخصوص اسے ایران، ترکستان اور ہندوستان میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے اشعار کا مجموعہ ساڑھے چار سو ہے۔ (مقدمہ خمسۂ نظامی صفحہ ۶)

(د) ہفت پیکر

مولانا شبلی کا خیال ہے کہ بہرام نامہ علاء الدین قزل ارسلان کی فرمایش پر لکھا گیا تھا (شعر العجم صفحہ ۲۹۶) مگر حافظ محمود شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ مثنوی مولانا نظامی نے اپنی خواہش سے لکھی اور ذیل کے اشعار اس کی تائید میں پیش کرتے ہیں:-

چوں من الحق شناختم بہ قیاس ۔۔۔ کابل فرہنگ را تو داری پاس

... ...

نقش ایں کارنامۂ ابدی ۔۔۔ بر تو بستم بطالع اسدی

(ہفت پیکر مطبوعہ نولکشور پریس ۱۳۱۲ھ صفحہ ۱)

یہ مثنوی ۵۹۳ھ (۱۱۹۶-۹۷ء) میں لکھی گئی تھی۔

از پس پانصد و نود سہ قراں ۔۔۔ گفتم ایں نامہ را چو نامہ وراں

۱؎ ملاحظہ ہو فلکی شیروانی مصنفہ ہادی حسن صفحہ (آغاز)

منوچہر ۵۱۴ھ ۔ ۵۴۵ھ

فرخ زاد ۵۹۳ھ — شاہنشاہ ۵۹۳ھ ۔ ۶۰۰ھ — اخستان ۵۴۴ھ ۔ ۵۹۳ھ

روز بر چار دہ ز ماہ صیام　　چار ساعت ز روز رفتہ تمام

(خمسہ نظامی صفحہ ۱۱۴)

اس مثنوی میں سامانی بادشاہ بہرام گور کی زندگی کے ایک رخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہرام گور کا باپ خورنق کے قلعہ میں سات معزز شہزادیوں کی تصاویر چھوڑ کر مرجاتا ہے۔ اور بہرام گور ان تصاویر کو دیکھکر ان پر شیدا ہو جاتا ہے، اور بعد میں کوشش سے ان سات شہزادیوں سے شادی کرتا ہے، یہ مثنوی چار ہزار سات سو ساٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ (مقدمۂ خمسہ نظامی صفحہ ۹)

(۳) سکندر نامہ

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ پروفیسر براؤن نے کس دلیل کی بنا پر سکندر نامہ کی تکمیل کا سن ۵۸۷ھ بتایا ہے۔ (لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم) لیکن ذیل کے اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۵۹۷ھ ۱۲۰۱-۲ء میں لکھی گئی تھی۔

نوا سے سرایم در ایام تو　　کہ ماند در اوسالہا نام تو

بتاریخ پانصد نود ہفت سال　　کہ خوانندہ راز دلگیرو ملال

نوشتم من این نامہ را در جہاں　　کہ تا دور آخر بود جاوداں

(خمسہ نظامی صفحہ ۲۵۰)

مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ نظامی نے یہ مثنوی خود لکھ کر ابو بکر نصرۃ الدین کی خدمت میں پیش کر دی (شعر العجم صفحہ ۲۹۶) لیکن حافظ محمود شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ یہ مثنوی ابو بکر نصرۃ الدین کی فرمائش پر لکھی گئی، اور اس کی تائید میں وہ مندرجہ ذیل اشعار پیش کرتے ہیں:-

چو فرمودہ بلنے آراستن　　سمن کشتن و سرو پیراستن

بسر سبزی شاہ روشن ضمیر　　بہ نیروئے فرہنگ فرماں پذیر

یکے سرو پیراستم در چمن　　کہ بر یاد اوے خورند انجمن

(خمسہ نظامی صفحہ ۲۵۵)

نشاط از تو وارد گہر سفتنم　　سزاوارتست آفریں گفتنم

خرد کآسماں راز میں میکند　　بریں آفریں آفریں میکند

چو فرماں چنیں آمد از شہریار　　کہ بر نام ما نقش بند ایں نگار

(خمسہ نظامی صفحہ ۱۲۹)

میرے خیال میں پروفیسر محمود شیرانی صاحب کا بیان مولانا شبلی کے خیال سے زیادہ صحیح ہے
مولانا شیرانی فرماتے ہیں کہ بعض سکندر ناموں کو ابوبکر نصرۃ الدین کے بجائے عزالدین مسعود کے نام کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے اور اس کی توجیہ یہ فرماتے ہیں کہ پہلے یہ مثنوی ملک عزالدین مسعود خلف قطب الدین مودود والی موصل (عہد حکومت ۵۷۶ھ ۱۱۸۱ء تا ۵۸۹ھ ۱۱۹۳ء) کے نام پر منسوب کی گئی۔ اور ملک عزالدین کی وفات کے بعد ہی کتاب نصرۃ الدین ابوبکر کی خدمت میں پیش کردی گئی، جس کا عہد حکومت ۵۸۷ھ ۱۱۹۱ء سے شروع ہوکر ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء میں ختم ہوجاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں بالترتیب ملک عزالدین مسعود اور ملک نصرۃ الدین ابوبکر کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔

ملک عزّدیں آنکہ چرخ بلند — بدو دادہ اورنگ خود را کمند
کشایندۂ راز ہفت اختران — ولایت خداوند ہشتم قران

(خمسۂ نظامی صفحہ ۱۳۳)

ملک نصرۃ الدیں کہ از داد او — خورد ہرکسے بادہ بر یاد او

(خمسۂ نظامی صفحہ ۲۴۹)

یہ مثنوی سکندر کے متعلق اُن تمام حکایتوں کا مجموعہ ہے جو مشرق میں مشہور ہیں۔ اِس میں کل اشعار دس ہزار ہیں

(مقدمۂ خمسۂ نظامی صفحہ ۶)

خصوصیات | مولانا نظامی انوری اور اسی نوع کے دیگر شعراء کے علی الرغم بہت خوددار واقع ہوئے تھے لیکن نہایت ہی خلیق اور بے ریا انسان تھے۔ عمر بھر کبھی شراب نہیں پی، چنانچہ وہ اس امر کی طرف ذیل کے اشعار میں اشارہ فرماتے ہیں:-

بپندار اے خضر فیروز پے — کہ از مے مرا ہست مقصود مے
ازیں مے ہمہ بیخودی خواستم — وزاں بیخودی مجلس آراستم
دگرنہ باّں روکہ تا بودہ ام — بمے دامن ولب نیالودہ ام
گرازمے شدم ہرگز آلودہ جام — حلال خدا بر نظامی حرام

(مقدمۂ خمسۂ نظامی صفحہ ۳)

---

۵۱ ملاحظہ ہو "اُردو" جنوری ۱۹۲۶ء

۵۲ ملاحظہ ہو Mohammadan Dynasties. مصنفہ لین پول صفحہ ۱۶۳

۵۳ ملاحظہ ہو Mohammadan Dynasties. مصنفہ لین پول صفحہ ۱۷۱

۵۴ چونکہ مولانا شبلی نعمانی نے نظامی کی خصوصیات کلام کافی وضاحت سے بیان کی ہیں اسلئے انکا اعادہ تحصیل حاصل سمجھا گیا۔

گو نظامی نے منوچہری، قوامی، معزی اور خاقانی کی طرز نگارش میں کلام کا بیشتر حصہ نظم کیا ہے، اور انھیں ہمیشہ تراکیب نادرہ اور مرصع عبارت سے لگاؤ رہا ہے لیکن اس کے باوجود اُن کی مثنویوں میں ایک جدت تھی اور وہ مثنویوں میں قصیدہ نگاری کا فن تھا۔ اس ایجاد کا سہرا اُن کے ہی سر ہے۔

فلاسفہ نے ہر ایک فن لطیف کا رب النوع تسلیم کیا ہے، نظامی بھی اُن کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ فن شاعری کے ودیعت کرنے والے کو مختلف حیثیتوں سے پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو،

مرا چوں ہاتفِ دل بود دمساز — بر آورد، از رواقِ ہمت آواز

(خمسۂ نظامی صفحہ ۵۰)

مرا خضر تعلیم گر بود دوش — برازے کہ آمد پذیرائے گوش

(خمسۂ نظامی صفحہ ۱۲۹)

ہمانا کہ آں ہاتفِ خضر نام — کہ خارا خنگاف است و خضر احترام

(خمسۂ نظامی صفحہ ۲۰۱)

ماں

مجھے ماں یاد نہیں،

مگر کبھی کبھی جب میں کھیلتا ہوں، ایک لے سی میرے کانوں میں گونجتی چلی جاتی ہے، گویا ماں کی باتیں میرے کھیل کے شور میں جاتی ہیں۔ ماں میرے گہوارے کو جھلاتے وقت گایا کرتی تھیں، ماں چلی گئی ہے لیکن جاتے جاتے اپنا گانا یہاں رکھ گئی ہے۔

مجھے ماں یاد نہیں،

مگر جب بہار میں پھولوں سے باغ بھر جاتے ہیں، تو شبنم سے بھیگے ہوئے پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔ تب معلوم نہیں ماں کی یاد کیوں میرے دل میں آتی ہے، ماں باغ سے جھولی بھر بھر کر پھول لایا کرتی تھی تاکہ مندر میں جاکر پھول چڑھائے۔ ماں کی پوجا کے پھولوں میں مجھے ماں کی خوشبو آتی ہے۔

مجھے ماں یاد نہیں،

مگر جب میں سونے کے کمرے میں جاکر بیٹھتا ہوں تو کھڑکی میں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو میرے دل میں یہ گذرتا ہے کہ گویا ماں مجھے تاک رہی ہے اور مجھے گود میں لیکر کہتی ہے "میرے لال میری طرف دیکھو" ماں اپنی نظر آسمان بھر میں رکھ گئی ہے

(ٹیگور)

جاپان میں بودھ دھرم

(از مسٹر گنگا چرن)

جاپان کا نام لیتے ہی ہمارے دل میں ایک ایسی قوم کا خیال آتا ہے جو بڑی دانشمند تہذیب یافتہ اور زمانہ ساز ہے۔ ہم کو یہ خیالات اس لئے آتے ہیں کہ اس قوم نے نہ صرف نہایت ہوشیاری سے اپنے آپ کو یورپ کے دستبرد ہی سے محفوظ رکھا بلکہ تھوڑے ہی عرصہ میں مغربی ممالک سے صنعت اور حرفت کا سبق سیکھ کر اُن کا نہایت کامیابی سے مقابلہ کیا۔ جاپان نے اپنی خود غرضی کی بدولت کوریا کو دبا رکھا ہے اور اِن دنوں غریب چین کے درپے ہے۔ ان تمام خیالات سے ہمارے دل میں جاپانی قوم کے لئے کوئی اُنس پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح کی نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

مگر جاپانی تہذیب کے بہت سے درخشاں پہلو بھی ہیں جن کی ہم کو تقلید کرنی چاہیئے جاپان کی حیرت انگیز ترقی کی تہہ میں جو اُس نے ایک صدی کے عرصہ میں کی ہے بودھ دھرم کی جیتی جاگتی طاقت ہے۔ اسی طاقت کی بدولت ہندوستانی ایک ہزار برس تک تہذیب کے میدان میں پیشوا بنے رہے۔ اور جس دن سے ہندوستان نے بودھ مت کے اصولوں سے انحراف کرنا شروع کیا اسی روز سے انکے تنزل کا آغاز ہو گیا۔

جاپان میں بودھ دھرم کا آغاز پانچویں صدی عیسوی میں ہوا ہے۔ اُس وقت جاپان میں شہزادہ ریجنٹ شتاکو (Shotoku) حکمران تھے۔ جاپانی قوم نے یہ محسوس کر کے کہ بودھ دھرم کے اعلیٰ اصولوں کی پابندی اُس کے لئے مفید ہے کوریا سے بودھ بھکشوؤں کو دعوت دیکر بلایا اور اپنے طالب علم چین اور کوریا کی خانقاہوں میں بھی بھیجے، چنانچہ ان نوجوانوں نے واپس ہو کر بودھ دھرم کو اپنا قومی مذہب بنالیا۔

جاپانی قوم بڑی فراخ دل اور زمانہ شناس ہے۔ اِسی وجہ سے وہ ہر نئے خیال اور تہذیب جدید کے ہر پہلو کو جو اُن کے واسطے مفید ثابت ہو قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں زمانہ قدیم کی عظمت اور قومی وقار کا جھوٹا خیال اُن کے راستہ میں کبھی حائل نہیں ہوتا ہے۔ ہندوستانیوں کی حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ ہم لوگ کسی نئے خیال یا نئے طرز عمل کو خوش آمدید نہیں کہتے بلکہ

اُس کی سخت مخالفت شروع کر دیتے ہیں اور اپنی ساری طاقت اُس کے برخلاف جدّوجہد میں صرف کر دیتے ہیں۔ مگر جب ضروریاتِ زمانہ مجبور کرتی ہیں تو بادلِ ناخواستہ اُس کو منظور کرتے ہیں، مگر اس عرصے میں زمانہ بہت آگے نکل جاتا ہے۔ کوئی نئی تحریک میدان میں آجاتی ہے اور ہم اپنی عادت کے موافق اُس کے فضول مقابلے میں اپنی تضیعِ اوقات کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو کوئی تحریک زور پکڑنے پاتی ہے اور ہماری بہبودی کے اسباب اکٹھے ہونے پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم لوگ ہمیشہ سے باتوں کے مرد رہے ہیں، جہاں عمل کی ضرورت ہوتی ہے دُور بھاگتے ہیں، روحانیت کے میدان میں ہم نے بہت کچھ ترقی کی مگر آفرینشِ عالم، دنیا کے آغاز، خدا، روح اور مادہ کی فلسفیانہ بحثوں میں ہم کو غیر معمولی روحانی حظ آتا رہا ہے۔ انھیں نکات کی تحقیق و تلاش اور انھیں کا تذکرہ ہماری روحانیت کا معیار رہا ہے، اسی وجہ سے ہم کو مہاتما گوتم بدھ کی سیدھی سادی تعلیم جس میں سارا زور عمل پر دیا گیا ہے پسند نہ آئی واقعی جب اشلوکوں کے پڑھنے اور ایشور کی تعریف کرنے ہی سے تسکینِ قلب ہو جائے تو پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟

بودھ دھرم نے جاپان میں کئی صورتیں اختیار کیں، اس میں چھ قابلِ ذکر ہیں جو ابھی تک جیتی جاگتی موجود ہیں بقیہ یا تو معدوم ہو گئیں یا ان کا کوئی نمایاں اثر نظر نہیں آتا ہے۔ جاپان کی تہذیب تمدن، صنعت و حرفت اور ترقی کا راز سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کے متعلق کچھ معلومات حاصل کریں، کیونکہ اس کی تمام تر ترقی بودھ دھرم کی تعلیم اور اس پر عمل درآمد کا نتیجہ ہے۔

سب سے پہلے اس بات کے ذکر کرنے کی ضرورت ہے کہ بودھ دھرم کی دو بڑی شاخیں ہیں ایک کا نام ہنایان "(Hinayano) ہے جو سیام، برہما۔ لنکا اور سیام میں رائج ہے۔ دوسری مہایان" (Mahayano) ہے جو چین۔ جاپان۔ تبت۔ نیپال اور منگولیا میں رائج ہے۔ ان دو شاخوں میں خاص فرق یہ ہے کہ ہنایان " میں اپنی ذاتی نجات پر بڑا زور دیا گیا ہے، اس کے برخلاف مہایان میں دنیا کی بہبودی پر زور دیا گیا ہے۔ اس معیار کا نام بودھی ستو ہے، یہ ایک نہایت اعلیٰ معیار ہے جو بودھ دھرم نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس کے مفصل ذکر کے لئے علیحدہ مضمون کی ضرورت ہوگی یہاں صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ جو انسان نجات کے خیال کو ترک کر کے دنیا کی خدمت کے لئے بار بار جنم لیتا ہے وہ بودھی ستو کہلاتا ہے۔

بودھ دھرم کی ان چار شاخوں کا نام جس میں اس خیال پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کو اپنی سعی
بکر شدہ . بھ و ساکا نا جاسے مہر ؛:

(۱) شن گن (Shingon) (۲) ٹین ڈائی (Tendai)

(۳) زین (Zen) (۴) نچرین (Nichren.)

اور اُن دو شاخوں کے نام جن میں اِس خیال پر زور دیا گیا ہے کہ انسان بھگوان بودھ کی امداد کے بغیر ترقی نہیں کرسکتا ہے یہ ہیں:-

(۱) جوڈھو (Jodo) اور

(۲) شن (Shin)

یہاں ہم ان میں سے ہر ایک شاخ کا مختصر ذکر کرتے ہیں:-

(۱) شن گن (Shingon) کے معنی ستّ نام یعنی ستّ شبد یا منتر کے ہیں جس کی تعلیم پیر سے مرید کو ملتی ہے اور اسی طرح سینہ بسینہ محفوظ رہتی ہے۔ اس عقیدہ والوں کا یہ خیال ہے کہ اس کی تعلیم بھگوان بودھ نے اپنے دھرم کایا یعنی روحانی جسم میں دی تھی اس کا مختصر تذکرہ ہم کو کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ ان اشاروں سے صرف وہی لوگ مستفیض ہو سکتے ہیں جن کو کسی پیر سے تعلیم پانے کا اتفاق ہوا ہو۔ اس کے معتقدوں کا یہ خیال ہے کہ گرُو کے بغیر گتی ناممکن ہے۔

شن گن مت والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ سچے متلاشی کو مختلف جنموں تک انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اسی زندگی میں وہ نجات حاصل کرسکتا ہے۔ جاپان میں اس خیال کی تلقین کوکائی نامی ایک جاپانی بھکشو نے کی تھی جس کو لوگ کوبوڈیشی (Kobo Daishi) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی خیال کا اظہار ہندوستان کے مشہور بودھ مہاتما ناگ ارجن (Naga Arjun) نے بھی کیا تھا۔ ان کا قول تھا کہ انسان صرف روحانی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی نروان حاصل کرسکتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ موت اور زندگی دونوں کی دنیا ایک ہے اور بودھ کا سب میں ظہور ہے۔ انھیں کی روشنی سے تمام دنیا منوّر ہے ہم سب بودھ سروپ ہیں اور ہم سب میں بودھ کا نور موجود ہے، ساری دنیا ایک اور گیان سروپ ہے۔ نروان ہمارا ذاتی وصف ہے کوئی بیرونی شئے نہیں ہے جس کو حاصل کرنے کی ضرورت ہو۔ اس لئے تن من دھن سے بودھ میں فنا ہوجانا ہی ہر ایک معتقد کا فرض اعلیٰ ہے۔

زین (Zen) مت کی توضیح نہایت مشکل ہے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ بھگوان بودھ راجگرِھ میں گدھر کوٹ کی اونچی پہاڑی پر مقیم تھے اور ہر روز اپنے مریدوں پر وعظ کہتے تھے، ایک دن انھوں نے ایک گلاب کے کھلے ہوئے پھول کو ہاتھ میں لیکر مریدوں کو دکھایا اور چپ ہوگئے، ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی

مگر کوئی مرید اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ سب کے سب حیرت زدہ ہو کر رہ گئے مگر مہاکشیپ مسکرا دیے، بھگوان نے فوراً اُن پر راز افشا کر دیا اور اُن کو مخفی تعلیم دی۔ بعد میں اسی تعلیم کی تلقین ایک ہندوستانی شہزادے بودھی دھرم نامی نے کی ہے۔ مہاتما مذکور چین بھی گئے تھے۔ یہاں وہ ایک سنسان جگہ پر عرصہ دراز تک ایک دیوار کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ بہت سے لوگ اُن سے مستفیض ہوئے مگر اُن کی تعلیم دینے کا طریقہ جداگانہ تھا۔ بظاہر وہ خاموش رہتے تھے لیکن اشاروں ہی اشاروں میں دین و دنیا کے راز ظاہر کر دیتے تھے، نہ وہ کسی کتاب کے معتقد تھے نہ کسی رسم و رواج کے اور نہ کسی طرح کی پوجا پاٹ کی تلقین کرتے تھے۔

اِن بزرگ کا یہ خیال تھا کہ سچائی کا پتہ کتابوں کے پڑھنے سے نہیں چلتا۔ وہ ہر انسان کے دل و دماغ میں موجود ہے اور اِس کے معلوم کرنے کے لئے صرف دھیان کی ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے اِن کے مت کا نام زین (Zen) یعنی "دھیان" پڑا۔

یہ کس قسم کا دھیان ہے؟ اس کے کیا طریقے ہیں؟ اس کا بیان کرنا نہایت مشکل ہے۔ عام طور پر جس کو دھیان یا یوگ کہا جاتا ہے اُس میں اور زین (Zen) میں بڑا فرق ہے۔ ہم کو عام طور پر دھیان کرنے کے لئے بتایا جاتا ہے کہ ہم ایشور کے کسی سروپ، گرو، کسی نقطہ یا جسم کے کسی اندرونی یا بیرونی مقام کا تصور کریں۔ زین (Zen) کہتا ہے کہ یہ باتیں خلاف فطرت ہیں جو بڑی چھچل واقع ہوئی ہے۔ کوئی شخص اپنے تصورات کو کسی خیال کی کال کوٹھری میں بند نہیں کر سکتا ہے۔ اس کا کبھی رجحان آزادی کی طرف ہے مگر بندش کی تعلیم دی جاتی ہے جو خلاف فطرت ہے۔ زین (Zen) کہتا ہے کہ کسی تصورات کی قید و بند میں مت پڑو بلکہ تمام دنیا کی چیزوں کو آنکھیں کھول کر دیکھو اور انھیں اپنے کام میں لاؤ، ان میں دھیان کے طریقے نرالے ہیں اور یہ ہر انسان کے لئے مختلف ہیں۔ جو عمل ایک انسان کے لئے مفید ہو۔ وہ ممکن ہے دوسرے کے لئے آتنا کارآمد ثابت نہ ہو۔ بہرحال اس عقیدے کے بموجب ہر فرد بشر کو ایک ہی شکنجے میں کسنے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے۔ زین (Zen) مت کا جاپان کی زندگی پر بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ درحقیقت ان کی تہذیب کا کوئی پہلو اُس کے اثر سے خالی نہیں ہے۔ جاپان کے بڑے بڑے قومی رہنما۔ فوجی افسر، مذہبی پیشوا، مصور اور شاعر انھیں عقائد کے پیرو ہیں۔ آج یورپ میں بھی ان کے اصولوں کی بڑی قدر ہو رہی ہے اور عجب نہیں کہ یورپ میں مشرقی تہذیب کا اثر اسی مت کے ذریعے پھیلے۔

ٹین ڈی ای (Tendai) بودھ دھرم کی وہ تیسری شاخ ہے جس میں عمل پر بہت زور دیا

گیا ہے، سب سے پہلے ایک جاپانی بھکشو سیاچو (Siucho) نے جس کو لوگ اب ڈینگیو دیشی (Dengyo Daishi) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس عقیدہ کی تعلیم دی تھی "ست دھرم پنڈاریکا سوتر" (Saddharma Pundarika Sutta) اس دھرم کی خاص کتاب ہے۔ اس میں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ بودھ ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گے۔ وہ ہر شے میں موجود ہیں اس لئے ہر شے نروان یعنی نجات کے قابل ہے اور اُس کو لازمی طور سے حاصل کرے گی۔ ڈنگیو ڈیشی نے اس مت کی بنیاد کوہ ہئی (Mount Hiei) پر گیارہ سو برس ہوئے ڈالی تھی۔ بعدہٗ بہت سے لوگوں نے اس کی تلقین و پیروی کی۔

کوہ ہئی (Mount Hiei) کے مندر میں ایک غریب بچہ نچرن نامی (Nichren) تعلیم پا رہا تھا۔ وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ واقعی "ست دھرم پنڈاریکا سوتر" (Saddharama Pundarika Sutta) سچائی کا مخزن ہے۔ اور اُس کے دل کو اس مقدس کتاب سے اس قدر عقیدت ہو گئی کہ اُس نے اس کی پرستش بھی جائز کر دی۔ چنانچہ آج بھی ہومن جی (Hommonji) کے مندر میں "ست دھرم پنڈاریکا سوتر" کی جے کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ راقم الحروف کو اس مت کے ایک جاپانی بھکشو سے ملنے کا اتفاق ہوا جو نہایت نیک اور عقیدتمند فقیر تھا۔ کوہ ہئی (Mount Hiei) سے جوڈو (Jodo) مت کا بھی آغاز ہوا جس میں امٹ بھا (Amit Bha) یعنی لافانی روشنی والے بودھ کی بھگتی کی تلقین کی گئی ہے۔ شنرن (Shinran) نے اپنے مت جوڈو شنرن (Jodo Shinran) کی بنیاد ڈال کر اس خیال پر اور بھی زور دیا۔ اس مت والوں کا عقیدہ ہے کہ بھگوان بودھ کے بھگتوں کو ضرور بالضرور جنت حاصل ہو گی۔ بہت سے لوگ تو اس جنت پر قانع ہیں، بہت سے نروان کے حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ تیرھویں صدی میں ان کے مشہور مندر چاؤنن (Chionen) کی بنیاد پڑی جاپان میں یہ مندر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا دروازہ اسّی فٹ اونچا ہے اور اس میں بہت بڑے بڑے ہال ہیں۔ اس مندر میں ایک بہت بڑا گھنٹہ ہے جس کی مثال دنیا میں جاپان کے علاوہ اور نہیں ہے۔

آدھا جاپان شن (Shin) مت کا پیرو ہے۔ اس میں بھی بھگتی مارگ پر زور دیا گیا ہے۔ اس مت کے لوگ تجرد پر چنداں زور نہیں دیتے ہیں۔ خود شنرن شونن (Shinran Shonin) نے اپنی شادی کی تھی، اور اس مت کے پیشوا پروٹسٹنٹ پادریوں کی طرح شادی شدہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اس مت والے دنیادی ترقی کے کاموں میں بڑے جوش و خروش سے کام لیتے ہیں اور سیکڑوں اسکول، کالج، ہسپتال، محتاج خانے، یتیم خانے قائم کر رکھے ہیں۔

کوہ ایورسٹ

(از منشی محمد یعقوب صاحب خاں کلام بی۔اے)

۱۸۴۸ء سے پیشتر جلپے گوری وغیرہ کی آبادیوں کے باشندے عموماً کوہ کنچن جنگا کی چوٹی کو سب سے بلند پہاڑ بتایا کرتے تھے۔ دارجیلنگ کے باشندوں کا بھی یہی قول تھا۔ پنڈتوں سے دریافت کیا جاتا تھا تو وہ ناکالو نامی پہاڑ کو دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ بتاتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہی دیواستھان (دیوتاؤں کا مسکن) اور رشیوں منیوں کا جائے قیام تھا۔

۱۸۴۸ء میں جب ہندوستان کی پیمایش کی جارہی تھی تو بنگال اور صوبہ متحدہ دونوں صوبوں میں محکمۂ پیمایش کی مختلف پارٹیاں گوشہ گوشہ کے جغرافیائی، طبقاتی حالات اور مختلف اعداد و شمار فراہم کر رہی تھیں۔ اسی زمانہ میں ایک بنگالی کلرک مسٹر بنرجی بھی اس محکمہ میں کام کر رہا تھا، اس کی پارٹی دہرہ دون میں تعینات تھی۔ ایک روز اس کلرک کے سامنے بہت سے نقشے اور جغرافیہ کی کتابیں پڑی ہوئی تھیں اور بہت سے نقشے میز پر کھلے ہوئے تھے، وہ کچھ حساب لگا لگا کر اعداد جمع کرتا جاتا تھا اور اپنے کام میں بالکل منہمک تھا کہ اسی اثنا میں وہ دفعتاً چونک پڑا اور ہاتھ سے قلم رکھ دیا۔ چہرہ سے حیرت و اضطراب کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اُس نے کاغذوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ اور سرویر جنرل کے پاس جا کر کہا کہ میں نے دنیا کا سب سے بلند پہاڑ دریافت کر لیا ہے۔

سرویر جنرل نے جن کا نام کرنل ایورسٹ تھا اور جو ریاضیات اور فن مساحت کے زبردست ماہر تھے، حیرت سے کلرک کی طرف دیکھا اور اس عجیب و غریب دعوے پر مسکرائے، لیکن جب بنرجی نے اس دعوے کے ثبوت میں وہ تمام اعداد و شمار جو اُس نے فراہم کئے تھے کرنل ایورسٹ کے سامنے پیش کر دیے، صاحب موصوف نے چند منٹ تک ان پر غور کرنے کے بعد جب پوری طرح اطمینان کر لیا تو بنرجی کے دعوے کو صحیح قرار دیا۔ چنانچہ اس بلند ترین چوٹی کا نام جو سطح سمندر سے ۲۹۰۰۲ فٹ بلند ہے سرویر جنرل کے نام پر "کوہ ایورسٹ" رکھا گیا۔ اور اسی نام سے یہ پہاڑ تمام دنیا میں مشہور ہو گیا اس وقت بھی دنیا بھر کے جغرافیوں اور نقشوں میں یہی نام درج ہے، مگر اس کا اصلی دریافت کنندہ ایک

ہندوستانی کلرک تھا جس کا نام بھی اب کوئی نہیں جانتا۔ اس کے بعد ماہرین کو یہ معلوم کرنے کی فکر لاحق ہوئی کہ مشرقی سمت سے کوہ ہمالیہ کی کونسی چوٹی کوہ ایورسٹ کہی جاسکتی ہے۔ چند ہی دنوں بعد ایک جرمن سائنس داں اور سیاح نیپال کی راجدھانی کٹھمنڈو میں گیا، جہاں اُس نے ہمالیہ کی وہ چوٹی دیکھی جسے ہندی میں گوری شنکر کہتے ہیں۔ اُس نے اسی کو کوہ ایورسٹ سمجھا اور اپنے خیال کے ثبوت میں ایسے ایسے دلائل پیش کئے کہ یوروپ کے اکثر جغرافیہ داں گوری شنکر ہی کو کوہ ایورسٹ ماننے کے لئے تیار ہوگئے۔ بایں ہمہ تحقیق کا سلسلہ جاری رہا اور ۱۹۰۳ء میں محکمہ سروے آف انڈیا کے دو انگریز افسروں نے پوری طرح تحقیق و تدقیق کرکے یہ ثابت کردیا کہ گوری شنکر کی چوٹی کوہ ایورسٹ نہیں ہے۔ بہر حال اس وقت حالت یہ ہے کہ گو کوہ ایورسٹ کی صحیح پوزیشن معلوم ہوگئی ہے لیکن یہ بات تحقیق نہیں ہے کہ سلسلہ کوہستان میں جو سر بہ فلک چوٹیوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے اُن میں کونسی چوٹی اصلی کوہ ایورسٹ ہے۔ بات یہ ہے کہ پہاڑی پیچ و خم اور نشیب و فراز کا سلسلہ سیکڑوں میل تک مسلسل چلا گیا ہے۔

ہندوستان کی طرف سے اگر کوہ ایورسٹ کو دیکھا جائے تو وہ صاف نظر نہیں آتا کیونکہ درمیان میں دیگر کوہستانی سلسلے اور بلند چوٹیاں حائل ہوجاتی ہیں پہلے تو خیر اس چوٹی کی اہمیت اور عظمت کی کسی کو خبر ہی نہ تھی جب سے اس کے متعلق تحقیقات شروع ہوئی ہے تو سب سے پہلے رائل جیاگرفیکل سوسائٹی کے ممتاز رکن سر فرانسس ینگ ہسبنڈ نے تجویز کی کہ علم جغرافیہ کے ماہرین کی ایک باقاعدہ مہم اس بلند ترین پہاڑ پر چڑھکر دریافت حالات کرے۔

ہندوستان یا نیپال میں کوئی شخص اس پہاڑ کے نام یا حالات سے جسے کوہ ایورسٹ کہتے ہیں واقف نہ تھا۔ پہاڑوں کے غاروں میں جو تارک الدنیا لوگ رہتے ہیں، یا کوہ رنجوک کی برفپوش چوٹیوں پر جو مہاتما گیان دھیان میں مصروف رہتے ہیں، سیاحوں نے ان سے بھی اس پہاڑ کا حال پوچھا مگر انھوں نے بھی سر اُٹھا کر پہاڑ کی طرف دیکھا اور آہ سرد بھر کر کہا کہ اس پہاڑ کی نسبت کیا پوچھتے ہو، اس سے اونچا تو پرندہ بھی نہیں اُڑسکتا۔ یہ قول بالکل صحیح ہے، کیونکہ اتنی بلندی تک واقعی پرندوں کا اُڑنا محال ہے۔ وہاں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ ازلی و ابدی برفستان کی وجہ سے گھاس پات بھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ برف پوش اور فلک بوس تودوں کا سلسلہ چلا گیا ہے جہاں آج تک کسی کا گذر نہیں ہوسکا۔ سردی اس قدر ہوتی ہے کہ رگوں میں خون جم جاتا ہے اور اس طرح دورانِ خون بند ہوجانے سے فوراً موت واقع ہوجاتی ہے۔

دیگر مہمیں | ۱۹۱۱ء کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف اشخاص نے کوہستان ہمالیہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے مہموں کا انتظام کیا۔ ۱۸۹۲ء میں سر مارٹن کانوے نے ایک مہم لیکر کوہستان قراقرم پر چڑھائی کی اور تئیس ۲۳ ہزار فٹ کی بلندی تک پہونچ گئے۔ ۱۸۹۵ء میں مسٹر ممری نے ننگا پربت پر چڑھائی کی، اس کے چار سال بعد ۱۸۹۹ء میں فرشیفیلڈ نے سکیم کے پہاڑوں کی سیاحت کی ڈاکٹر ورکھین اور اُن کی اہلیہ نے ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۸ء تک کئی بار ہمالیہ پر تئیس ۲۳ ہزار فٹ کی بلندی تک چڑھائی کی۔ مگر ان تمام مہموں کا تعلق کوہ ایورسٹ سے نہ تھا۔ اس کوہ پر چڑھائی کی کوشش کی ابتدا ۱۹۲۰ء سے ہوئی، جبکہ چند انگریزوں کی ایک جماعت نے جن کے لیڈر کرنل ہاورڈ بیری تھے تبت کے دلائی لاما کا اجازت نامہ حاصل کرکے چڑھائی شروع کی تھی۔ اس کا سلسلہ سال بھر تک جاری رہا جس کے دوران میں اُنھوں نے کوہستان مذکور کے متعلق نہایت بیش قیمت معلومات حاصل کیں جو دوسرے مہموں کے بھی کام آئی۔ اس مہم نے تئیس ہزار فٹ کی بلندی تک کامیابی حاصل کی مگر بعد ازاں موسم کی شدائد سے مجبور ہو کر واپس ہو گئی۔ مگر انھوں نے ایورسٹ کے شمالی رخ کا ایک مفید نقشہ مرتب کر لیا۔

پہلی مہم | اس کے بعد برگیڈیر جنرل بروس نے ایک مہم تیار کی جس کے انتظامات زیادہ عمدہ اور سائنٹیفک طریقوں پر کئے گئے۔ مثلاً پچھلی مہموں میں یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ چونکہ زیادہ بلندی پر آکسیجن گیس کی کمی ہوتی ہے لہٰذا انسان کے آلاتِ تنفس اپنے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں، ان تمام مشکلات کا خیال رکھتے ہوئے جنرل بروس نے ایک ایسی جماعت مرتب کی جس میں فوٹو گرافر، ڈاکٹر، ماہرین طبقات الارض و نباتات و حیوانات کے علاوہ آکسیجن کا بھی ایک ماہر تھا۔ موسم کے لحاظ سے بھی اس مہم کی روانگی کا وقت مناسب رکھا گیا تھا تاکہ برساتی ہواؤں کے چلنے سے پہلے ہی کام ختم ہو جائے لیکن ابھی تک دروں اور گھاٹیوں کی برف نہیں گھلنے پاتی تھی جس کی وجہ سے مہم کی ترقی میں دقتیں محسوس ہوئیں۔ بایں ہمہ اس جماعت نے تجربہ کار اور جفاکش تبتی قلیوں اور آکسیجن گیس کی مدد سے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے مثلاً پہلی کوشش میں یہ مہم ۲۶۹۸۵ فٹ کی بلندی تک پہونچ گئی، اس سے پیشتر کوئی شخص اتنی بلندی تک نہیں پہونچ سکا تھا۔

الغرض یہ پارٹی بہت بلندی تک چڑھ گئی لیکن اُترتے وقت سخت مشکلات کا سامنا ہوا اور جماعت کے ایک رکن مسٹر مارس ہڈ کا تو سردی کی وجہ سے ایسا بُرا حال ہو گیا کہ صورت تک

شناخت نہ ہوتی تھی۔

دوسری مہم | بایں ہمہ جنرل بروس نے ہمت نہ ہاری اور پھر دوسری مہم مرتب کرکے چڑھائی کی۔ اسمیں آکسیجن کا استعمال شروع ہی سے کیا گیا اور جنرل بروس مع مسٹر فنچ کے ستائیس ہزار تین سو فٹ کی بلندی تک پہونچ گئے۔ اس سے آگے طوفان برف و باد نے ان کی ترقی روک دی اور وہ چوٹی تک پہونچنے کی حسرت دل میں لیکر واپس ہوئے۔

تیسرا حملہ | ۱۹۲۲ء میں جو تیسرا حملہ کوہ ایورسٹ پر کیا گیا اس کے نتائج نہایت عبرت خیز اور الم انگیز ہوئے کیونکہ موسم کی خرابی کے باعث یہ مہم تیئیس ۲۳ ہزار فٹ کی بلندی تک بھی نہ پہونچ سکی۔ اس جماعت میں سترہ آدمی تھے، جو چار چار اور پانچ پانچ کی ٹولیوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ جس وقت یہ لوگ چڑھ رہے تھے اس وقت اُن کے پاؤں کے نیچے سے برف کا تودہ پلٹ کر گرا جس نے دو ٹولیوں کو جن میں نو آدمی تھے دور فاصلہ پر ایک برف پوش پہاڑی پر پھینکدیا۔ افسوس ہے کہ ان میں سے سات آدمی اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے صرف دو زندہ رہے۔

چوتھا حملہ | ۱۹۲۴ء میں کوہ ایورسٹ پر چوتھے حملہ کا انتظام کیا گیا، اور گذشتہ مصائب اور رکاوٹوں سے بچنے کا کافی خیال رکھا گیا۔ مہم نے اپنا کام پورے انتظام اور احتیاط سے شروع کیا، مگر بدقسمتی طوفان کی صورت میں آگے آئی اور مہم کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ لیکن اس مہم نے دو قلیوں کی جان بچائی جو برف کی سطح سے پھسل کر کھڈ میں گر پڑے تھے اور دوسری مرتبہ اپنے چار رفیقوں کی جان بچائی جو پیچھے چھوٹ گئے تھے۔

پانچواں حملہ | اہم ترین حملہ کوہ ایورسٹ پر وہ تھا جو مسٹر نارٹن اور سومروائل کی پارٹی نے کیا، اور جو اٹھائیس ہزار دو سو فٹ کی بلندی تک پہونچگئی۔ اس بلندی پر پہونچکر سردی اور ہوا کی خشکی کے باعث مسٹر سومروائل کا حلق سوکھ گیا اور برف کی وجہ سے نارٹن کی بینائی جاتی رہی۔ ان دونوں کو مسٹر اوڈیل اور مسٹر ہیزارڈ پکڑ کر نیچے لائے۔

مگر ان ہمت شکن واقعات کے بعد بھی اس جماعت کے حوصلے پست نہ ہوئے، یعنی میلوری، اروین اوڈیل اور ہیزارڈ نے پھر ایک آخری حملہ کیا۔ ۶۔ جون کو یہ لوگ چھبیس ہزار فٹ بلند کیمپ سے مع تین پہاڑی قلیوں کے روانہ ہوئے اور دو ہزار فٹ زیادہ چڑھ گئے، دو دن بعد وہ کیمپ نمبر ۶ سے آگے بڑھے اس وقت پارٹی کے آگے اوڈیل تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اوڈیل کی آنکھوں نے جواب دے دیا اور وہ اپنے ساتھیوں تک کو نہ دیکھ سکا۔ وہ واپس ہوا اور اپنے ساتھیوں کی تلاش کی مگر بے سود اس پر بھی

اس شخص نے دامنِ ہمت کو نہ چھوڑا اور ستائیس ہزار فٹ کی بلندی تک تنِ تنہا چڑھ گیا، پھر بھی ساتھیوں کا کہیں پتہ نہ چلا۔ بالآخر یہ لوگ ملول و رنجیدہ ہو کر واپس ہوئے۔ اس مہم میں تیرہ آدمیوں نے جان دی جن کی یادگار قائم کر دی گئی ہے۔

آخری ہوائی حملہ

کوہ ایورسٹ پر سب سے آخری اور کامیاب وہ ہوائی حملہ ہے جو ۱۹۳۳ء میں لارڈ کلائڈ سڈیل کی جماعت نے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے کیا، اس مہم میں کرنل ایتھرٹن اور کرنل بلیکر وغیرہ بھی شریک تھے۔ یہ حملہ چودہ ماہ تک پورے انتظامات مکمل کرنے کے بعد شروع کیا گیا۔ اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ کوہ ایورسٹ کی ہوائی سروے کر کے فوٹو لئے جائیں اور انگریزی ساخت کے طیاروں کی مضبوطی اور کارگذاری کا مظاہرہ کیا جائے۔

چونکہ کوہ ایورسٹ تبت اور نیپال میں واقع ہے اس لئے سب سے پہلے مہاراجہ صاحب نیپال سے اجازت حاصل کی گئی جس سے پہلی سیاسی رکاوٹ دور ہو گئی۔ اس کے بعد مہم کے مصارف کا معاملہ درپیش ہوا اور لیڈی ہاوسٹن نے ازراہِ کرم یہ ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی اور یہ مرحلہ بھی باحسن وجوہ طے ہو گیا۔ اور یہ شرط ٹھہری کہ مہم میں تمام سامان انگریزی ساخت کا استعمال کیا جائے۔ مہم کیلئے ویسٹ لینڈ کے طیارے منتخب کئے گئے جن میں برسٹل پیگسس قسم کے انجن نصب تھے جنھوں نے چوالیس ہزار فٹ کی بلندی تک پرواز کر کے دنیا کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ اس کے بعد ماہرینِ فنِ پرواز کی تلاش ہوئی، بالآخر مہم کے لئے نظرِ انتخاب نے ہوائی کپتان پی۔ ایف۔ ایم۔ فیلوز کو پسند کیا۔ اس کے بعد آزمائشی اور تنقیدی پروازیں ہونے لگیں جن میں ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی تک کامیابی حاصل کر لی گئی اہلِ مہم نے اندازہ لگایا کہ کوہ ایورسٹ کی چوٹی پر ٹمپریچر درجہ صفر سے ستر درجہ کم ہو گا۔ اس لئے وہاں برقی انگیٹھیوں اور آکسیجن گیس کی سخت ضرورت پڑیگی، اور یہی دو چیزیں ایسی ہیں جن پر پرواز کرنے والوں کی زندگی کا مدار تھا۔ کیونکہ اگر سانس بند اور دل کی حرکت مسدود ہو گئی تو پرواز کیونکر ہو گی۔ لہٰذا ان دونوں ضروری چیزوں کا پورا بندوبست کیا گیا۔ چونکہ جس قدر بلندی زیادہ ہوتی جاتی ہے اُسی قدر سردی بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے لہٰذا ایسے لباس کا بھی انتظام کیا گیا جس میں برقی رَو کے ذریعہ سے حرارت پہونچائی جائے۔ چنانچہ اس کے لئے فولادی خود بنوائے گئے جن میں حرارت پہونچانے اور گیس گذارنے کے آلات لگائے گئے۔ طیاروں کی حفاظت۔ فلم سازی اور ترسیل ڈاک کے خاص انتظامات کر لئے گئے۔ اس کے بعد مہم کے ہیڈ کوارٹر کے لئے ہندوستان میں مقام پورنیہ منتخب کیا گیا جو کوہ ایورسٹ سے براہ راست ایکسو ساٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مہاراجہ دربھنگہ نے مہم کے قیام کے لئے اپنا محل دے دیا اور مقامی

حکام نے بھی مہم کی امداد و اعانت کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔

جس وقت مہم کے ارکان پورنیہ پہونچے تو ان کی نسبت مختلف قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں بعض توہم پرست ہندوستانیوں کا یہ خیال تھا کہ یہ مہم ایک زبردست فوج کا ہراول دستہ ہے جو کوہستان ہمالیہ کے مشرق میں تمام براعظم ایشیا کو فتح کرنے آئیگی، بعض لوگوں کا یہ گمان تھا کہ یہ لوگ پاربتی جی کی پوجا کرنے پہاڑ پر جارہے ہیں۔ بعض کا یہ قول تھا کہ کوہ ایورسٹ کی چوٹی پر خالص اور ٹھوس سونے کا ایک مندر ہے جسے لوٹنے کے لئے یہ لوگ جارہے ہیں۔ بہرحال مہم نے اپنے ابتدائی انتظامات تمام مکمل کرلئے اور نقشہ کے مطابق ۳۔ اپریل ۱۹۳۳ء کو پورنیہ سے دو بڑے ہوائی جہاز اُڑے اور سترہ ہزار فٹ کی بلندی تک پہونچ گئے۔ اس وقت آسمان بالکل صاف تھا اور سرحد نیپال تک تمام چیزیں صاف نظر آتی تھیں اسی اثنا میں رصدگاہ والوں نے اطلاع دی کہ تینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر ہوا کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹہ ہے اس ابتدائی اور آزمائشی پرواز کے بعد جملہ انتظامات مکمل کئے گئے۔ دونوں بڑی مشینوں کو بھرپور طرح دیکھ بھال لیا گیا، انجن چلا دئے گئے، ناخدا، فوٹوگرافر، مشاہدہ باز اپنے خاص برقی لباس میں ملبوس ہوکر اپنی اپنی جگہوں پر تعینات ہوگئے۔ برقی خود، برقی نقاب، برقی چشمے، اور آکسیجن کی نلیاں لگالی گئیں۔ ہر شخص دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا انسان نہیں بلکہ کوہ قاف سے روایتی دیو اُتر آئے ہیں۔ اہل مہم نے اپنے دوستوں سے رخصتی مصافحہ کیا اور آٹھ بجکر ۲۰ منٹ پر بوقت صبح روانہ ہوگئے، اور بعدہٗ گیارہ بجکر ۲۵ منٹ پر واپس آکر ان لوگوں کو جو چشم انتظار بنے کھڑے تھے یہ مژدۂ جانفزا سنایا کہ دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ کی چوٹی کے اوپر کامیابی کے ساتھ پرواز کرلی گئی۔

مہم مذکور کی طرف سے ہندوستان اور برطانیہ کے متعدد اخباروں اور رسالوں میں بہت سی تصویریں اور مضامین بھی اپنی کامیابی کے متعلق شائع کئے گئے۔ لیکن انگلستان کے بعض ماہرین فن کے خیال میں وہ تصویریں جو مہم مذکور نے لیکر شائع کی ہیں ہمالیہ کی کسی اور سربفلک چوٹی کی ہوں تو ہوں مگر اس خاص چوٹی کی کوئی تصویر نہیں ہے جسے عرف عام میں کوہ ایورسٹ کہا اور سمجھا جاتا ہے۔

بہرحال مہم کے کارناموں سے یہ بات تو ضرور ثابت ہوگئی کہ انگریزی قوم اپنی دُھن کی پکی ہے اور منزلِ مقصود تک پہونچنے میں جانی و مالی نقصانات یا مصارف کی کوئی پروا نہیں کرتی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اگر بقول بعض اس مرتبہ کامیابی نہیں ہوئی تو کوئی دوسری مہم مرتب کرکے ضرور کامیابی سے ہم آغوشی حاصل کی جائے گی۔

(از مسٹر شہنشاہ حسین رضوی ایم۔اے۔ایل ایل۔بی۔(علیگ) ایم۔آر۔اے۔ایس۔ایڈوکیٹ لکھنؤ)

میرٹھ سے تقریبًا تیرہ چودہ میل کے فاصلہ پر شمال مغربی گوشہ میں ایک تاریخی قصبہ ہے جس کا نام سردھنہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی راجہ سرکت تھا جس کا خاندان مسلم فاتحین کے ورود قدوم سے بیشتر اس کو اپنا دارالحکومت بنائے حکمرانی کرتا تھا۔ اسی راجہ نے شاید سردھنہ آباد کیا تھا۔ زمانہ کے انقلابات کے بعد ڈھوسر اور بشنوئی مہاجنوں کا اس پر قبضہ ہوگیا اور پھر اس کے بعد نہ معلوم اس کا کیا حشر ہوا

سلطنت مغلیہ کا آفتاب اقبال نصف النہار تک پہونچا بھی اور زوال پذیر بھی ہونے لگا۔ اسی ہنگام میں جبکہ بابر کی قائم، اکبر کی مستحکم، اورنگ زیب کی وسیع کی ہوئی سلطنت کا چراغ حیات ٹمٹما رہا تھا سردھنہ کا نام پھر زباں زد ہونے لگا۔ کیونکہ اب وہ بیگم شمرو کا مسکن تھا۔ بیگم نے اجڑے ہوئے سردھنہ کو گلزار بنا دیا تھا اور ایک ایسا کلیسا تعمیر کرایا جو ہندوستان کے کلیساؤں کی صف میں ممتاز جگہ پائیگا۔ اور ہندوستانی یوروپین عمارات کی تاریخ میں درخشاں رہیگا۔

اس گرجا کی تعمیر میجر انتونی ریگیلنی (Major Antonio Reghelini) کے زیر اہتمام ہوئی تھی۔ جو غالبًا بیگم کی ملازمت میں تھا اور شاید پادوا (Padua) کا رہنے والا تھا۔ گرجا میں ایک کتبہ بھی لگا ہوا ہے جو لاطینی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس گرجے کی رومن کیتھولک فرقہ کے رسم و رواج کے مطابق ۱۸۲۲ء میں تعمیر ہوئی تھی

فارسی کتبہ کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

بامداد خدا فضل مسیحا — بسال ہژدہ صد[۱۸] عشرین[۲۲] و اثنا

بدل زیب النسا عمدہ اراکین — بنا فرمود عالیشاں کلیسا

تذکروں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تقریبًا چار لاکھ یا اس سے کچھ زائد روپیہ کلیسا کی تعمیر میں صرف ہوا تھا جو عمارت فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔

بیگم کی حقیقت | بیگم سمرو کی حقیقت کیا ہے؟ یہ عجیب معمہ ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ رقاصہ تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میرٹھ کے شمال ومغرب میں کوئی تیس میل پر کوٹانہ ایک گاؤں ہے جس میں سادات کی اچھی خاصی بستی تھی، اور بیگم وہیں کے ایک غریب سید کی لڑکی تھی۔ بیگم کا اصلی نام کیا تھا۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ تذکروں کی ورق گردانی کیجئے اس کی زندگی کے تمام واقعات ملیں گے مگر نام ندارد ہے اور ہر جگہ وہ بیگم سمرو کے نام سے موسوم ہے۔ البتہ بیگم نے اپنے متبنّیٰ ڈائس سومبری (Dyce Sombre) کے نام اپنی جائداد کا ایک ہبہ نامہ کیا ہے جس میں اس کا نام جونا سومبری (Jonna Sombre) المعروف بہ عمدۃ الاراکین زیب النسا بیگم تحریر ہے۔ مسیحیت قبول کرنے کے بعد شاید اس کا نام جونا ہوگیا۔ "عمدۃ الاراکین زیب النسا بیگم" شاہی خطاب ہے جو شاہ عالم نے ۱۷۸۰ء میں دیا تھا۔

ابتدائی حالات | وہ ۱۷۵۳ء میں پیدا ہوئی۔ باپ کا سایۂ عاطفت نہ رہا اور اس کے سوتیلے بھائی نے اس کی ماں اور اس کے ساتھ بدسلوکیاں کرنا شروع کیں تو وہ چاروناچار تقریباً ۱۷۶۰ء میں دہلی چلی آئی۔ یہاں اس کا سمرو خاندان سے تعارف ہوگیا۔

وہ خوبصورت نازک اندام تھی، قد موزوں تھا۔ اور تمام اعضا نہایت موزوں تھے، آنکھیں بڑی تھیں جو غائر نگاہوں سے دلوں کی تہوں میں درآتی تھیں، وہ فارسی نہ صرف روانی کے ساتھ بول سکتی بلکہ لکھ پڑھ سکتی تھی۔ اس کی باتوں میں ایسی دل آویزی تھی کہ سننے والا مسحور ہو جاتا تھا۔ اس کی شادی غالباً ۱۷۶۵ء میں سمرو کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس وقت سمرو راجہ بھرت پور کا ملازم اور محاصرۂ دہلی میں مصروف تھا۔

سمرو | سمرو کا اصلی نام والٹر رینہارٹ (Walter Reinhardt) تھا جو سالٹبرگ (Salts Burg) کا رہنے والا تھا، وہ فرانسیسی سپاہ میں شامل ہو کر ایک سرفروش کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس نے انگریزی ملازمت کرلی لیکن پھر فرانسیسی سپاہ میں واپس گیا۔ اس کے بعد میر قاسم ناظم بنگال کے ارمنی جرنیل گرگری (Gregory) یا گرجن خاں کے زیر کمان نظر آتا ہے اور ۱۷۶۳ء میں پٹنہ کے ہولناک قتل عام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ پھر میر قاسم کے ساتھ بھاگ کر اودھ آتا ہے اور کچھ دن سرگرداں پھرنے کے بعد آخر کار چار دستے پیادہ ایک رسالہ سوار اور چھ توپوں کی ایک مختصر فوج فراہم کرلیتا ہے۔ اور اس طرح کبھی ایک سردار کے ساتھ کبھی دوسرے کے ساتھ ہو جاتا ہے، آج راجہ جے پور کی سپاہ میں کل بھرت پور کے عساکر میں نظر آتا ہے۔ اور بھرت پور کے لئے تو وہ چند خونریز معرکے سر بھی کرتا ہے۔ آخر کار وہ شاہی ملازمت اختیار کرلیتا ہے۔ اور شہنشاہ دہلی کی جانب سے

وہ ایک علاقہ کا سردار مقرر کیا جاتا ہے جس کا دار الحکومت وہ سردھنہ کو قرار دیتا ہے۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرتا کہ ہم اس کو آگرہ کا گورنر دیکھتے ہیں اور وہیں ۴ مئی ۱۷۷۸ء کو وہ تیر قضا کا نشانہ ہوتا ہے۔

سمرو کے بعد | سمرو کی وفات کے بعد اس کی سپاہ کی کمان جو یورپین اور ہندوستانی نبرد آزماؤں پر مشتمل تھی۔ بیگم کے ہاتھ میں آئی۔ ابتدا میں سپاہ میں بدنظمی رہی لیکن بیگم نے اپنی ذکاوت اور ذہانت سے بہت سے خودسروں کو زیر کرلیا۔ لیکن اس دوران میں ایک واقعہ بیگم کی زندگی میں ایک اور یادگار ہوگیا۔ ایک فرانسیسی قسمت آزما موسیو لی وسالٹ (Mouseeur Le Vassoult) اس کی فوج میں داخل ہوا، اور بہت جلد اس کی سپاہ کا کماندار اعظم ہوگیا۔ بیگم اور وسالٹ میں ارتباط بڑھ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیگم کے ساتھ اس کی شادی ہوگئی، لیکن شادی اس کو راس نہ آئی، اور سمرو کی خودسر سپاہ نے دونوں کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔ موقع کی نزاکت یہاں تک ترقی کرگئی کہ آخر وسالٹ اور بیگم کو مع اپنے تمام اثاثہ کے سردھنہ چھوڑنا پڑا۔

دونوں نے برطانوی علاقہ میں پناہ لینے کا تہیہ کرکے اپریل ۱۷۹۴ء میں اُنھوں نے گورنر جنرل کو براہ راست لکھا، اور مہاراجہ سندھیا کی اجازت سے ان کو اس شرط پر خفیہ بھاگنے کی اجازت ملگئی کہ وسالٹ بوجہ فرانسیسی ہونے کے ایک جنگی قیدی متصور کیا جائیگا کیونکہ یورپ میں اس وقت انگلستان اور فرانس کے درمیان جنگ ہورہی تھی، اور دنیا کے جس خطہ میں جہاں جہاں بھی فرانسیسی اور انگریز تھے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے تھے۔ شومیِ تقدیر کہ سپاہ کو بھی اِن دونوں کے فرار ہونے کی اطلاع ہوگئی۔ بیگم پالکی میں تھی اور وسالٹ گھوڑے پر۔ ابھی وہ صرف تین میل آگے بڑھے ہونگے کہ باغی سپاہ نے ہر چہار طرف سے ان کا محاصرہ کرلیا۔ وسالٹ اور بیگم میں یہ عہد تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی مرجائیگا تو دوسرا اپنی جان دیدیگا۔ یکایک بیگم کی سہیلیوں نے گریہ وبکا کا نالہ بلند کیا۔ وسالٹ نے سراسیمہ ہوکر مڑکر دیکھا تو بیگم کے سینہ سے خون کا ایک پرنالہ جاری تھا اور وہ دم توڑ رہی تھی، بیگم نے خنجر خون آشام سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وسالٹ سے یہ خونیں منظر دیکھا نہ گیا اور اُس نے پستول اپنی کنپٹی پر رکھکر دوسرے لمحہ میں جان دیدی۔ بیگم گرفتار ہوگئی اور سردھنہ واپس لائی گئی۔ اس کا زخم کاری نہ تھا اور وہ رفتہ رفتہ مندمل ہوگیا۔

ظفریاب خاں | جان تو بچ گئی لیکن اب دوسری مصیبت پیش آگئی ظفریاب سمرو کا پہلی بیوی سے ایک لڑکا تھا جس نے موقع کو غنیمت سمجھکر دہلی سے کچھ رفقا ساتھ لئے اور سردھنہ پہونچکر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ لیکن بیگم نے جو خطرہ کے وقت کبھی ہراساں نہ ہوتی تھی۔ دہلی کے مرہٹہ گورنر جارج طامس کی مدد سے جو ایک زمانہ میں اسکا

تک بھی کھا چکا تھا۔ ظفریاب کے رفقا کو منتشر کرکے اس کو گرفتار کر لیا۔ اور اس طرح وہ پھر اپنی جاگیر پر قابض ہوگئی، اور مرتے دم تک اس کے اقتدار کو پھر کوئی ضرب نہ لگی۔ جارج طامس George Thomas کو اس کی خدمات کے صلہ میں گرانبہا جہیز کے ساتھ بیگم کی ایک پروردہ لڑکی کی شادی کر دی گئی۔

بیگم کی سپاہ | بیگم کے پاس پہلے چار دستے تھے، ۱۷۹۰ء میں ایک دستہ کا اور بعدہٗ ۱۷۹۶ء اور ۱۸۰۲ء میں دو دستوں کا اور اضافہ کیا گیا۔ ان میں سے پانچ کرنل سیلیور (Saleur) کی کمان میں سندھیا کے ساتھ دکن کی مہم پر گئے تھے لیکن کوئی کارنمایاں نہیں دکھلا سکے بلکہ چار توپیں کھو کر چلے آئے۔ بیگم کی سپاہ کی وردی کا رنگ گہرا نیلا تھا، کوٹ یا جامہ بہت نیچا ہوتا تھا اور پیروں تک پہونچتا تھا لیکن سرخ کمر بندوں سے وہ کسی قدر اونچا ہو جاتا تھا۔ دستاریں سرخ ہوتی تھیں جو دھوپ میں بہت خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ فوج کے ہر سپاہی کے پاس گھوڑا تھا اور وہ بہترین اسلحہ سے مسلح ہوتے تھے۔

بیگم اور انگریز | جب انگریزوں نے علیگڈھ کا قلعہ فتح کر لیا تو رابرٹ اسکنر (RoberLSKinner) کی تحریص و ترغیب سے ۱۸۰۳ء میں بیگم نے انگریزوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اس وقت سے اس نے اپنی معاشرت اور وضع کو بالکل بدل دیا۔ اب تک تو وہ پردہ نشین تھی اور فینس میں نکلتی تھی لیکن اب گاڑی اور ہاتھی پر سوار ہونے لگی، بعض اوقات وہ گھوڑے پر بھی نکلتی تھی لیکن انگریزی ٹوپی کے نیچے نقاب سے منہ کو چھپائے ہوتی تھی۔

آخری کارنامہ | اس کی زندگی کا آخری شجیعانہ کارنامہ ۱۸۲۵ء میں ظہور پذیر ہوا، جبکہ وہ لارڈ لیک کے ہمرکاب قلعہ بھرت پور کی تسخیر میں معہ اپنی سپاہ کے شریک تھی۔ برطانوی سپاہ کو جو فتح حاصل ہوئی یقیناً اُس میں اُس کا بھی نمایاں حصہ تھا۔ لارڈ لیک (Lord Lake) نے اس کی شجاعت استقلال اور وفاداری کا اعتراف کیا ہے۔

ظفریاب خاں کی اولاد | ظفریاب خاں ۱۸۰۳ء میں بعارضہ ہیضہ دہلی میں انتقال کر گیا، اور آگرہ میں اپنے باپ سمرو کے پہلو میں مدفون ہوا۔ اُس کی ایک دختر تھی جو ۱۸۰۶ء میں کرنل ڈائس Colonel Dyce کو منسوب ہوئی، ڈائس سے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہوا جس کا نام ڈیوڈ آخٹر لونی ڈائس سومبری (David Achter Loney Dyce Sombre) تھا یعنی والٹر رینہارٹ کا پڑوتا۔ اس لڑکے کو بیگم نے اپنا متبنّٰی کیا جو اس کے بعد اس کی جائداد اور املاک کا وارث ہوا۔

امور خیر | مئی ۱۷۸۱ء میں سمرو کے مرنے کے بعد اُس نے رومن کیتھولک مذہب اختیار کر لیا تھا

اور وہ اپنے مذہبی عقائد میں پختہ بھی تھی۔ اپنے اظہار عقیدت میں اُس نے صرف کثیر سے کلیسا تعمیر کرایا اور اس کے قیام و بقا کے لئے ایک لاکھ روپیہ وقف کیا۔ پچاس ہزار مساکین سردھنہ کیلیے دیا اور ایک لاکھ روپیہ سینٹ جانس کالج سردھنہ کے قیام کے لئے۔ ڈیڑھ لاکھ روپیہ رومتہ الکبریٰ بھیجا گیا اور پچاس ہزار روپیہ کا گراں بہا ہدیہ آرک بشپ آف کنٹربری Arch Bishop of Canterbury کو نذر کیا گیا۔ ایک لاکھ بشپ کلکتہ کو کلکتہ کے پروٹسٹنٹ چرچ کے غربا میں تقسیم کے لئے دیا گیا۔ اسکے علاوہ مستحق قرضداروں اور عام مساکین کی گلو خلاصی کے لئے پچاس ہزار روپیہ کلکتہ اور بھیجا گیا۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے کیتھولک چرچوں کو ایک لاکھ روپیہ اور آگرہ چرچ کو تیس ہزار روپیہ دیا گیا۔ میرٹھ میں اُس نے ایک خوبصورت کلیسا تعمیر کرایا اور اس طرح ایک پاکباز مستطیع مسیحی عورت پر جو فرائض اُخروی عائد ہوتے تھے اُس نے انجام دیے۔

کیرکٹر وہ بہادر اور دلیر تھی تو رحمدل اور فیاض بھی تھی۔ اُس میں غضب کی ذکاوت اور ذہانت تھی اور مردوں کی سی جرأت اور رکھ رکھاؤ۔ وہ پاکباز تھی اور اپنے مذہبی عقائد میں پختہ۔ لارڈ ولیم بنٹنک نے ہندوستان کو خیرباد کہتے وقت جو کلکتہ سے ۱۰ مارچ ۱۸۳۵ء کو بیگم کے نام خط لکھا تھا اُسمیں بیگم کے بلند کیرکٹر کی ستایش کی ہے اور لکھا ہے کہ "میں آپ کے بلند کیرکٹر پر اپنی انتہائی عقیدت اور جذبۂ احترام کا اظہار کئے بغیر ہندوستان نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کی سخاوت نے ہزاروں کو آپکا گرویدہ بنا دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بحیثیت بیواؤں اور یتیموں کی دستگیر ہونے کے بہت زمانہ تک زندہ رہیں گی۔"

موت چند روزہ بستر علالت سے ہمکنار رہنے کے بعد وہ ۲۷ جنوری ۱۸۳۶ء کو اسّی سال سے زائد عمر میں سردھنہ میں داعیِ اجل کو لبیک کہتی ہوئی ہندوستان کے سیاسی اسٹیج سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔ لیکن اُنیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی نصف میں وہ کیرکٹر چھوڑ گئی جو تاریخِ ہند کا یقیناً ایک مستقل باب بننے کا استحقاق رکھتا ہے۔

بابو جگنّاتھ داس رتناکر مرحوم

(از جناب اقبال ورما سحر ہتگامی)

غالباً ۱۹۳۰ء کی گرمیوں میں حسن اتفاق سے میں گنگا بُک ڈپو لکھنؤ میں بیٹھا ہوا پنڈت دولارے لال بھارگو سے بات چیت کر رہا تھا کہ دفعتاً بابو جگنّاتھ داس رتناکر وہاں آموجود ہوئے جو ہردوار جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لئے لکھنؤ میں اُتر پڑے تھے۔ انھیں گنگاجی اور ہردوار سے اس قدر عقیدت تھی کہ ہر سال گرمیوں میں وہاں جانا اُن کا معمول ہو گیا تھا۔ اس سفر سے اُن کی صحت کا بھی تعلق تھا جو اس عمر میں اکثر خراب رہا کرتی تھی، تشخیص نہیں ہو سکی تھی، دل کا مرض بتاتے تھے، مگر میرے خیال میں اُن کی بیماری اُن کی اعتدال سے زیادہ جسم کی فربہی تھی۔

میں خود اُن کو اُس وقت سے پہچانتا تھا جب میں نے اُن کو اول اول ۱۹۲۵ء میں کانپور کے آل انڈیا کوی سمیلن (مشاعرہ) میں دیکھا تھا جس کے وہ صدر تھے مگر میرا اُن سے کوئی خاص تعارف نہ تھا اس کے بعد مجھے اُن کے درشن آفس مذکور میں نصیب ہوئے۔ رتناکر جی نہایت سادہ وضع میں تھے ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنے تھے سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا تھا۔ آتے ہی کچھ دیر تک تو وہ بھارگو جی سے گفتگو کرتے رہے، پھر مجھ سے مخاطب ہوئے اور اس طرح گھُل مل کر باتیں کرنے لگے گویا برسوں کی شناسائی تھی۔ ہندی کے یکتائے روزگار شاعر اور ایک اجنبی شخص کے ساتھ اس بے تکلفی سے گفتگو، کیا حسن اخلاق تھا۔ بڑی بزرگانہ طبیعت کے آدمی تھے۔ اور چھوٹوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت سے پیش آتے تھے۔

کچھ شعر و شاعری کا بھی تذکرہ چھڑا، معلوم ہوا کہ رتناکر جی پہلے اُردو اور فارسی میں شعر کہا کرتے تھے انھوں نے ہر دو زبانوں کے بہت سے اشعار سنائے۔ اُن کی ایک فارسی نظم کا پہلا شعر یاد رہ گیا ہے، جسے تبرکاً پیش کرتا ہوں۔ یہ نظم انھوں نے کسی موقع پر علامہ اقبال کے خیر مقدم میں کہی تھی۔ شعر ملاحظہ ہو:

نہ دانم از حرم آئی کہ از بت خانہ می آئی ہمی دانم کہ تو آئی عجب مستانہ می آئی

کس غضب کا شعر ہے، حرم اور بتخانہ کے اعتبار سے عجب مستانہ کی بندش کتنی نفیس اور موزوں ہے، اور جب اُس شخص کے وقتی جذبات وخیالات پر خیال جاتا ہے جس کے لئے نظم تصنیف ہوئی تھی تو شعر کی نفاست اور موزونیت بدرجہا بڑھ جاتی ہے۔

رتناکر جی نے فارسی ہی لیکر ۱۸۹۱ء میں بی۔ اے پاس کیا تھا۔ اُس وقت اُن کی عمر پچیس سال کی تھی۔ وہ ۱۸۶۶ء میں بنارس میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم کی تکمیل کی۔ ان کا تعلق ایک بہت قدیم اگروال خاندان سے تھا۔ پہلے آپ کے آبا و اجداد کا وطن ضلع پانی پت تھا، جہاں سے وہ شہنشاہ اکبر کے دربار میں آئے اور عہد مغلیہ میں عہدہ ہائے جلیلہ پر مامور رہے۔ جہاندار شاہ کے بعد آپ کے پڑدادا لالہ تلا رام نے دہلی سے آکر بنارس میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

رتناکر جی کے والد بزرگوار کا نام لالہ پرشوتم داس تھا جو فارسی زبان کے جید عالم تھے۔ اگرچہ ان کو فارسی شاعری سے فطری لگاؤ تھا مگر ہندی شاعری سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ شعر کی قدردانی اور مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ مکان پر مشاعرے منعقد ہوا کرتے اور دن رات شعر و شاعری کے چرچے رہا کرتے تھے جن کا اثر رتناکر مرحوم کے اثر پذیر دل پر پڑے بغیر نہ رہا اور وہ خود بھی اُردو اور ہندی میں شعر کی فکر کرنے لگے۔

خوش نصیبی سے رتناکر جی کو بچپن ہی میں ہندی کے شہرہ آفاق ناظم و ناثر اور موجودہ ہندی طرز تحریر کے موجد بھارتیندو ہرشچندر جی کی صحبت کا بھی موقع ملا۔ بھارتیندو جی اُن کے والد کے رشتہ دار اور دوست تھے۔ اُنھوں نے رتناکر جی کے متعلق پیشین گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا کسی دن اچھا شاعر ہوگا، جو حرف بحرف پوری ہو کر رہی۔

انھوں نے ۱۹۰۱ء میں ریاست آواگڑھ میں ملازمت کرلی تھی مگر وہاں کی آب و ہوا ناموافق ہونے سے صحت خراب ہونے لگی۔ اس لئے ۱۹۰۲ء میں ملازمت ترک کرکے بنارس واپس آگئے مگر اُسی سال مہاراجہ پرتاپ نراین سنگھ والی ریاست اجودھیا کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوکر چلے گئے اور پھر ترقی پاکر چیف سکریٹری ہوگئے۔ ۱۹۰۶ء میں مہاراجہ صاحب کی وفات پر آپ مہارانی صاحبہ کے پرائیویٹ سکریٹری ہوئے اور آخر وقت تک اسی عہدہ پر برقرار رہے۔ مہارانی صاحبہ میں بلند ذوقی اور سخن فہمی کا مادہ تھا۔ رتناکر جی نے اکثر اونھیں کی فرمایش پر نظمیں لکھیں۔ اُن کی مشہور تصنیف گنگا اوترن اُن کی ہی فرمایش کا نتیجہ ہے، جس پر ہندوستانی اکیڈیمی نے مبلغ پانچسو روپیہ کا انعام بھی عطا کیا تھا۔ رتناکر جی اکیڈیمی کونسل کے ممبر بھی تھے۔

ریاست کے معاملات میں بیحد مصروف رہنے کے باعث آپ کا بیس بائیس سال تک شاعری سے بہت کم تعلق رہا مگر ادھر آٹھ دس برس سے جب اُنھوں نے پھر قلم سنبھالا تو گویا اُن کی سوئی ہوئی شاعرانہ طاقتیں ایک دم بیدار ہو گئیں، اور اُنھوں نے ایسی معرکۃ الآرا نظمیں لکھیں گویا وہ بیس بائیس سال کا طویل وقفہ شعرگوئی کی غائبانہ مشق و مہارت ہی میں گزرا تھا۔

وہ برج بھاشا کے مشہور و معروف شعرائے ماضیہ کی دلچسپ یادگار اور زمانۂ حال میں برج بھاشا کے بہترین شاعر تھے۔ متقدمین کی طرح انھیں بھی اجودھیا کا راج دربار مل گیا تھا۔ اگرچہ اُن کی درباری زندگی کا بیشتر حصہ ایسے مشاغل میں گزرا تھا جن کا شاعری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ زبان و بندش کے لحاظ سے پُرانے شعرا کی تقلید کے باوجود بھی اُن کے کلام میں جدت تھی، اُن کے تخیل میں دلکشی و مقبولیت تھی۔ اُنھوں نے ۱۹۲۵ء کے "آل انڈیا کوی سمیلن" میں خود فرمایا تھا کہ "برج بھاشا کے شعرا کا فرض ہے کہ وہ اپنی شاعری کے رنگ ڈھنگ اور شعرگوئی کے طرز میں وقتی ضروریات اور سماج کی خواہشات کے مطابق ردو بدل کریں اور صرف عاشقانہ نظمیں نہ لکھیں بلکہ قومی اور مجلسی نقطۂ خیال سے کارآمد باتوں کی جانب متوجہ ہوں تاکہ تفریح طبع کے ساتھ عوام کو کچھ نفع بھی پہونچے"۔ وہ خود اپنی نظموں میں عموماً انھیں باتوں کا خیال رکھتے تھے۔

اُن کا کلام شوکت الفاظ حُسن بندش اور شاعرانہ بوقلمونیوں سے مرصع، رنگینیوں سے مملو اور صنائع بدائع سے معمور ہوتا تھا۔ وہ پڑھتے بھی خوب تھے، اُن کے اخلاق و انکسار کا مجھے خود تجربہ ہے۔ اگلے زمانہ کی نیک مزاجی اور زندہ دلی کا وہ ایک نادرالوجود نمونہ تھے۔

اگرچہ رتناکر جی متعدد کتب کے مصنف تھے مگر "ہرِشچندر"، "اُودھوشتک" اور "گنگا اوترن" سب سے زیادہ مشہور ہیں، "ہرِشچندر" اُن کی ابتدائی تصنیف ہے جو اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۹۰۱ء تک وہ تین بار چھپ چکی تھی۔ "اُودھوشتک"، اُودھو جی اور گوپیوں کا منظوم مکالمہ ہے، اُودھو جی کو کرشن جی نے متھرا سے برج کو اس لئے بھیجا تھا کہ وہ ہجراں نصیب گوپیوں کو جاکر تسلی دیں۔ شاعر کا قلم کبھی گوپیوں کا دل بنکر جذبات نگاری کرتا ہے اور کبھی اودھو کا دماغ بنکر اعلیٰ فلسفہ کی وضاحت، بالآخر دل کی دماغ پر فتح ہوتی ہے اور اُودھو جی کو اپنا سا منہ لیکر واپس جانا پڑتا ہے۔ عشق کے متوالوں کو گیان بیراگ سے کیا سروکار؟

آپ نے بہاری ست سئی کی بھی شرح کی ہے جو ایک زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ اس طرف آپ سور ساگر جیسی ضخیم اور اَدَق کتاب کی بھی شرح لکھ رہے تھے جس کا بیشتر حصہ لکھا بھی جا چکا ہے

مواد کی فراہمی میں آپ نے ہزاروں روپیے خرچ کئے تھے اور خرابیِ صحت کے خیال سے آپ اس کام کو بعجلت کر رہے تھے، مگر افسوس کہ پیامِ اجل آ پہونچا اور مرحوم کی مساعی کے باوجود یہ کام نامکمل رہ گیا۔ برج بھاشا کے قواعد اور ایک لغت بھی لکھنے کا ارادہ تھا مگر افسوس کہ وہ بھی پورا نہ ہوا۔

برج بھاشا کے علاوہ آپ کو پراکرت بھاشا میں بھی کافی دخل تھا۔ پرانے سنگی کتبہ جات کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ آپ کی شاعرانہ لیاقت کا اندازہ تو اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر گریرسن نے آپ کے چند قواعد شاعری کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

بحیثیت شاعر مشاعروں سے اُنھیں قدرتی دلچسپی تھی، جن کی وہ اکثر صدارت بھی فرماتے تھے۔ مگر یہ صدارت مشاعروں تک ہی محدود نہ تھی۔ آپ ۱۹۳۱ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے بھی صدر منتخب ہوئے تھے، جس کا سالانہ اجلاس اُسی سال کلکتہ میں ۲۶ لغایت ۲۹ مئی کو ہوا تھا۔ اسے ہندی کی ادبی دنیا کا اعلیٰ ترین اعزاز سمجھنا چاہیئے۔

ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے قیام میں جن چند اولوالعزم نوجوانوں کا ہاتھ تھا اُن میں سے ایک رتناکر جی بھی تھے۔ اُسی علمی جماعت نے جب رسالہ سرسوتی کا اجرا کیا تو اُس کے ادارہ میں رتناکر جی بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے کئی سال تک "ساہتیہ سدھاندھ" نامی ماہوار رسالہ بھی ایڈٹ کیا تھا۔

افسوس کہ ایسی بیش بہا شخصیت کو موت کے بیدرد ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا۔ اُن کی صحت تو مستقل طور پر خراب تھی ہی، ۲۱ - جون ۱۹۳۲ء کو ان کا ہردوار میں سورگباس ہو گیا۔ ۱۹۳۲ء کا سال عموماً کل ہندی دنیا اور خصوصاً ہمارے صوبہ کے ہندی طبقہ کے لئے نہایت نامبارک ثابت ہوا جو جو برگزیدہ ہستیاں اُس سال اُٹھ گئیں وہ سب اپنے اپنے رنگ میں یکتا تھیں۔ پنڈت پدم سنگھ شرما، پنڈت کشوری لال گوسوامی، رتناکر جی، شنکر جی یہ سب ہمارے صوبہ کے لوگ تھے اور ایسے لوگ تھے جن پر دنیا کی ہر قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

ماں کی بے چینی

(از شریمتی شیو کماری دیوی دختر حضرت جگر بریلوی)

گیارہ بجے دن کا وقت ہے۔ ہر سروپ بیس بائیس سال کا لڑکا جو کرانت کاری ہے کھدر پوش ہوکر بال سنوارتا ہوا گھر سے چلنے کو تیار ہوتا ہے۔ ماں پوچھتی ہے "بیٹا کہاں جاتے ہو؟"

لڑکا:۔ "کہیں نہیں"

ماں:۔ "کہیں تو ضرور، آخر کب تک آؤ گے؟"

لڑکا:۔ "تین بجے تک"

ہر سروپ چلا جاتا ہے، شام ہوگئی لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ ماں بے چین ہے۔ جیوں جیوں رات ہوتی جاتی ہے ماں کی بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ رات کا کھانا بھی اُس نے نہیں کھایا۔ مکان میں دو جھروکے ہیں جن سے سڑک دکھائی دیتی ہے۔ ماں نے وہیں ٹاٹ ڈال لیا ہے۔ نیند زور کرتی ہے تو وہ لیٹ جاتی ہے، پھر چونک کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور جھروکوں سے دیکھنے لگتی ہے۔ اس کے دل میں ہر سروپ کی گرفتاری کا خوف چھایا ہوا ہے۔ کرانت کاریوں کے جو انجام ہو رہے ہیں اُن کو سوچ کر دل میں دھڑکن ہونے لگتی ہے۔

رات بیت گئی لیکن ہر سروپ پلٹ کر نہیں آیا، ماں میں ضبط کی طاقت نہیں رہی وہ بار بار روتی ہے کسی کا سمجھانا بجھانا کارگر نہیں ہوتا، کیونکہ دہشت انگیزوں کی سلامتی کا ایشور ہی مالک ہے۔

ہر سروپ کے دو چھوٹے بھائیوں کو اسکول جانا ہے۔ نو بجے کھانا تیار ہو جانا چاہیئے۔ غمگین ماں مجبوراً جھروکوں کے پاس سے اُٹھ کر گھر کے کام دھندے میں مشغول ہو جاتی ہے مگر آنکھ سے آنسو نہیں تھمتے۔ ٹھہر ٹھہر کر جھروکوں سے دیکھ آتی ہے۔ ترکاری بنائی جاتی ہے۔ روٹی پکائی جاتی ہے مگر آنسو ہیں کہ بہے جاتے ہیں اگر کوئی ہر سروپ کا حال پوچھ بیٹھتا ہے تو ہوک بھر کر سر ہلا دیتی ہے۔ آنسو اور بھی اُبل پڑتے ہیں۔ اسی حالت میں اس نے دونوں چھوٹے بیٹوں کو کھانا کھلایا۔ ایک اسکول گیا اور سب سے چھوٹا لڑکا شانتی سروپ ماں باپ کے کہنے سے ہر سروپ کو تلاش کرنے کے لئے شہر روانہ ہو گیا۔

ہر سروپ کے باپ سرکاری پنشنر ہیں، فکر و تشویش سے پریشان ہیں لیکن خود دریافت حال کے لئے گھر سے نہیں نکلتے، یہ خوف دامنگیر ہے کہ کہیں پوچھ گچھ میں سرکاری پنشن پر حرف نہ آئے۔ بچارے ایک چٹائی پر بیٹھے رام رام لکھ رہے ہیں۔ ہر سروپ کی ماں جھروکوں کے پاس بیٹھی ہے، دن کے گیارہ بجے ہونگے۔ شانتی سروپ ہر سروپ کے دوست کے ساتھ آتا ہے۔ ماں منتیں کرکے پوچھتی ہے

"بھیا ہر سروپ کی کچھ خبر ملی؟"

دوست:۔ "نہیں میرے یہاں تو وہ کئی روز سے نہیں گئے"

ماں:۔ "تم کو معلوم ہے وہ کہاں کہاں جاتا ہے؟"

دوست:۔ "ہر سروپ کے تین چار ملنے والے چوک میں رہتے ہیں، وہاں شاید کچھ پتہ چلے"

ماں:۔ "اچھا بھیا ذرا وہاں بھی دیکھ آؤ، میں تمہارا بڑا گن مانونگی"

ہر سروپ کا دوست اور شانتی سروپ دونوں جاتے ہیں، ہر سروپ کے دوستوں کے یہاں تلاش کرتے ہیں، لوکل اخبار کے رپورٹر سے پوچھتے ہیں، پولیس کی چوکیوں پر دیکھتے ہیں، غرض ہر جگہ تلاش کرتے ہیں مگر سب بے سود، دو تین بجے گھر واپس آتے ہیں، ماں نے ابھی تک دانہ پانی نہیں کیا اور نہ اسکی آنکھوں سے آنسو بند ہوئے۔ کچھ ہمدردوں نے زبردستی پانی پلا دیا ہے۔ اب اُس کا خوف یقین کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے، اور سب یہی سمجھتے ہیں کہ یا تو ہر سروپ گرفتار ہو گیا یا کرانت کاریوں کی کسی کارروائی کے سلسلہ میں کہیں باہر چلا گیا ہے۔ رات ہو گئی اب اُس کی واپسی کی کسیکو امید نہیں۔ نو بجے کے وقت وہ اچانک آ جاتا ہے، سب لوگ خوش ہو جاتے ہیں، ماں اُٹھ کر ڈگڈگا کے پانی پیتی ہے۔

دُعا

جہاں قلب بے خوف ہے، اور سر بلند رہتا ہے۔ جہاں علم پابندیوں سے آزاد رہتا ہے۔

جہاں دنیا تنگ دیواروں سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم نہیں ہوئی

جہاں الفاظ صداقت کی گہرائی سے نکلتے ہیں

جہاں ان تھک کوشش کمال حاصل کرنیکے لئے اپنے ہاتھ ہمیشہ پھیلائے رہتی ہے۔

جہاں تو نفس کو برابر وسیع ہونیوالے تخیل و عمل کی طرف رہنمائی کرتا ہے

اے میرے آقا میرے ملک کو آزادی کی ایسی بہشت میں بیدار کر۔

خوابِ راحت

(از بندلیشری پرشاد تمبوری از لسواں)

"پران ناتھ! تم مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں جانے کا ارادہ کر رہے ہو، دیکھو اندھیری رات ہے آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں، بجلی چمک رہی ہے۔ موسلادھار بارش ہو رہی ہے، کلیجہ کانپ رہا ہے، دل دہلا جاتا ہے۔ ٹھہرو، پران پیارے ٹھہرو، یہ وقت کہیں جانے کا نہیں ہے۔ اگر تم کو اِس منحوس صورت سے نفرت ہے تو یہ داسی بھی رخصت کی طلبگار ہے۔ جب تم نے مجھ سے منہ پھیر لیا تو اب میں بھی جا رہی ہوں۔ وہ گھڑی بہت جلد آنے والی ہے جب تمہارے کان میری موت کی خبر سنیں گے۔ اور یہ آنکھیں جن پر بے مروتی کا پردہ پڑا ہے مجھے کہیں نہ دیکھیں گی۔"

"ٹھہرو، ٹھہرو! میرے دل آرام ٹھہرو! مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو! میری دلی امید کے سہارے، میری جان، میرے ایمان، ذرا ٹھہرو! تمہاری اچانک آمد نے میرے دل میں عجب اضطراب پیدا کر دیا، تمہارے حسن کی تجلی نے آئینہ کی طرح حیران و ششدر کر دیا ہے۔"

"پران پیارے! تمہارے قدموں نے اِس اُجڑے جھونپڑے کو رشک روضۂ رضوان بنا رکھا ہے۔ خزاں میں بہار کا عالم پیدا کر دیا ہے۔ تمہارے بغیر میں اپنی زندگی کی گھڑیاں کیونکر گذار سکوں گی۔ کس طرح اس ویرانے میں دل کو بہلاؤں گی؟

میں اور میرا دل تمہاری محبت کی مضبوط زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے، ڈر رہی ہوں کہ کہیں یہ ظالم آسمان دونوں کو یکجا دیکھکر حسد نہ کرے، اُس کی آنکھوں میں خون نہ اُتر آئے اور اس مضبوط رشتے کو کچے دھاگے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دے۔"

"افسوس، صد افسوس، تمہاری سنگدلی سے میرا شیشۂ دل چور چور ہو گیا، مگر تمھیں ذرا بھی رحم نہ آیا۔"

"میں نہیں چھوڑ سکتی، ہاں نہیں چھوڑ سکتی، جیتے جی نہیں چھوڑ سکتی، تمہاری ساری کوششیں بیکار ہیں۔"

"بیرحم۔ بیرحم"

"ہاں۔ تم بے رحم ہو!"

دُور ہو بے وفا کی محبت میرے دل سے دُور ہو، ایک نازک دل کو چرانے والی شیشۂ دل کو سنگِ بیوفائی سے توڑنے والی پریت! میرے سینے سے نکل جا، اے میرے پیمانۂ دل میں چھلکنے والی محبت کی شراب لو اپنا نشہ کم کر، نہیں تو تجھ میں غیظ و غضب کی ترشی پیدا ہونیوالی ہے۔ نادان تیری قربت نے مجھے سیماب بنا رکھا ہے“

(۲)

تین سال کی ستم رسیدہ بیوہ زملا کو خواب میں آئے ہوئے اُس کے پران ناتھ نرینہ نے اپنے پیروں سے اُٹھا کر آغوشِ محبت میں لینا چاہا۔

نرینہ کا آغوشِ محبت اُس کے لئے موت کا آغوش تھا۔

(۳)

اُفقِ مشرق پر صبح کے آثار نمودار ہو گئے۔ بزم انجم درہم برہم ہو گئی۔ طائرانِ خوش الحان شہ خاور کے خیر مقدم کے لئے نغمہ سرائی کرنے لگے، مندروں سے نالۂ ناقوس اور مسجدوں سے صدائے اذان بلند ہوئی زملا کی ساس بڑبڑاتی اور کوستی ہوئی آئی کواڑوں پر پیر کی ایک زور سے ٹھوکر لگائی، وہ دھڑاکے کی آواز کے ساتھ کھلے۔

بڑھی نے قہر آلود نگاہوں سے زملا کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی چادر کا کونا پکڑ کر جھٹکے سے کھینچا، لیکن اُس کے بے جان قالب کو اُس پھول کی طرح دیکھ کر جو رات بھر بزم طرب کو معطر رکھکر صبح مُرجھایا ہوا فرش پر پڑا ہو، دانتوں تلے انگلی داب کر سکتے کی حالت میں رہ گئی۔

نغمۂ محبت

مجھے دریا کا وہ سنسان خاموش اور ریگستانی ساحل محبوب ہے جہاں صبح کا بحر خموشی جگنوں اور بطوں کی ننھی ننھی امواج نغمہ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جہاں شام کے دلنواز نظارہ میں تھکے ماندے شکاری اپنی کشتیاں کنارہ پہ لاکر لمبی لمبی گھانس پر آرام لیتے ہیں۔

تمہیں دریا کا وہ ساحل محبوب ہے جہاں بانس کے گنجان درخت اپنے بازو پھیلائے ہوئے سایہ فگن رہتے ہیں جہاں دیہاتی عورتیں صبح و شام اپنے گاگریں میں پانی بھر کر لے جاتی ہیں۔ گو ساحل دو ہیں مگر دریا ایک ہی جو دونوں کے درمیان بہتا ہے اور وہ دونوں کو ایک ہی گیت سناتا ہے۔ میں نے وہ گیت تاروں کی انجمن میں رتیلے ساحل پر لیٹے ہوئے سنا اور تم نے اسی گیت کو حیائے اولیں میں ساحل کے ڈھلاؤ، کنارہ پر بیٹھے ہوئے۔ لیکن جو کچھ میں نے سنا اُس سے تم بالکل بیگانہ ہو اور جو تم نے سنا

والنٹیر

(ایک قصہ)

(از جناب جے کرشن صاحب فتحپور)

بابو جگت نراین وکیل کے دروازے پر والنٹیروں کا ایک جم غفیر جمع تھا جن کے گلے میں پرتلے اور سینوں پر ایک چھوٹا سہ رنگا امتیازی پھول اُن کی قومی جانبازی کا نمونہ پیش کر رہا تھا، کچھ ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے، کچھ آپس میں بیٹھے متانت سے کسی اہم مسئلہ پر غور کر رہے تھے، کہیں کہیں سے تماشائیوں کے قہقہوں کی ناخوشگوار آوازیں آ رہی تھیں۔

اتنے میں تین چار آدمی وہاں آئے، ایک شخص بابو تربینی پرشاد سوشل ریفارم لیگ کے سکریٹری نے سیٹی بجائی جس سے والنٹیروں پر خاموشی کا عالم طاری ہوگیا اور جو جہاں تھا وہیں رہ گیا، اس کے بعد بابو تربینی پرشاد بلند اور پرجوش آواز میں بولے "آپ صاحبان بیٹھ جائیں اور غور سے ہمارا فیصلہ سنیں" یہ سنکر سب ایک چبوترے پر بیٹھ گئے، وہ بولے "بھائیو! اس وقت ہماری لیگ کی زندگی اور موت کا سوال ہے، یہی ہمارے امتحان کا موقعہ ہے، اگر اس وقت ہمارے پیر ذرا بھی لغزش کھا گئے تو اس سے بڑھکر ہمارے لئے اور کون شرم کی بات ہوسکتی ہے، بولئے آپ لوگ اس غریب قوم کی خدمت کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟" والنٹیروں نے ایک زبان ہوکر کہا "جیتے جی ہم اس کی خدمت سے منہ نہ موڑینگے" "ہمیں آپ لوگوں سے ایسی ہی اُمیدیں ہیں، خدا آپ کو اپنے ارادے پر اٹل رکھے۔ اچھا تو سنئیے۔ رائے بہادر نے کہا ہے وہ ہمارے والنٹیروں کو پھاٹک کے اندر نہ جانے دیں گے۔ اور اگر کوئی اندر داخل ہوا تو مار ڈالیں گے۔"

"ہم موت کے منہ میں خوشی سے جائیں گے"۔ والنٹیروں نے جوش سے کہا۔

"اب سوال یہ ہے کہ پھاٹک کے اندر کیسے جایا جائے!"

"ہم لوگ زبردستی گھس جائیں گے۔"

بابو تربینی پرشاد نے تحکمانہ انداز سے کہا، "خبردار، جن کو ایسا کرنا ہو وہ اسی وقت یہاں سے چلے جائیں

والنٹیر دم بخود ہو گئے۔

اُنھوں نے پھر کہنا شروع کیا" ہماری لیگ کے قواعد میں جبر و تشدد جائز نہیں ہے، جن والنٹیروں سے ذرا بھی کسی قسم کی ناخوشگوار حرکت ظہور میں آئی لیگ اُنھیں سخت سزا دے گی۔ اچھا سنیئے آپ لوگ اسی وقت اپنے پرتلے اور بھول اُتار لیجیئے اور کالی جھنڈیاں جیبوں میں رکھ لیجئے۔"

والنٹیروں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

بابو تریبنی پرشاد:۔" اب ہر شخص ہمیں نہیں پہچان سکے گا، ہم تماشائیوں میں ملکر موقع کا انتظار کریں گے، جس وقت دیکھیں گے کہ دروازہ میں اکیاون سے باون ہوئے، میں سیٹی بجاؤں گا، اُس وقت آپ لوگ فوراً اپنے پرتلے پہن کر جھنڈیاں نصب کر لیجئے گا۔"

یہ کہکر وہ ذرا رُکے، پھر جوش سے بولے:۔" اگر اُن کی طرف سے کوئی سختی شروع کی جائے تو فوراً زمین پر لیٹ جائیے گا۔"

یہ کہتے کہتے اُن کی پیشانی پر پسینہ آگیا اور سانس تیزی سے چلنے لگی۔

والنٹیروں نے کہا:۔" ہم ایسا ہی کریں گے۔"

آپ صاحبان میں سے جو صاحب اس کے لئے تیار نہ ہوں وہ ہرگز ہمارے ساتھ نہ چلیں۔"

ہم سب اس کے لئے تیار ہیں" اُن کی آواز سے آسمان گونج اُٹھا۔

(۲)

آج رائے بہادر بابو اُتم چند کی لڑکی کی شادی ہے، شام کا وقت ہے۔ دوار پوجا کی تیاریاں ہو رہی ہیں، بجلی کے قمقموں سے کوٹھی اور باغ جگمگا رہے ہیں، پھاٹک پر بجلی کی روشنی سے جلی حروف میں خوش آمدید لکھا گیا ہے۔ رائے بہادر صاحب نے کوٹھی کی آرائش میں ہزاروں روپیہ پانی کی طرح بہا دیا ہے۔

حکام کو پارٹی دی گئی ہے، دعوت کا سارا انتظام رائل ہوٹل کے منتظمین کے ہاتھ میں دیا گیا ہے، اوسط درجہ کے لوگوں کا بھی کافی خیال رکھا گیا ہے، اُنھیں شربت اور پان تقسیم ہونگے۔ یکایک باجوں کی خوشگوار آوازیں آئیں، آتشبازی چھٹنے لگی، جناتیوں میں ہل چل مچ گئی۔

ذرا دیر میں برات دروازہ پر آگئی، نوشہ ایک سجی ہوئی خوبصورت موٹر میں ہاروں اور پھولوں سے لدا بیٹھا تھا۔ گویا پھولوں کا دیوتا ہے۔ بینڈ بج رہا تھا، عورتیں استقبال کے لبھاتے راگ الاپ رہی تھیں۔ نوشہ چوک پر بیٹھا، طرفین کے پروہتوں نے ضروری مراسم ادا کرنے شروع کر دیے۔ اُدھر مہمان میزوں پر چنی ہوئی طشتریوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔

رائے بہادر صاحب کے منیم جی نے زری کے کام کا ایک عمدہ دوشالہ نکالکر ایک چاندی کے
تھال پر رکھا اور ایک تھیلی سے روپیہ شمار کر کر کے اس پر رکھنے لگے۔ ہزار ہزار کی سات قطاریں چنی گئیں

(۴)

دفعتاً سیٹی کی ایک آواز آئی۔ بھیڑ میں چھپے ہوئے والنٹیروں نے پرتلے اور پھول پہن لیئے
اور کالی جھنڈیاں نصب کرلیں۔ بابو تربینی پرشاد چوک کے پاس آئے۔ رائے بہادر صاحب نے انھیں دیکھا
تو آگ ہو گئے، وہیں سے بولے "بابو صاحب۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہاں آپ لوگوں کی لیگ
کام نہ آئے گی، ہمارا جو جی چاہیگا کریں گے، آپ مخل ہونیوالے کون؟"

بابو تربینی پرشاد نے نرم لہجہ میں جواب دیا: "رائے بہادر صاحب۔ آپ زیادہ سے زیادہ ایکاؤن
روپیہ دے سکتے ہیں، اس سے زیادہ کی اجازت لیگ آپ کو نہیں دیتی۔"

رائے بہادر صاحب کڑک کر بولے: "ہم لیگ کے ماتحت نہیں ہیں۔"

"آپ ناراض نہ ہوں۔ لیگ کے قواعد کی پابندی ہمارا فرض ہے۔" مجمع سے آواز آئی "شرم، شرم"
والنٹیروں نے کالی جھنڈیاں اوپر اُٹھالیں۔ رائے بہادر صاحب نے جب والنٹیروں کا ٹڈی دَل
دیکھا تو آپے سے باہر ہو گئے۔ بولے "آپ انھیں یہاں سے دُور کردیں ورنہ ناحق کسی کا خون ہو جائیگا"

بابو تربینی پرشاد کچھ بولنے بھی نہ پائے تھے کہ آواز آئی: "جان دیے بغیر ہم یہاں سے نہیں جاسکتے"
یہ سُن کر رائے بہادر صاحب نے بھوکے شیر کی طرح اُن کی طرف دیکھا، پھر کڑک کر بولے "دیکھو، پانچ
منٹ کے اندر تم یہاں سے چلے جاؤ ورنہ تمہاری خیر نہیں۔"

والنٹیر جیوں کے تیوں کھڑے رہے۔

پھر وہ اپنے نجی سپاہیوں کی طرف دیکھکر بولے "انھیں مار کر یہاں سے نکال دو۔ اگر ایک بھی رہ گیا
تو تمہاری خیریت نہیں۔"

سپاہی سناٹے میں آگئے، یہ دیکھکر رائے بہادر صاحب غصہ سے کانپتے ہوئے اُن کی طرف بڑھے،
اُنھیں اپنی طرف آتا دیکھکر اُجڈ سپاہیوں نے ڈنڈے برسانے شروع کردیئے، بابو تربینی پرشاد اُٹھکر کھڑے ہو گئے
اور کسی اشارے کے لئے سیٹی بجانے کے لئے مُنہ میں لگائی ہی تھی کہ ایک ڈنڈا سر پر پڑا۔ ڈنڈا لگتے ہی
وہ چکرا کر زمین پر گر پڑے، بابو جگت نرائن نے اُن کی سیٹی لیکر زور سے بجائی، سب کے سب والنٹیر لیٹ گئے۔
حکام پہلے ہی کھا پی کر چلے گئے تھے، تماشائیوں میں بھگدڑ مچ گئی، چند منٹوں میں وہاں سوائے چند
براتیوں اور لیٹے ہوئے والنٹیروں کے اور کوئی نہ دکھلائی دیا۔

---

(۴)

چوک پر روپیہ پھینکنے کی آواز آئی۔ نوشہ نے کُل روپیہ پھینک دیا اور اُٹھ کر کھڑا ہونے ہی والا تھا کہ رائے بہادر صاحب بولے "بیٹا کیوں بد شگونی کرتے ہو"

نوشہ نے ذرا تُرش لہجہ میں جواب دیا "میں یہاں دوسرے کی جان لینے نہیں آیا" اس کی آواز رقت سے بند ہوگئی۔

رائے بہادر صاحب لاپروائی سے بولے: "جب تک انھیں یہاں سے دُور نہ کردوں گا مجھے چین نہ آئے گا"

"تو مجھے بھی انھیں میں سے ایک سمجھئے" یہ کہکر وہ زبردستی اُٹھا اور جہاں والنٹیر لیٹے تھے وہیں جاکر لیٹ گیا، باپ سر پکڑ کر بیٹھ گیا، کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس سے کچھ کہتا۔

شادی کے گھر میں ماتم منایا جانے لگا، دروازے پر براتی اکیلے خاموش بیٹھے تھے، سب کی زبانیں بند تھیں، عورتوں میں کہرام مچ گیا۔ رائے بہادر صاحب کی بیوی نے جب یہ سُنا تو غش کھا کر زمین پر گر پڑیں۔

ادھر سپاہیوں نے اپنی کارگذاری جاری رکھی۔ لیکن والنٹیر لیٹے ہی رہے۔ جانبازانِ قوم کی زبان سے اُف تک نہ نکلی۔

دو ڈھائی سو والنٹیروں کے درمیان اُنھوں نے نوشہ کا خیال نہ کیا، دھوکے سے لاٹھی کی ایک ضرب اس کے سر پر بھی لگی، لیکن وہ خاموش رہا، والنٹیروں نے جب دیکھا کہ نوشہ زخمی ہوگیا تو اُسے اُٹھانے کو دوڑے، لیکن وہ نہ اُٹھا اور بولا "مجھے بھی اپنے ساتھ رہنے دیجئے" اُنھوں نے اُسکو اُٹھانے کی ہر چند کوششیں کیں لیکن ناکامیاب رہے، تب اُس کے سر پر رومال باندھ دیا، عزیز رشتہ دار سبھی پریشان تھے لیکن کسی کی ایک نہ چلتی تھی۔

مار پیٹ بند ہوگئی، سپاہیوں کے جوش ٹھنڈے ہوگئے، اور سب اپنی اپنی بچت کی صورتیں سوچنے لگے۔ رائے بہادر صاحب غصّہ سے بھرے اندر بیٹھے تھے، ایک ملازم نے آکر اُن سے سارا حال بتلایا، وہ کچھ نہ بولے، خاموش بیٹھے رہے، اُن کی بیوی ابتک بیہوش تھیں۔

آخر پتھر پسیجا، اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے آپ ہی آپ ٹپک پڑے، وہ اُٹھے اور دیوانہ وار اس زخمی نوشہ کے پاس پہونچے۔ ایسی سکون اور اطمینان کی مورت اُنھوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، اُن کا دل رو دیا۔ آنکھیں دل کا یہ بار نہ سنبھال سکیں، غم سیلاب بن کر آنکھوں سے

نکل پڑا۔ وہ روتے ہوئے داماد کی طرف جھکے اور رقت آمیز لہجہ میں بولے "بیٹا مجھے معاف کرو"

اُس نے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کرلیں۔

وہ پھر گڑگڑا کر بولے "بیٹا میں نے ایک بڑی غلطی کی ہے۔ مجھے معاف کرو"

وہ اُٹھنے کی کوشش کرتا ہوا نحیف آواز میں بولا "میں معافی دینے والا کوئی نہیں ہوں، آپ اُن (والنٹیروں کی طرف دیکھکر) سے معافی مانگیئے"

یہ سُنکر سب کے سب والنٹیر اُٹھ بیٹھے۔ رائے بہادر صاحب اُن کی طرف مخاطب ہوکر عاجزانہ لہجہ میں بولے "میری آنکھیں کُھل گئیں آپ مجھے معاف کریں" یہ کہکر وہ بابو تربینی پرشاد کے قدموں کی طرف بڑھے، بہادر سپاہی اِس نظارہ کی تاب نہ لاسکا وہ رائے بہادر صاحب کے گلے سے لپٹ گئے، دونوں کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے، یہ فتح کے موتی تھے۔

والنٹیروں میں پھر وہی تازگی آگئی، نوشہ بھی اُٹھکر کھڑا ہوگیا۔ براتی اور جناتی گلے ملنے لگے۔ بابو تربینی پرشاد نے نوشہ کو گلے سے لگالیا اور مسکراتے ہوئے بولے "ہمیں ایسے ہی زخمی نوشہ کی ضرورت ہے"

اُس نے آنکھیں نیچی کرلیں،

پھر وہی دلکش نغمے شروع ہوگئے، پنڈتوں نے منتر پڑھے، دوار پوجا شروع ہوگئی۔ اس مرتبہ رائے بہادر صاحب نے صرف ایک روپیہ لڑکے کے ہاتھ میں رکھا، نوشہ نے مسکراتے ہوئے روپیہ لے لیا۔

یکایک والنٹیروں کی شیریں آواز آئی "رائے بہادر صاحب نوشہ مبارک ہو"

نذر

لڑکے نے کہا "ابا مجھے کیا دیجیئے گا؟" میں نے اُسے اپنی گود میں اُٹھالیا۔ دوست نے کہا "مجھے کیا عنایت ہوگا؟" میں نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ بھائی نے کہا "مجھے کیا ملے گا؟" میں نے اُٹھکر اُسے اپنے سینے سے لگالیا۔ ماں نے کہا "بیٹا مجھے کیا دوگے؟" میں نے جُھک کر اس کے قدم چوم لیئے۔ بیوی بولی "آخر میرا حصّہ؟" میں نے محبت سے اُس کا بوسہ لے لیا۔ اتنے میں ایک آواز آئی "میرے لئے بھی تیرے پاس کوئی تحفہ ہے؟" یہ سُنکر میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔!

(ٹیگور)

تنقید کتب

ڈاکٹر بیلی کی تاریخ ادبیاتِ اردو

(از سید وحید صاحب اکبرآبادی ایڈیٹر علیگڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

کسی زبان میں جس قدر زیادہ دوسری زبانوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت ہوگی اُسی قدر سُرعت کے ساتھ وہ ترقی کرتی ہے۔ اگرچہ انگریزی زبان یوروپ کی سب سے زیادہ دلکش، لطیف اور شیریں زبان نہیں تاہم یوُرپ کی دوسری تمام زبانوں کی بہ نسبت اس میں دوسری زبانوں سے فائدہ اُٹھانے کی زیادہ صلاحیت موجود ہے۔ انگریزی کی طرح اُردو کے فروغ اور ترقی کی یہی وجہ ہے، اسی سبب سے وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی بہ نسبت زیادہ ہر دلعزیز ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو زیادہ تر شمالی ہندوستان کی زبان ہے، مگر یہ خیال درست نہیں، کیونکہ دکن کے اُردو شعرا اور مصنفین کی تصانیف دیکھکر یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ دہلی و لکھنؤ اسکول کی طرح وہاں بھی اُردو کا ایک اسکول تھا بلکہ بعض محققین تو دکن ہی کو اُردو کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ شمالی ہندوستان میں اُردو سب سے زیادہ بولی اور پڑھی جاتی ہے مگر چار دانگ ہند میں اُردو کچھ نہ کچھ رائج ضرور ہے۔

ہندوستان کوئی چھوٹا سا ملک نہیں بلکہ ایک براعظم ہے، اگر اتنی بڑی سرزمین میں بعض صوبے ایسے موجود ہوں جہاں ان صوبوں کی زبان کے مقابلے میں اُردو کو فوقیت نہ ہو۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اُردو ملکی زبان نہیں۔ بہرحال چند صوبوں کو چھوڑ کر جو زبان طول وعرض ہند میں بولی پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہ اردو ہے جو ملک کی دو مخصوص قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہوتی تو اُن کے تنزل کے ساتھ اس پر بھی تنزل آجاتا، مگر صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی اور وہ ہندوستانیوں کی زبان ہے اور رہیگی۔

افسوس ہمارے پاس اُردو زبان کو فروغ دینے کے وہ ذرائع موجود نہیں ہیں جو آزاد قوموں

کو حاصل ہیں اس پرکھوہ برابر ترقی کر رہی ہے، اور انگریز محققین کو بھی اس کے نشوونما اور توسیع و ترقی سے پوری دلچسپی ہے۔

حال میں لندن اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کے جہاں مشرقی زبانوں کی محققانہ تعلیم کا خاصا انتظام ہے پروفیسر جناب ٹی۔ گراہیم بیلی صاحب استاد اردو ہندی نے اُردو زبان کی ایک مختصر تاریخ لکھی ہے جس پر ہم ایک اجمالی تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ہیریٹیج آف انڈیا سیریز میں شامل کی ہے، چونکہ یہ سلسلہ اختصار کے ساتھ مرتب کیا جاتا ہے لہذا ڈاکٹر بیلی صاحب نے بھی اردو زبان و ادب کی ساری تاریخ کو ایکسو بیس صفحات میں کسی نہ کسی طرح نچوڑ کر رکھدیا ہے جو قابلِ تعریف ہے۔

اِس کتاب میں ابتدائے زبان سے لیکر ۱۹۲۸ء تک کے اُردو ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے، اگرچہ مصنف نے اقبال کے سوائے موجودہ زندہ مصنفین و شعرا کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ساری کتاب آٹھ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ ابتدا میں ایک دیباچہ ہے اور بعد میں ایک مقدمہ، مقدمے میں ڈاکٹر صاحب نے ان مشکلات کا ذکر کیا ہے جو مطالعہ و تحقیقِ اُردو میں واقع ہوتی ہیں۔ مثلاً ابتدائی ادوار کے متعلق ہمیں بہت کم ادب دستیاب ہوتا ہے؛ قلمی نسخے بہت کم ملتے ہیں؛ تاریخوں کے متعلق قابل اعتماد معلومات نہیں ملتی، وغیرہ۔ ابتدائی ادوار کے متعلق ایک دُور دراز ملک میں تحقیقات کرنا بہت مشکل کام ہے۔ گو انگلستان میں بھی ہمیں بہت سے قلمی نسخے ملتے ہیں، مگر تاریخ ادب مرتب کرنے کے لئے وہ بالکل ناکافی ہیں، جب تک کہ ہندوستان کی لائبریریوں کو نہ چھانا جائے کماحقہ تحقیق ناممکن ہے۔ ابتدائی دَور کے متعلق جس قدر تحقیقات مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقیِ اُردو نے کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس دور کے متعلق آپ کے پاس ایک کافی ذخیرہ بھی موجود ہے اس لئے اگر ڈاکٹر صاحب مولوی صاحب موصوف سے استفادہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ بہرحال چونکہ انھیں اختصار سے کام لینا تھا اس لئے ابتدائی دَور کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اِس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل مصنف کو اس دَور کے متعلق جو بھی مسالہ ملا اُس سے اُنھوں نے فائدہ اُٹھایا، اور اسے کامیاب بنانے میں پوری کوشش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے زبان اُردو کے ارتقا کے متعلق مولانا محمود شیرانی کے نظریہ کو تسلیم کر لیا ہے، یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ اس کی صحت کے متعلق بحث کیجائے بہرحال ڈاکٹر صاحب مسلمانوں کے ہندوستان میں داخلہ اور اُن کے قیامِ پنجاب سے یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ اول اول اُردو زبان یہیں پیدا ہوئی، بعد ازاں آگے بڑھی۔

پہلے باب میں اُردو کی ابتدا اور لفظِ "اُردو" سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں اُردو کے ابتدائی دَور کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول "دَورِ مذہبی" دوم "دَورِ ادبی"۔ مذہبی دَور میں شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، عبداللہ حسینی، شاہ میرانجی شمس العشاق، شاہ برہان، شیخ فریدالدین شکر گنج، شیخ عثمان وغیرہ، ان بزرگوں کو شامل کیا ہے، یہ دور ۱۳۵۰ء سے ۱۵۹۰ء تک ہے۔ دَورِ ادبی میں قطب شاہی شعراء، عادل شاہی شعراء، دورِ مغلیہ اور ولی کے دَور کو شامل کیا ہے۔ یہ دَور ۱۵۹۰ء سے ۱۷۳۰ء تک ہے۔ ان دو دَوروں میں ڈاکٹر صاحب نے کافی تحقیق و تجسس سے کام لیکر بانوے ۹۲ بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصے کو کتاب کی جان کہنا چاہیئے۔

تیسرے باب میں شعرائے دہلی کی پہلی صدی پر روشنی ڈالی ہے، اس میں چھتیس ۳۶ شعراء کا تذکرہ کیا ہے۔ اس صدی کو حسب دستور تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی دَورِ حاتم، دورِ چہار ارکان اردو "مظہر سودا، میر اور درد" دَورِ مصحفی، انشا و نظیر (اگرچہ نظیر آگرہ کے تھے مگر چونکہ شاعری کا مرکز دہلی تھا لہذا اس دَور میں انھیں بھی شامل کر لیا ہے)

چوتھے باب میں انیسویں صدی کے بتیس ۳۲ شعرائے لکھنؤ کا تذکرہ ہے۔ پانچویں باب میں دہلی کے دوسرے دَور کا ذکر ہے جس میں ذوق۔ غالب۔ مومن۔ ظفر۔ تسیم۔ تسکین۔ شیفتہ۔ آزردہ۔ ساکت۔ ضیاء الدین رخشاں۔ ثاقب۔ ذکی۔ ظہیر۔ امراؤ مرزا۔ انور۔ اور مجروح کا مختصر ذکر ہے۔ اسی باب کے دوسرے حصے میں دربار رامپور کے شعراء سے بحث کی گئی ہے، اس میں امیر، داغ، تسلیم۔ اور جلال کے حالات ہیں۔

کتاب کا چھٹا باب نثر اُردو پر مشتمل ہے، جس کے تین حصے کئے گئے ہیں پہلے حصے میں ابتدائی نثار مثلاً خواجہ بندہ نواز۔ شاہ میرانجی۔ شاہ برہان۔ وجہی، عبداللہ، ولی اللہ قادری جیسے بزرگوں کا ذکر کرنے کے بعد میر جعفر زٹلی، فضلی، محمد حسین کلیم، سودا اور تحسین کی نثر نویسی کے متعلق بحث ہے۔ دوسرے حصے میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کا ذکر ہے، تیسرے حصے میں انیسویں صدی کے نثاروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں اول تین یعنی مولوی اسمٰعیل، شاہ رفیع الدین۔ اور شاہ عبدالقادر مذہبی ادب کے لکھنے والے تھے۔ بعد ازاں آشک فیض آبادی، مرزا جان طپش، انشاء، رنگین۔ گویا، سرور غالب، غلام امام شہید، رام چند، سر سید احمد، غلام غوث بے خبر، امیر مینائی، محمد حسین آزاد، چراغ علی، وقار الملک، حالی، محسن الملک، شبلی، ان بزرگوں کی ادبی خدمت کا تذکرہ کرنے کے بعد تین بڑے ناول نگار مولوی نذیر احمد، سرشار، اور شرر کی ناول نگاری سے بحث کی گئی ہے۔ امام بخش صہبائی، سجاد حسین

سید احمد دہلوی، سید علی بلگرامی، سفیر بلگرامی، اور وحید الدین سلیم کا بعد میں ذکر ہے۔

ساتویں اور آٹھویں باب بہت دلچسپ ہیں، ساتویں باب میں دور جدید سے بحث ہے جس میں حالی، آزاد، اکبر، محمد اسمٰعیل میرٹھی، درگا سہائے سرور، شوق قدوائی، شاد عظیم آبادی، عظمت اللہ خاں دہلوی علمبرداران دور جدید سے روشناس کرایا گیا ہے، اور ان کے ادبی اثر کا انکشاف کیا گیا ہے۔ آٹھویں باب میں جو خاتمہ پر مشتمل ہے اُردو ادب پر انگریزی ادب کے اثر کے متعلق نہایت اختصار کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اُردو زبان میں کن کن چیزوں کی کمی ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ گذشتہ پچیس برس میں نظم کی بہ نسبت نثر نے بہت زیادہ ترقی کی ہے، زبان بیجا قیود سے آزاد ہوتی جارہی ہے اور نئے نئے اصناف ادب اپنے میں داخل کرتی جاتی ہے ناول نگاروں میں پریم چند کا نام خاص طور سے پیش کیا گیا ہے، پریم چند اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اتفاق ہے کہ پریم چند اُس وقت تک کمال پر نہیں پہونچ سکتے جب تک کہ وہ اپنے ناول کے پلاٹ اور کرداروں کو گاؤں کی زندگی تک محدود نہ کردیں کیونکہ اسی چیز میں وہ کامیاب ہیں اور اسی کا انھوں نے بغور و خوض مشاہدہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "اُردو میں کوئی تمثیلی شاعری نہیں، تمثیلیں کافی تعداد میں لکھی جارہی ہیں، لیکن انھیں ہم ادب نہیں کہہ سکتے۔ اگر دور جدید کے اردو اہل قلم شکسپیر، ملٹن، ٹینی سن اور براؤننگ کا مطالعہ کریں تو وہ اپنے قارئین کے سامنے ایک بالکل نیا عالم پیش کرسکتے ہیں۔"

"نثر میں فلسفیانہ ادب، بے تعصبانہ تاریخ اور عمیق تنقید کی کمی ہے۔" جہاں تک تنقیدی ادب کا تعلق ہے اُردو میں بیشک اس کی بہت بڑی کمی ہے۔ سنجیدگی اور تحقیق کو پیش نظر رکھکر ہمارے ہاں تنقید بہت کم ہوتی ہے، اور ملک میں اکثر رسائل وجرائد جو اس کے اہل نہیں ہوتے تنقید میں کالم کے کالم سیاہ کردیتے ہیں، اس سے عام مذاق کو نقصان پہونچتا ہے۔ اور ادبی مطالعہ کا سچا شوق پیدا نہیں ہونے پاتا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "مصنف کے خیالات اور مفہوم سے بحث کرنے یا اُس کی مجموعی شاعری پر رائے قائم کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی، اور کی جاتی ہے تو شاذ و نادر۔ اور جب کسی شاعر کے کلام میں سے کچھ پیش کیا جاتا ہے تو یہ نہیں بتایا جاتا کہ یہ اشعار فلاں شاعر کی کس نظم میں واقع ہوئے ہیں۔ تاہم حال ہی میں اس سلسلے میں کچھ ترقی ہوئی ہے اور مستقبل امید افزا نظر آتا ہو۔ بہت سے اُردو رسالوں میں ادبی مضامین بھی شامل رہتے ہیں اور تنقید کی سطح بلند ہورہی ہے۔"

اس کے بعد آپ نے جامعہ عثمانیہ کی عدیم النظیر خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں

"اُردو کا مستقبل اُس کے بولنے اور پڑھنے والوں پر منحصر ہے، اس کے علاوہ اس کا انحصار جامعۂ عثمانیہ پر بھی ہے۔" اس کے بعد آپ نے انجمن ترقیِ اُردو کی خدمات کا بھی اعتراف کیا ہے۔

کتاب کے ختم ہونے کے بعد آپ نے اُن کتابوں کے نام گنوائے ہیں جن سے آپ نے اپنی کتاب کی تدوین میں فائدہ اُٹھایا ہے۔ اس میں انگریزی اور اُردو کی کتابوں کے علاوہ فرانسیسی کتابوں کے نام بھی دئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تصنیف سے پہلے مسٹر رام بابو سکسینہ نے زیادہ وضاحت کے ساتھ انگریزی زبان میں اُردو ادب کی تاریخ لکھی ہے، ڈاکٹر صاحب نے اِس سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن مضامین کی ترتیب و تشکیل اور اندازِ استدلال بالکل جداگانہ اختیار کیا ہے۔ اس کتاب میں اس قدر وضاحت سے کام نہیں لیا گیا ہے جس قدر کہ سکسینہ صاحب کی تصنیف میں۔ تاہم چونکہ مصنف کو اختصار مدِ نظر تھا اُنھوں نے اُردو جیسی وسیع زبان کی تاریخ کو مختصر سے مختصر پیرایہ میں بیان کر دیا ہے۔ جہاں تک اِس کتاب کے ابتدائی اَدوار کا تعلق ہے وہ اونچی جماعتوں کے طالبعلموں کے لئے بھی مفید ہو سکتی ہے۔ مگر جہاں تک بعد کے ابواب کا تعلق ہے وہ ایک ابتدائی کتاب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ تاہم کتاب اِس قدر دلچسپ ہے کہ ایک نشست میں بآسانی ختم کی جا سکتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ معلومات کے علاوہ اسے اس قدر دلنشین اور آسان انداز میں لکھا گیا ہے کہ اس کا مطالعہ بدشوق سے بدشوق پر بھی گراں نہیں گذر سکتا۔

یہاں پر نامناسب نہ ہوگا اگر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اُن چند لغزشوں کا ذکر کر دیا جائے جو کتاب میں واقع ہو گئی ہیں۔ مگر اس سے مقصد ڈاکٹر صاحب کی مساعی کی تنقیص نہیں ہے۔

مقدمہ میں جہاں ڈاکٹر صاحب نے اُردو شعر کی مخصوص صورتوں کا ذکر کیا ہے وہاں آپ نے تذکرہ، دیوان، کلیات، تخلص، اِن چیزوں کو بھی شامل کر لیا ہے۔ یہ چیزیں اصنافِ شاعری میں داخل نہیں ہیں۔ شاعری کی خاص صورتیں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، مسدس وغیرہ ہیں، دیوان شاعر کے کلام کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس کلیات، دیوان، تخلص، تذکرہ، یہ وہ الفاظ ہیں جنھیں شاعری سے الحاقی تعلق ہے۔

میر کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اُنھوں نے مرثیے نہیں لکھے، مگر ہمیں اس وقت بھی دس بارہ مرثیے ان کے ملتے ہیں جن کا معیار کافی بلند ہے۔ جہاں سودا اور میر کی غزل گوئی کا مقابلہ کیا ہے وہاں ڈاکٹر صاحب نے سودا کو بہت گرا دیا ہے، اس میں شک نہیں کہ غزل گوئی میں

میر کو ایک بہت بڑا درجہ حاصل ہے جو سودا کو نہیں۔ مگر میر کو صرف اس وجہ سے اچھا شاعر کہنا کہ اس کی غزلوں میں درد، سوز و گداز اور آہ ہے، اور سودا کو اچھا غزل گو اس لئے نہ سمجھنا کہ اس میں یہ باتیں نہیں ہیں، قرینِ انصاف نہیں۔ عاشق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ حرماں نصیب، غم زدہ اور ناکامیاب عاشق ہی ہو، عشق کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔ اگر غزلیات میں ہنسی، جوش وخروش اور امید کی جھلک ہو تو کیا ہم انھیں غزلیات نہیں کہہ سکتے؟ سودا کی غزلوں میں ہیں یہ چیزیں ملتی ہیں۔ مصحفی گونڈوی کی غزلیات کی ہم داد کیوں دیتے ہیں؟ اس لئے کہ انھوں نے غزل میں نشاط کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ حافظ، غالب وغیرہ شعرا کے ہاں کیا ہمیں مستی وجوش اور ہنسی خوشی کی باتیں نہیں ملتیں۔ کیا اس بنا پر ہم انھیں چوٹی کا غزل گو نہیں سمجھتے ہیں؟ طوالت کے خوف سے میں یہاں سودا کی غزلوں کا انتخاب پیش نہیں کر سکتا اہلِ ذوق خود اس کے کلام کو بغور مطالعہ کر کے تصدیق کر سکتے ہیں۔

سودا کے مرثیوں کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے مرثیوں کی کامیابی کا انحصار ان کی رقت پر منحصر نہیں، بلکہ رزم اور دیگر مناظر پر موقوف ہے، مرثیہ میں جنگ اور مناظر کا سماں اول اول ضمیر نے باندھا ہے سودا کے زمانے میں یہ بات مفقود تھی۔ سودا کے زمانے میں تو یہ مقولہ تھا کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" اگر شعرا مرثیہ لکھتے تھے تو ادب وتعظیم کو ملحوظ رکھ کر لکھتے تھے، انھیں تنقید کا ذرا بھی خوف نہیں تھا۔ شاعری کے خیال سے مرثیے نہیں لکھے جاتے تھے، بلکہ محض ایک مذہبی فریضہ کی ادائگی سمجھکر اِس صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی جاتی تھی۔ رزمیہ شاعری کا احساس اول اول ضمیر کو ہوا اور انیس نے اس میں چار چاند لگا دیئے

انشا کے متعلق آبحیات میں لکھا ہے کہ وہ نہایت تنگ حالی اور فلاکت کی زندگی بسر کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے بھی اس خیال کو تسلیم کر لیا ہے، مگر تحقیق نے یہ بات غلط ثابت کر دی ہے انشا اس قدر پریشان حال اور فاقہ زدہ نہیں تھے۔ اگرچہ ان کا دربار میں جانا موقوف ہو گیا تھا۔ مگر انھیں پنشن برابر پہونچتی رہی۔ (ملاحظہ فرمائیے حیات دبیر از افضل حسین صاحب ثابت)

صفحہ ۵۵ پر ڈاکٹر صاحب سودا کے متعلق لکھتے ہیں کہ اُن کی نثر کی مشہور کتاب "کہانی ٹھیٹھ ہندی میں" ہے جس میں ایک بھی عربی یا فارسی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا، مگر خود ہی صفحہ ۹۳ پر انشا کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس نے نثر نہیں لکھی، صرف دریائے لطافت میں اُن کے اُردو خطوط اور مقالات کے نمونے ملتے ہیں۔" حالانکہ انشا کی مشہور کتاب "داستان رانی کیتکی" ہے جو "کہانی ٹھیٹھ ہندی میں" کے نام سے مشہور ہے۔

پنڈت دیا شنکر کول نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ میر حسن کی کتاب "سحر البیان"

سے بہت مشابہ ہے۔ یہ دونوں مثنویاں ہرگز مشابہ نہیں، ان میں بہت فرق ہے، ان کا معیار جدا جدا ہے، گلزار نسیم لکھنؤ کی شاعری کی خصوصیات کی حامل ہے، یعنی اس میں لفظی رعایات، صنائع بدائع بہت زیادہ ہیں، میر حسن کی مثنوی میں ہمیں باغ، چاندنی، سراپا، شادی بیاہ کی رسوم، باجے گاجے، مناظر اور معاشرت کے متعدد پہلوؤں کا حال ملتا ہے۔ گلزار نسیم میں بیشک لفظی رعایتیں اور لطیف استعارے اور تشبیہیں اس قدر موجود ہیں کہ ان کی ایک فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ میر حسن نے اپنی کتاب میں واقعہ نگاری کی سعی کی ہے اور یہی مثنوی کا حقیقی مقصد ہے۔ میں تفصیل سے اجتناب کرتا ہوا چند اشعار گلزار نسیم اور چند سحر البیان کے پیش کرتا ہوں:-

گلزار نسیم:-

پوچھا کہ طلب، کہا قناعت	پوچھا کہ سبب، کہا کہ قسمت
میں جاکے جلی تو کچھ نہیں ہائے	ڈر ہے کہ نہ تجھ پہ آنچ آئے
مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ	کالے ناگوں سے محجب کو ڈسواؤ
کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں	آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

سحر البیان:-

سنو ایک دن کی یہ تم واردات	اُٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
سفید ایک دیکھی عمارت بلند	کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جابجا	وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھرا فلک اور سب کا ظہور	لگا شام سے صبح تک وقتِ نور
یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ	اُترا اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں	کہ دیکھوں تو یاں کوئی ہے یا نہیں
جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر	تو سب کچھ گیا اس کے جی سے اُتر
کہا جی سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو	ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ لو
یہ کہہ نیچے اُترا دبے پاؤں وہ	نظر سے بچائے ہوئے چھاؤں وہ

دبیر کے لئے ڈاکٹر بیلی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اس کے کلام کی مقدار انیس کے کلام سے نصف ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ دبیر نے انیس کی بہ نسبت بہت زیادہ لکھا۔ آگے لکھتے ہیں کہ دبیر کا کلام دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے، یہ بھی صحیح نہیں، دو جلدوں میں نہیں بلکہ بیس جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

غالب کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ اُس نے اپنا بہت سا کلام ضائع کر دیا اور سادہ طرز میں لکھا
غالب نے اپنا کلام تلف نہیں کیا۔ نسخۂ حمیدیہ شائع ہو چکا ہے جس میں غالب کا کل کلام موجود ہے۔
مومن کے لئے لکھا ہے کہ وہ اول درجے کے شعرا میں شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ درست نہیں ہے، مومن
ذوق اور غالب اول درجے کے شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں، ہاں اس میں شک نہیں کہ غالب کو ان
سب پر تفوق دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے راشد الخیری کو ڈاکٹر نذیر احمد کا لائق جانشین قرار دیا ہے، اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ
راشد الخیری کے ناولوں میں نہ تو پلاٹ سلیقے کا ہوتا ہے نہ کردار نگاری قابلیت سے کی جاتی ہے۔ راشد الخیری
کی ناولیں بہت کمزور حیثیت رکھتی ہیں، انھیں ہم اچھا ناول نویس نہیں کہہ سکتے۔

رتن ناتھ سرشار کے اسلوب کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ وہ کاملاً فطری اور غیر مصنوعی ہے
جہاں تک کہ ان کے ناولوں کے کرداروں کا تعلق ہے اُن کی زبان غیر مصنوعی اور فطری معلوم ہوتی ہے
مگر جہاں سرشار صاحب خود ناول نگاری کا حق ادا کرتے ہیں وہاں اُن کی زبان ایسی سیدھی سادی اور
غیر مصنوعی نہیں ہوتی جیسی کہ ناولوں میں ہونی چاہیئے۔ بعض جگہ وہ بہت طوالت سے کام لیتے ہیں

اکبر الہ آبادی کے لئے فرماتے ہیں کہ اُنھوں نے ریٹائر ہونے کے بعد ادبیات میں حصہ لیا۔
یہ درست نہیں، ریٹائر ہونے سے بہت قبل انھوں نے شعر و شاعری شروع کر دی تھی۔ یہ لکھنا
بھی صحیح نہیں ہے کہ موصوف نے اپنے خطوط کی تین جلدیں شائع کیں، دراصل اکبر صاحب نے
اپنے خطوط کا کوئی مجموعہ شائع نہیں کیا، بلکہ اُن کی وفات کے بعد اُن کے دوستوں نے اُن کے
خطوط کو شائع کروایا۔ بہرنوع اکبر مرحوم نثر نگار ضرور تھے، مگر نثر نگاروں کی فہرست میں اُنھیں ایک
خاص درجہ دینا درست نہیں۔

یہ اس قسم کی لغزشیں ہیں جو ایک سات سمندر پار رہنے والا محقق کرے تو زیادہ تعجب کی
بات نہیں، بہرحال ڈاکٹر بیلی صاحب کی مساعی جمیلہ مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے زبان اردو
کی تاریخ کو نہایت سائنٹفک لائن پر مرتب کیا۔ اس سے طلبا کو یقیناً فائدہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب
کی یہ تصنیف ہمارے لئے ایک شمع اور آیندہ اُردو زبان کی تاریخ لکھنے والوں کے لئے ایک
مفید اور کارآمد نمونہ ثابت ہوگی۔

کیمیاگر اور دوسرے افسانے[۱]

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔اے آکسن کے نو افسانوں کا مجموعہ ہے جو مغربی افسانوں اور مصنفین سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں خصوصاً "زندہ جاوید" نامی فسانہ پر روسی فسانہ نگار چیخوف کا رنگ پورا غالب ہے۔ ان افسانوں میں جو کیرکٹر پیش کئے گئے ہیں وہ باعتبار اصلیت و تنوع قابل قدر ہیں۔ "باغی" نامی فسانہ خاص طور پر دلچسپ ہے، زبان بہت سلیس ہے گو بامحاورہ نہیں۔

سکہ اور شرح تبادلہ

مرتبہ مولوی سید محمد احمد کاظمی بی۔ایس۔سی، ایل ایل۔بی۔ ایڈووکیٹ سہارنپور۔ ادب اردو میں علم اقتصادیات پر ابھی بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں، اور جو ہیں بھی اُن میں بیشتر علم کے موضوع سے بحث کی گئی ہے اور اقتصادی واقعات سے بہت کم واسطہ رکھا گیا ہے۔ جہاں تک شرح تبادلہ اور سکے کی تاریخ کا تعلق ہے اِس کتاب نے اس کمی کو بہ درجۂ اتم پورا کر دیا ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ہندوستان کے لئے ایک مناسب شرح تبادلہ کا مسئلہ درپیش تھا مگر عوام اس مباحثہ میں کوئی حصہ نہ لے سکے۔ اکثر لوگوں کو تو اس پر کوئی رائے قائم کرنے کا بھی حق نہیں ہے حالانکہ یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے کاروبار پر بھی اس کا اثر نمایاں ہے۔ ایسی صورت میں اس بارے میں عام ناواقفیت بہت افسوسناک ہے۔ بہرحال ہمکو کاظمی صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے جنھوں نے اس پیچیدہ مسئلہ کو ایسے سلیس پیرائے اور عام فہم زبان میں بیان کر دیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصہ میں موجودہ نظام سکہ کی ابتدائی تاریخ درج ہے اور اس کے ساتھ ہی قابل مصنف نے گذشتہ صدی کے شرح تبادلہ کی تاریخ بھی لکھدی ہے۔ کتاب کا بیشتر حصہ بیسویں صدی کے واقعات سے پُر ہے اور مناسب بھی یہی تھا کیونکہ شرح تبادلہ کا مسئلہ گذشتہ جنگ یورپ کے بعد سے بہت اہمیت پکڑ گیا ہے۔ کاظمی صاحب نے جنگ کے بعد کے واقعات پر بہت وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ اور اُس پر جو بحث و مباحثہ ہو چکا ہے وہ بھی پوری تفصیل سے دیدیا گیا ہے۔ غرض اس کتاب میں شرح تبادلہ کے موضوع پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بحث بھی ہے کہ ہندوستان کے حق میں کون سی شرح تبادلہ بہترین ہے امید ہے کہ قدر دانان اُردو اس کتاب کی قرار واقعی قدر کر کے اس سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت ایک روپیہ۔ نظامی پریس بدایوں سے طلب فرمائیں۔

---

[۱] ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

یادِ رفتگاں

خان بہادر سر محمد فخر الدین مرحوم

آپ ۱۸۶۸ء میں مقام موضع ڈمری ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد ایک عالی خاندان اور صاحب علم بزرگ تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں پاکر ۱۸۹۱ء میں پٹنہ کالج سے گریجویٹ ہوئے اور ۱۸۹۳ء میں وکالت کی ڈگری حاصل کر لی۔

اوائل عمر ہی سے آپ کو ملک و قوم کی خدمت کا شوق تھا، چنانچہ اسکول اور کالج کے مختلف شعبوں میں آپ دلچسپی لیتے رہتے تھے۔ محنت اور دیانت ہمیشہ آپ کے اصول زندگی رہے۔ اسی لئے وکالت کے پیشے میں غیر معمولی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۰ء میں آپ سرکاری وکیل مقرر ہو گئے اور ۱۹۱۹ء تک اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

وکالت کی مصروفیت کے باوجود آپ دینی اور قومی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہتے تھے۔ انجمن اسلامیہ بانکی پور کی بنیاد بہت کچھ آپ ہی کی کوشش سے قائم ہوئی تھی، عرصے تک آپ اس کے سکریٹری رہے اور اس کے لئے کافی سرمایہ بھی وصول کیا اور خود اپنی جیب سے بھی اس کی مالی امداد کی۔ جنگ بلقان میں آپ نے صوبہ بہار کی طرف سے معقول چندہ فراہم کر کے ترکوں کی مدد کی۔ پٹنہ میونسپلٹی میں عرصہ تک میونسپل کمشنر رہے اور بہت سی اصلاحات جاری کرائیں۔ بہار مسلم لیگ قریب قریب عالم نزع میں تھی کہ آپ نے اس کی عنان انتظام اپنے ہاتھ میں لیکر اس کو زندہ کیا مگر اس میں آپ کو اپنے گراں قدر اندوختہ کا ایک کثیر حصہ صرف کرنا پڑا۔

صوبہ بہار و اڑیسہ کی علحدگی سے پہلے ہی آپ بنگال کی قانونی کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے تھے۔ کونسل میں آپ کو اس وقت خاص شہرت حاصل ہوئی جب مسودۂ قانون مزارعین اڑیسہ پیش ہوا اور آپ نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اگرچہ اس وقت مسودۂ مذکور سرکاری ممبروں کی اکثریت سے پاس ہو گیا تھا

لیکن اُس وقت کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے اُسے مسترد کر دیا تھا۔ صوبہ بہار واڑیسہ کی علٰحدگی کا اعلان ہوا تو آپ نے ضلع چھوڑ کر ہائی کورٹ میں وکالت کرنا شروع کر دی، چنانچہ یہاں آپ اپنی قانونی قابلیت، ذہانت اور محنت کی بدولت سرکاری وکیل مقرر ہو گئے۔

۱۹۲۱ء میں جب بہار کونسل کے پہلے انتخابات ہوئے تو آپ بھی مغربی پٹنہ کے دیہاتی حلقہ سے ممبر منتخب ہوئے، حکومت نے آپ کو سررشتہ تعلیم اور آبکاری کی وزارت کا قلمدان پیش کیا جسے آپ نے قبول کر کے جملہ خدمات بوجہ احسن انجام دیں۔ لیکن چونکہ آپ بالطبع نہایت متقی وپرہیزگار اور مذہبی ذہنیت کے آدمی تھے اس لئے محکمہ آبکاری کا کام کرنا آپ کے ضمیر کے خلاف گذرتا تھا، چنانچہ دوسری کونسل کے موقعہ پر جب آپ دوبارہ وزیر صوبہ منتخب کئے گئے تو آپ نے اس شرط سے کام کرنا منظور کیا کہ محکمہ آبکاری آپ کے سپرد نہ کیا جائے

اس طرح جنوری ۱۹۲۱ء سے ۵ مئی ۱۹۳۲ء تک مسلسل آپ عہدۂ وزارت پر مامور رہے اور اس مدت میں تقریباً تمام محکمے مثلاً تعلیمات، رجسٹری، صنعت وحرفت، زراعت وغیرہ آپ کے چارج میں رہے، اور آپ نے اصلاحات کی خامیوں کے باوجود تمام محکموں کو کافی ترقی دی اور عوام کی خواہشات کو جہاں تک ہوسکا پورا کیا۔ چنانچہ جب گاندھی جی نے چرخہ اور کھدر کی تحریک جاری کی تو صوبہ بہار ہی کی وزارت نے اس تخئیل کو عملی جامہ پہنانے کی بلیغ کوشش کی۔ سرفخرالدین نے مختلف احکام جاری کئے اور اس کام کے لئے اسپشل افسران مقرر کر کے پرائمری اسکولوں میں چرخہ کاتنے کی تعلیم بطور مضمون جاری کردی

پٹنہ یونیورسٹی کے لئے بھی آپ نے ایک اسکیم تیار کی۔ آپ کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی کا رقبہ شہر کے مغربی جانب رہے اور جتنے کالج کھلیں وہ اسی حلقہ میں کھلیں، طلبا ایک جگہ رہیں اور پروفیسروں سے ہروقت تبادلۂ خیالات کرتے رہیں۔ یونیورسٹی ایک حد تک آزاد ہو، پروفیسر یونیورسٹی کے ماتحت رکھے جائیں۔ یونیورسٹی اور طلبا سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہیں اور اُن کی پرورش ونشوونما صاف ستھری ہوا میں ہو۔

بہار کا محکمۂ رجسٹری رشوت خواری کی وجہ سے حد درجہ بدنام تھا لیکن جب سے یہ محکمہ آپ کے ہاتھ میں آیا آپ نے انسداد رشوت خواری کی طرف سختی سے توجہ کی، چنانچہ آپ نے متعدد سب رجسٹراروں اور سیکڑوں کلرکوں کو معزول کرنا پڑا۔ اس طرح آپ کی کوشش سے بہار میں اب اس محکمے میں سب سے کم رشوت چلتی ہے۔

وزارت کے زمانہ میں سرفخرالدین کی ذات والاصفات ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں اعتماد تھا

چنانچہ ایک مرتبہ جب کونسل میں وزرائے صوبہ پر عدم اعتماد کا ریزولیوشن پیش کیا گیا تو اس کا آپ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

آپ نے مدرسۂ شمس الہدیٰ کو مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے مانند بنانے کی کوشش کی، اور تعلیم السنہ کی طرف اس قدر متوجہ ہوئے کہ آپ نے مدرسۂ مذکور کو علم الالسنہ کا مرکز بنا کے چھوڑا۔

سر فخرالدین مرحوم خود تو کانگریسی نہ تھے مگر کانگریسیوں کے جذبات کا بہت احترام کرتے تھے۔ سیاسی حیثیت سے آپ اعتدال پسند تھے، آپ کا خیال تھا کہ آئینی طریقہ پر جدوجہد کرکے حکومت سے حقوق حاصل کئے جائیں۔ سائمن کمیشن کے سامنے آپ نے جو یادداشت پیش کی تھی وہ کانگریسی مطالبات سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ زراعتی کانفرنس میں بھی آپ کی تقریر سُنکر تمام وزرا ششدر رہ گئے تھے۔ آئندہ دستور اساسی کے سلسلہ میں جتنی رپورٹیں حکومت بہار کی طرف سے پارلیمنٹ کو بھیجی گئیں اُن میں مرحوم نے اپنے خیالات کو واضح کرکے عوام کے اختیارات حاصل کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ صوبوں میں ایوان ثانی کے قیام کے آپ سخت مخالف تھے۔ بیماری کے دنوں میں بھی آپ نے وھائٹ پیپر سننے کے بعد یہی کہا کہ "موجودہ صورت میں اس قسم کا دستور ناممکن العمل ہے"

غرض ہر حیثیت سے سر فخرالدین مرحوم ایک فرشتہ خصلت بزرگ تھے، آپ کا حسن اخلاق اور ضبط و تحمل مشہور تھا، اور اسی میں آپ کی ہر دلعزیزی کا راز پنہاں تھا، آپ کے در سے کوئی شخص مایوس نہ جاتا تھا۔ سائل کا کام ہو یا نہ ہو لیکن وہ ہمیشہ خوش واپس جاتا تھا، آپ کا دولت خانہ ہر وقت خاص و عام کے لئے کھلا رہتا تھا۔

عرصہ سے آپ کو ذیابطیس کی شکایت تھی، اس پر بھی آپ کی محنت و جانفشانی کا یہ عالم تھا کہ گھنٹوں مسلیں پڑھ پڑھکر نوٹ کیا کرتے تھے۔ بارہ سال کی مسلسل اور زبردست مصروفیت اور جانفشانی نے آپ کی علالت کو بڑھا دیا، چنانچہ نومبر ۱۹۳۲ء میں آپ کی صحت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور جنوری ۱۹۳۳ء میں آپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ وزارت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں لیکن حکومت کے اصرار پر ضروری مسلوں پر نوٹ لکھتے گئے بالآخر ۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء کو جب ضعف و نقاہت حد درجہ بڑھ گئی تو آپ نے اپنا استعفا داخل کر دیا۔

خان بہادری کا خطاب آپ کو اسی وقت حاصل ہو گیا تھا جب آپ ڈسٹرکٹ بار میں سرکاری وکیل کی حیثیت سے کام کرتے تھے، نائٹ کا معزز خطاب ۱۹۲۴ء میں عطا کیا گیا تھا۔

مرحوم کا آخری پبلک کام یہ تھا کہ جب ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے وزیر اعظم کی خدمت میں اسیران سیاسی

کی آزادی کے لئے تار ارسال کیا تو اس پر آپ کے بھی دستخط تھے۔

آپ علم اور اہل علم کے بڑے قدردان تھے اور ہر ممکن طریقہ سے ان کی خدمت کرنے کی کوشش کرتے تھے، اُردو کے مشہور شاعر و ادیب علامہ شاد عظیم آبادی مرحوم کی بعض بہترین کتابیں سر موصوف ہی کی کوششوں سے چھپکر پبلک کے سامنے آئیں اور شاد مرحوم کی متعدد غیر مطبوعہ تصانیف بھی آپ کے پاس امانتاً رکھی ہوئی تھیں۔ غرض آپ ہندوستان کی پرانی تہذیب وشائستگی کا مکمل نمونہ تھے افسوس ۱۹۔ جون ۱۹۳۳ء کو ہمیشہ کے لئے ملک کو داغ مفارقت دے گئے۔ آپ نے تین لڑکے اور دو لڑکیاں یادگار چھوڑی ہیں جن کے ساتھ ہمیں دلی ہمدردی ہے۔

پنڈت کیلاش پرشاد کچلو مرحوم

افسوس صد افسوس کہ یکم جولائی کو صوبۂ متحدہ کی انڈین ایجوکیشنل سروس کے معزز و مشہور رکن پنڈت کیلاش پرشاد کچلو بحالت غریب الوطنی ملک جرمنی کے مقام باد نوہیم میں انتقال فرما گئے۔ آپ اپریل گذشتہ میں خون کے دباؤ کا علاج کرانے جرمنی گئے تھے کس کو خبر تھی کہ وہیں کی خاک دامنگیر ہو جائیگی اور آپ اپنے وطن کو واپس نہ آسکیں گے۔

مرحوم سر رشتۂ تعلیم صوبجات متحدہ کے ایک نامور افسر تھے، آپ کی زندگی اس بات کی مثال ہے کہ کس طرح ایک انسان اپنی محنت و دیانت کے ذریعہ ادنیٰ سے اعلیٰ عہدہ تک پہونچ سکتا ہے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کچھ عرصہ تک لیگل ریممبرینسر صوبۂ متحدہ کے دفتر میں ایک معمولی عہدہ پر کام کرتے رہے، بعدازاں آپ بحیثیت ہیڈ اسسٹنٹ ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم کے دفتر میں داخل ہوئے اور اسی عہدہ سے آپ ٹریننگ کالج الہ آباد میں فن درس و تدریس حاصل کرنے کے لئے بھیجے گئے ٹریننگ کالج کے امتحانات پاس کرنے کے بعد آپ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے، بعد چندے آپ اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقہ الہ آباد مقرر کئے گئے، یہاں آپ نے اس قدر محنت و جانفشانی سے کام کیا کہ کچھ دنوں بعد آپ کو مدارس حلقہ گورکھپور کی انسپکٹری پر ترقی دی گئی اور یہیں سے آپ پھر بحیثیت انسپکٹر مدارس الہ آباد سرکل واپس ہوئے۔ اس کے بعد چند سال تک آپ امتحانات سر رشتہ تعلیم کے رجسٹرار رہے اور اس حیثیت میں آپ نے اڈیشنل اسسٹنٹ ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم کی خدمات بھی انجام دیں۔ آپ سر رشتہ مذکور کے تقرر اور فنانس کے شعبوں کے انچارج بھی تھے۔ اس کے بعد آپ ورنیکلر ایجوکیشن

کے چیف انسپکٹر مقرر ہوئے، کچھ دن کے بعد اس عہدہ کا نام ڈپٹی ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم رکھا گیا۔

۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۵ء میں جب مسٹر میکنزی ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم رخصت پر تشریف لے گئے تو تقریباً پانچ ماہ تک آپ نے بحیثیت ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کام کیا۔

اس کے بعد چند ماہ کی رخصت کے بعد آپ آگرہ یونیورسٹی کے اسپشل افسر مقرر کر دیے گئے چنانچہ آپ نے جدید یونیورسٹی کے لئے تمام قواعد و ضوابط وضع کر کے یونیورسٹی کے افسران کے دفتر کی بنیاد ڈالی اور مختلف عہدوں پر لائق اشخاص کا تقرر کر کے جدید یونیورسٹی کے قیام کے متعلق تمام ابتدائی مراحل طے کئے۔ نومبر ۱۹۲۹ء میں آپ سرکاری ملازمت سے پنشن یاب ہو گئے۔

صوبجات متحدہ میں بحیثیت ایک ماہر تعلیمات کے مرحوم کو اس قدر شہرت حاصل تھی کہ آپ کے نام سے بچہ بچہ واقف تھا۔ صوبہ کے باہر بھی آپ کی خدمات جلیلہ قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ چنانچہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے سے قبل ہی دربار جے پور نے آپ کی خدمات طلب کر لیں اور آپ ریاست مذکور میں ۱۹۲۹ء لغایت ۳۲ء تین سال تک چیف اسپشل ایجوکیشن افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور جب راجپوتانہ سنٹرل انڈیا اور گوالیار کے لئے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کا بورڈ قائم ہوا تو آپ ہی چیرمین بنائے گئے

اب قویٰ کے انحطاط اور خرابیٔ صحت کے باعث آپ کسی قدر پریشان رہنے لگے۔ چنانچہ اسی بنا پر جب دربار جے پور کی طرف سے تجدید ملازمت پر زور دیا گیا تو آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ ۱۹۳۲ء کے موسم گرما میں آپ الہ آباد واپس آ گئے اور مختصر قیام کے بعد بغرض تبدیلیٔ آب و ہوا بنگلور تشریف لے گئے جہاں سے بہت کچھ صحتیاب ہو کر نومبر ۳۲ء میں واپس آئے، لیکن شروع ۱۹۳۳ء میں خرابیٔ صحت کے علامات پھر نمودار ہوئے اور اس مرتبہ آپ نے جرمنی جا کر علاج کرانے کا ارادہ کر لیا۔ اور ۴۔ اپریل ۳۳ء کو آپ الہ آباد سے جرمنی کو روانہ ہو گئے، مگر کسی کو کیا معلوم تھا کہ وہاں سے واپس آنا نصیب نہ ہوگا۔

ایک مشہور ماہر تعلیمات ہونے کے علاوہ آپ بہت فیاض طبع بھی واقع ہوئے تھے چنانچہ آگرہ یونیورسٹی کو آپ نے دس ہزار روپیہ عمارت کی تعمیر کیلئے دیا ہے اور صوبہ میں تعلیم نسواں کی ترقی کی خاطر آٹھ ہزار روپے دیئے اس کے علاوہ آپ نے تھیاسوفیکل نسواں کالج بنارس کو بھی گرانقدر عطیہ دیا۔

آپکے پھول ۱۴۔ اگست ۳۳ء کو آپکی دوسری صاحبزادی مسز ایس۔ ایس نہرو جرمنی سے الہ آباد لائیں جنہیں ۱۵ اگست کی صبح کو گنگاجی کے آغوش مقدس میں بمقام سنگم دیدیا گیا۔ آپ نے دو صاحبزادیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں

عالم نسواں

۶- اگست ۳۳ء کو آنریبل مسٹر جے ۔پی ۔سریواستو وزیر تعلیم صوبہ متحدہ نے آریا مہیلا مہاودیالیہ بنارس کا نہایت تزک و احتشام سے افتتاح فرمایا۔ آپ نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ واقعی جب تک ہماری عورتیں جاہل اور ناخواندہ ہیں اُس وقت تک ہم زندگی کی دوڑ میں دنیا کی دیگر قوموں کا مقابلہ نہیں کرسکتے آپ نے عورتوں خصوصاً بیواؤں کی امداد کی طرف اہل ملک کو توجہ دلائی، اور کہا کہ لوگ فقیروں کو خیرات دینا اچھا سمجھتے ہیں لیکن گداگروں سے بھی کہیں زیادہ مستحق شریف خاندانوں کی عورتیں ہیں جن کی مدد کرنے والا خدا کے سوائے اور کوئی نہیں ،جو نہ کسی سے قرض لے سکتی ہیں اور نہ بھیک ہی مانگ سکتی ہیں بلکہ خاموشی کے ساتھ گھر میں تکلیفیں برداشت کرلیتی ہیں۔ آپ نے کہا کہ تعلیم نسواں کے ذریعہ بیواؤں اور بیکس عورتوں کی مدد نہایت آسانی سے ہوسکتی ہے کیونکہ تعلیم کی بدولت جو روحانی قوت پیدا ہوجاتی ہے اس سے غریبی اور مصیبتوں کا مقابلہ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مہیلا ودیالیہ انٹرمیڈیٹ کالج لکھنؤ باوجود مالی مشکلات کے مستقل طور پر ترقی کررہا ہے ۳۱- مارچ ۳۳ء کو اس میں پانچسو طالبات زیر تعلیم تھیں ۔اس کالج سے جو لڑکیاں مختلف امتحانات میں شریک ہوئیں ان کے نتائج بھی خاطرخواہ اچھے رہے۔ آجکل کالج مذکور کی عمارت کی توسیع کا مسئلہ درپیش ہے امید ہے کہ عنقریب یہ مسئلہ بھی قابل اطمینان طریقے سے حل ہوجائیگا اس وقت اس کے اسٹاف میں ستّرہ اُستانیاں، تین مدرس، تین آنریری لکچرار ہیں۔

۱۴- جولائی کو ہز اکسلنسی کپتان نواب سر محمد احمد سعید خاں گورنر صوبجات متحدہ نے اٹاوہ کے لیڈیز کلب کا سنگ بنیاد رکھا۔ مسز رادھا پیاری ماتھر آنریری مجسٹریٹ اور سکریٹری کلب مذکور نے

ہز اکسلنسی کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور کلب کی دیگر ممبر خواتین سے تعارف کرایا۔ مسٹر ماتھر نے خیر مقدمی ایڈریس پڑھا اور ایک نقرئی صندوقچہ میں رکھکر پیش کیا۔ ہز اکسلنسی نے اپنی جوابی تقریر میں شریمتی مہارانی کلاوتی کنوز آف آوا گڑھ پریسیڈنٹ کلب کی تعریف فرمائی جو ہمیشہ بنی نوع انسان کی خدمت میں مصروف رہتی ہیں۔

۷۔اگست ۳۳ء کو انجمن خواتین لکھنؤ کے اہتمام سے فن داستان گوئی کا ایک نہایت دلچسپ مقابلہ مسز طامس صاحبہ کی زیر صدارت ہوا جس میں تقریباً ڈیڑھ سو خواتین شریک ہوئیں داستانوں کا موضوع "منہیات و مسکرات کے مضر اثرات" تھا، جس پر مزاح و متانت دونوں طرح سے بحث کی جاسکتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خود لیڈی وزیر حسن صاحبہ پریسیڈنٹ انجمن نے بھی مقابلہ میں حصہ لیا۔ اِس مقابلے میں حسب ذیل خواتین کو انعامات ملے:۔

(۱) مس ممتاز مسلم گرلس اسکول، (۲) مسز پی بخشی، (۳) بیگم احمد حسین، (۴) مس سلیمہ سلطان مسلم گرلس اسکول۔

اِس جلسے میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے موسیقی سے بھی حاضرین کی ضیافت طبع کا اہتمام تھا۔ چنانچہ مس داس صاحبہ نے ستار نوازی میں جو کمال دکھایا، اسکی عام طور پر بڑی قدر کی گئی۔

مچیگان یونیورسٹی ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے ہر سال خواتین امیدواروں کو "باربور صاحب کے وظائف" دیے جاتے ہیں۔ ہر وظیفہ کی مقدار بارہ سو ڈالر اور یونیورسٹی کی فیس ہے۔ وظائف دینے والی کمیٹی امیدوار کی جن باتوں کا خیال کرتی ہے وہ یہ ہیں:۔

چال چلن۔ جسمانی صحت۔ تعلیمی خصوصیات۔ یونیورسٹی کی تعلیم سے مناسبت۔ انگریزی دانی۔ کسی خاص مضمون یا شعبہ میں امتیازی خصوصیت۔ ہر وظیفہ خوار سے توقع کی جاتی ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ اپنے وطن کی خدمت انجام دے گی۔ یہ وظائف ہر سال مارچ کے مہینہ میں منظور کئے جاتے ہیں اور ستمبر سے ملنے لگتے ہیں۔ وظیفے کسی خاص مضمون کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ امیدوار کو آزادی ہے کہ وہ یونیورسٹی کے جس شعبہ کو چاہے اسمیں داخل ہوجائے وظائف کسی خاص ملک کے امیدواروں کے لئے مخصوص نہیں ہیں اور نہ اس کے لئے نسل و مذہب کی کوئی قید ہے لیکن عموماً صرف غیر شادی شدہ عورتیں ان کی مستحق سمجھی جاتی ہیں۔ ہندوستان کی

خواتین بھی انھیں حاصل کر سکتی ہیں چنانچہ جو لیڈیاں انھیں حاصل کرنا چاہیں، وہ مسٹر وی. ایم.
آلہی بخش وائی-ایم-سی-اے نینی تال سے خط و کتابت کریں۔

ریاست کشمیر میں بیواؤں کی تعداد ایک لاکھ تراسی ہزار تین سو چھ تک پہونچ چکی ہے۔
عمر کے لحاظ سے ان بیواؤں کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۴ سال سے ۵ سال عمر تک　۱۰
۵ 〃 〃 ۱۰ 〃 〃　۲۸۶۰
۱۰ 〃 〃 ۱۵ 〃 〃　۱۰۲۲
۱۵ 〃 〃 ۲۰ 〃 〃　۲۳۶۳۵
۲۰ 〃 〃 ۲۵ 〃 〃　۵۵۷۱
۲۵ 〃 〃 ۳۰ 〃 〃　۸۷۶۹
۳۰ 〃 〃 ۳۵ 〃 〃　۱۱۱۹۱

ان کے علاوہ جو بیوائیں ہیں اُن کی عمر ۳۵ سال سے متجاوز ہے۔ کشمیر جیسی کوہستانی ریاست
میں بیواؤں کی اس قدر تعداد بہت کچھ افسوسناک ہے۔

نواب صاحب جاورہ نے اپنی ریاست میں مسلم خواتین کے حقوق کی حفاظت کے لئے
ایک جدید قانون نافذ کیا ہے، جس میں عورتوں کے معاشرتی معیار کو مردوں کے مساوی کرنے
کی کوشش کی گئی ہے۔ اس قانون کا منشا یہ ہے کہ اگر کوئی شوہر گذارہ کا معقول انتظام کئے
بغیر لاپتہ ہو جائے، یا گذارہ دینے کے قابل نہ ہو یا اس کے لئے رضامند نہ ہو، یا بعض مخصوص
امراض میں مبتلا ہو، یا بیوی کی طرف سے مسلسل بے پروائی برت چکا ہو یا کسی طویل مدت
کے لئے جیل میں چلا گیا ہو، یا بیوی کے ساتھ بُرا سلوک کرتا ہو، یا اُسے بھیک مانگنے پر مجبور
کرتا ہو، یا کسی نازیبا ملازمت کرنے پر مجبور کرتا ہو یا متعدد بیویاں رکھتا ہو اور ان کے ساتھ
یکساں سلوک نہ کرتا ہو تو اس کی بیوی ریاست کی عدالت میں دعویٰ دائر کرکے خلع حاصل
کرنے کا حق ہوگا۔

کلکتہ کے کالجوں میں ہر سال ایک ہزار لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ ان کی نگرانی کے متعلق مسنر پی کے۔ رائے کی تحریک پر کلکتہ یونیورسٹی میں چند خاص آئین و قواعد مرتب کرنے پر غور ہو رہا ہے۔ منجملہ دیگر تجاویز کے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ ہر کالج جس میں لڑکیاں پڑھتی ہوں یونیورسٹی کی اجازت سے زنانہ بورڈنگ بنائے، جس کی نگرانی یونیورسٹی کے پراکٹر یا ایڈوائزر کے ذمہ رکھی جائے اور کلکتہ سے باہر رہنے والی لڑکیوں کے لئے بورڈنگ میں رہنا لازمی قرار دیا جائے۔ یونیورسٹی پراکٹر یا ایڈوائزر ایک تجربہ کار اور سن رسیدہ لیڈی ہوگی۔

کلکتہ یونیورسٹی کے پچھلے امتحان بی۔ اے (آنرز) میں مس قمر سلطان موئیدزادہ اول درجے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ آپ آقا موئدالاسلام مرحوم اڈیٹر "حبل المتین" کی چوتھی صاحبزادی ہیں۔ یہ خاندان بنگال کے مسلمانوں میں تعلیمی لحاظ سے بہت ممتاز ہے کیونکہ اس کی چار بیٹیوں نے بی۔ اے آنرز کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔

ٹھاکر لال رام پرتاپ سنگھ صاحب تعلقہ دار آنریری مجسٹریٹ و ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ کی صاحبزادی مس ودیا کنور نے جن کی عمر صرف نُو سال کی ہے امسال مڈل کا امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

کماری پدماوتی کورگ نواسی نے کنیا گورو کل دہرہ دون میں پانچ سال تعلیم حاصل کر کے امسال پنجاب یونیورسٹی سے پربھاکر کا امتحان پاس کیا جو ہندوستان میں ہندی کی سب سے اعلیٰ ڈگری ہے۔ آپ یونیورسٹی میں تیسرے نمبر پر رہیں۔ کانپور کے نامور رئیس و تعلقہ دار بابو شیام لال صاحب ایم۔ اے، ایل ایل بی ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کی بڑی صاحبزادی صاحبہ نے بھی امسال پراَدِق امتحان کو نمایاں کامیابی سے پاس کیا ہے۔

بہارِ صبح

(از جناب جگیشور ناتھ وہاب بتاب دہلوی)

پھر ظلمتوں سے رات کی جاگا نصیبِ صبح
نورِ شعاع مہر بنا خود نقیبِ صبح

پھر عرش پر دماغ ہے موجِ نسیم کا
دریا بہا دیا ہے سراسر شمیم کا

ضو باریوں میں صرف ہی رنگِ بہارِ حسن
پھولا ہوا ہے عرش پہ اک لالہ زارِ حسن

ساغر بکف ہے نور کے تڑکے نگارِ صبح
کتنا سرور خیز ہے رنگِ بہارِ صبح

رقصاں ہیں نوکِ خار پہ ساغر شراب کے
شبنم نے بھر دیے ہیں کٹورے گلاب کے

سکہ چلا جو مہر کا نقشہ بدل گیا
عالم تمام نور کے سانچے میں ڈھل گیا

نکلی نسیم جیبِ گل تر ٹٹول کر
عنبر لٹاتی پھول سے کانٹوں میں تولکر

پورا سنگار کر دیا سبزہ کا اوس نے
منہ موتیوں سے بھر دیا سبزہ کا اوس نے

کانٹے ملے چمن کے پھولوں سے تل مل کے رہ گئے
دل میں چبھے جو خار وہ بلبل کے رہ گئے

قمری نے سرو سے جو کہیں حق کی دی صدا
بوٹوں نے سنتے سنتے ہی لبیک کہدیا

سجدہ میں آنکھ مارتے اہلِ چمن جھکے
نرگس روش پہ خم ہوئی سرو و سمن جھکے

موجِ نسیمِ صبح کی ایسی ہوا بندھی
کلیاں چٹک کے رہ گئیں جو تھیں بندھی بندھی

تیزی بڑھی ہوا کی تو سورج سے ٹھن گئی
بیٹھے بٹھائے جان پہ پھولوں کی بن گئی

حدت سے آفتاب کی رخ زرد ہو گیا
رنگِ شگفتگی نہ جما سرد ہو گیا

اُلجھا ہوا گلوں سے کہیں دست خار ہے
کافور تازگی ہے خزاں پر بہار ہے

سبزہ نے سر ہزار دھنا کچھ نہ بن پڑی
سچ بات ہے نہ آئے کسی کی بری گھڑی

جھنڈا اگڑا جو مہر کی زریں سپاہ کا
اک دم زدن میں باغ کا تختہ تباہ تھا

(از جناب فطرت واسطی)

ایک جوگن پیکرِ حسن و ادا جادو نظر — منظرِ جذب و کشش کیف آفریں، صہبا اثر
نازشِ حسنِ بنارس، تابشِ نجمِ سحر — وہ اُتر کر آ رہی تھی سیڑھیوں سے گھاٹ پر
اُف نظر افروز جلوہ اس سراپا ناز کا
داستانِ آرزوئے دل کا واحد راز تھا

بھول سکتا ہے کہیں وہ منظرِ شعلہ اثر — کیا مقابل ہو سکیں اسکے بھلا برق و شرر
حسن آگیں تھی فضا، بیتاب تھی موجِ نظر — اس پہ عالم کی نگاہیں، وہ جہاں سے بیخبر
حُسن کی دیوی قرینِ آبِ دریا آگئی
دیکھنے والوں پہ ہنسکر بجلیاں برسا گئی

پہلے عظمت اور ادب سے اُس نے پانی کو چھوا — ہاتھ جوڑے، ڈنڈوت کی، اور بوسہ بھی دیا
پھر قدمبوسی کو اُس کی آپ ہی دریا بڑھا — غوطہ کھا کر غرق گویا سارے عالم کو کیا
رُک گیا پانی نظر ایسی روانی میں لگی
شعلہ جب پانی میں اُترا آگ پانی میں لگی

صاف پانی میں نہا کر جب بتِ کافر چلی — ہو کے بیتاب اور مضطر موج دریا سے اُٹھی
سادگی میں اُس کی مضمر تھا جہانِ دلکشی — اُس کے جلووں سے عیاں تھی حُسن کی پاکیزگی

ہاتھ میں گنگا جلی سر پر عقیدت کا دیا
آب دریا میں چراغِ معرفت روشن کیا

گھاٹ ہی کے متصل اک خانۂ خس پوش تھا ایک سادھو جس کے اک گوشہ میں تھا بیٹھا ہوا
جل رہی تھی آگ تھے کچھ اور بھی مردِ خدا اک طرف صد ناز سے وہ بھی ہوئی جلوہ نما

سنیاسی کی رضا سے وہ بھجن گانے لگی
ذرّے ذرّے سے ترنّم کی صدا آنے لگی

حور وش تھی گھاٹ پر کچھ اس طرح نغمہ سرا موجِ دریا وجد میں تھی، رقص میں موجِ صبا
جوششِ موسیقیت میں تھا عجب عالم مرا گریۂ پیہم فقط اک ترجمانِ کیف تھا

کیا کہوں گریہ مرا یہ سوز تھا یا ساز تھا
جانتا اتنا ہوں فطرت درد کی آواز تھا

رباعیات فرحت

(از جی۔ این۔ فرحت کانپوری۔ بی۔ اے)

کیا چیز ہے یاس، کامرانی کیا ہے؟ جب موت نہ ہو تو زندگانی کیا ہے؟
تصویر کے دو رخ ہیں حیات اور ممات اول ہی نہ ہو تو نقشِ ثانی کیا ہے؟

رنگ نیرنگیٔ زمانہ دیکھا حالِ بیگانہ و یگانہ دیکھا
بدمستِ خیال ہر بشر ہے یعنی دنیا بھر کو شراب خانہ دیکھا

سین گپتا مرحوم

(از حضرت اقبال ورما سحر ہتگامی)

کیا نہ بدلے گا کبھی رخ آسماں کی چال کا — کیا نہ اب چمکے گا سورج قوم کے اقبال کا
کم نہ تھا اپنے لئے غم داس و موتی لال کا — اب غم افزا اور بھی یہ واقعہ ہے حال کا

سین گپتا بھی ہمارے درمیاں سے اُٹھ گیا
مونسِ ہندوستاں، ہندوستاں سے اُٹھ گیا

مرنیوالے! تو ہمارے دکھ میں شامل بھی نہیں — پھر بھی اب کیا کچھ ترے مرنے کا حاصل بھی نہیں؟
جو یہ سمجھے، سینہ میں اپنے تو وہ دل بھی نہیں — فی الحقیقت ہم ترے ماتم کے قابل بھی نہیں

سچ ہے یہ، اور اسپہ بجیدہ غم تری دوری کا ہے
یعنی کچھ رونا ترا، کچھ اپنی مجبوری کا ہے

موت کو ترجیح ہو جس پر ترا ماتم ہے وہ — جان کو جو خشک کردے گریۂ پیہم ہے وہ
آج جو کل ہند پر طاری ہے تیرا غم ہے وہ — پھر ترے بنگال کو جتنا بھی غم ہو کم ہے وہ

اب نہیں کوئی بھی بس کی بات بے بس کے لئے
کون اب باقی ہے اُسکے دل کی ڈھارس کے لئے

اُسکے آڑے وقت میں آئندہ کام آئیگا کون؟ — اپنی ہمدردی کے آنسو اُسپہ برسائیگا کون؟
قوم پر خود مٹکے اُسپہ فتح اب پائیگا کون؟ — یوں جہاں کو قوتِ ایثار دکھلائیگا کون؟

دل کو کرلے گا زباں سے اپنی اب تسخیر کون؟
کھینچدیگا خوشنما الفاظ میں تصویر کون؟

گرچہ تو پیدا ہوا تھا جاہ و ثروت کے لئے ۔۔۔ لی مگر تو نے فقیری اپنی عظمت کے لئے
تو نہ دولت کے لئے جیا اور نہ راحت کے لئے ۔۔۔ تھا فقط تو قوم کی بے لوث خدمت کے لئے

آج اُس خدمت کا پورا حق ادا ہو کر رہا
تو بالآخر ہاتھ اپنی جان سے دھو کر رہا

قید سے ہستی کے اب تو سر بسر آزاد ہے ۔۔۔ کیا خبر تجھکو کہ کوئی شاد یا ناشاد ہے
واقعی اب امن کی دنیا میں تو آباد ہے ۔۔۔ اور یہاں اب بھی وہی حسرت بھری رُوداد ہے!

ہم کو کیا اُمید تھی ہونے کی اور کیا ہو گیا
سنتے سنتے اپنے غم کی داستاں تو سو گیا

سونیوالے! گو ابھی موقع نہ تھا آرام کا ۔۔۔ کوئی اندازہ بھی تو ہوتا ہے لیکن کام کا
خاتمہ ہے اب محن کے ساتھ ہی آلام کا ۔۔۔ پر نہ دل سے مِٹ سکیگا نقش تیرے نام کا

تو فنا ہو کر فنا ہو ایسی کب اُمید ہے
زندگی میں قوم کی تو زندۂ جاوید ہے

شکوۂ تغافل

(از جناب قاضی محمد مرید صاحب صابر وزیر آباد)

بھولنے والا مرا ہر وقت مجھکو یاد ہے ۔۔۔ میں تو ہوں ناشاد لیکن بھولکر وہ شاد ہے
سنگدل کہتے بھی ڈرتا ہوں اسے منہ پہ نہ ہو ۔۔۔ مجھ سے ہو سکتی نہیں فریاد بھی فریاد ہے

پارہائے جگر

(از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔ اے)

(۱)

دل سے طاعت تری نہیں ہوتی — ہم سے اب بندگی نہیں ہوتی
ایسی کچھ بیدلی سی غالب ہے — کہ تری یاد بھی نہیں ہوتی
دل نہ جب تک ہوا یک شعلۂ عشق — زندگی زندگی نہیں ہوتی
حیف وہ جس سے شدت غم میں — خواہش مرگ بھی نہیں ہوتی
راس آتی نہیں کوئی تدبیر — یاس جاوید بھی نہیں ہوتی
ضبطِ غم بھی محال ہے ہم سے — اور فریاد بھی نہیں ہوتی
دل پرستی خدا پرستی ہے — خود پرستی خودی نہیں ہوتی
الحذر تشنگیِ عشقِ جگر — ہائے تسکین ہی نہیں ہوتی

(۲)

نہ وہ ہم سے نہ ہم اب اُن سے بولیں — یہی بس دل میں ہے جی بھر کے رولیں
یہ کون اُن نیمخواب آنکھوں سے پوچھے — اجازت ہے کہ دم بھر ہم بھی سولیں
کسی کو دیکھ لیتے ہیں جو روتے — یہی دل چاہتا ہے ہم بھی رولیں
جو مشتاق بہارِ زندگی ہیں — وہ اپنے خون میں دل کو ڈبولیں
جو ہوں آمادۂ سعیِ رہائی — وہ پہلے زندگی سے ہاتھ دھولیں
یہ ساری آفتیں ڈھائی ہیں دل نے — جگر ہم کیا لب فریاد کھولیں

علمی خبریں اور نوٹ

جدید روس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ عوام میں اخبار بینی کی عادت بہت بڑھ گئی ہے جنگ عظیم سے پیشتر روس میں صرف آٹھ سو اُنسٹھ اخبارات تھے اور اُن کی مجموعی اشاعت ۲۷ لاکھ تھی، مگر اس وقت روس میں پانچہزار چار سو اخبارات شائع ہوتے ہیں جن کی مجموعی اشاعت تین کروڑ اسّی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اگر روس میں کاغذ کی قلت نہ ہوتی تو ان اخباروں کا سائز اور اشاعت اور بھی زیادہ ہو جاتی چنانچہ آجکل روس کے ممتاز ترین روزنامہ اخبارات کاغذ کی قلت کے باعث صرف چار صفحوں پر چھپتے ہیں۔ ان اخبارات کی اشاعت سولہ لاکھ سے بیس لاکھ فی اخبار ہے۔ اخبارات کی کثیر تعداد اشاعت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس وقت روس کی بچانوے فیصدی آبادی خواندہ ہے۔ روسی اخبارات سرمایہ داری کی خبروں سے معرّا ہوتے ہیں، چنانچہ ان میں تبادلہ صرافہ اور اسٹاک مارکیٹ وغیرہ کی خبریں درج نہیں ہوتی ہیں، نہ ان میں خانہ داری، فیشن، سوسائٹی کے نوٹ یا "کراس ورڈ" معمّے ہوتے ہیں، جرائم، طلاق اور خلع کی خبریں شائع کرنے کی بھی ممانعت ہے اور ان میں سنسنی خیز خبریں بھی نہیں دی جاتی ہیں۔ صنعت و حرفت کی خبروں اور مضامین کو اول درجہ دیا جاتا ہے، اس کے بعد گورنمنٹ کے احکام و فیصلہ جات اور کمیونسٹ جماعت کی خبریں درج ہوتی ہیں۔ روس میں دیگر زبانوں کے اخبارات بھی کافی تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور اُن کے ناظرین کی مجموعی تعداد ایک کرور کے قریب بتلائی جاتی ہے۔ شہنشاہی زمانے میں کوئی غیر ملکی اخبار روس میں جاری نہیں ہو سکتا تھا۔

انگریزی زبان میں توسیع و ترقی کی کس قدر صلاحیت ہے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ جہاں سولھویں صدی میں شیکسپیئر صرف چوبیس ہزار الفاظ سے اور ملٹن صرف تیرہ ہزار الفاظ سے واقف تھے وہاں اب اوسط درجہ کا تعلیم یافتہ انگریز یا امریکن ساٹھ ہزار سے ستّر ہزار۔

تک الفاظ جانتا ہے۔ مسٹر لائڈ جارج ایک لاکھ الفاظ جانتے اور استعمال کرسکتے ہیں، امریکہ کے پریسیڈنٹ مسٹر روزویلٹ کو سوا لاکھ الفاظ پر عبور حاصل ہے۔ الغرض انگریزی زبان روز افزوں ترقی کر رہی ہے اس کے مقابلہ میں اُردو زبان کو دیکھئے کہ وہ لوگ جو خود کو اہل زبان سمجھتے یا زباندان کہتے ہیں وہ زبان کو عربی وفارسی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبوں کے ساتھ لکھنا پڑھنا ہی صحیح سمجھتے ہیں حالانکہ یہ روش اُردو زبان کی ترقی کو محدود اور مسدود کررہی ہے۔

حضرت حفیظ جالندھری کے شاہنامۂ اسلام کی دوسری جلد بھی شایع ہوگئی ہے۔ اس جلد میں رسول اسلام کی رہنمائی میں قلیل التعداد مہاجرین اور انصار کا کثیر التعداد دشمنانِ اسلام سے معرکہ آرا ہونا اور قوتِ ایمانی سے فتحیاب ہونا بیان کیا گیا ہے۔ پہلی جلد کی طرح اس میں بھی دو ہزار سے زائد اشعار ہیں، اس کا حجم بھی جلد اول کے مشابہ یعنی ۲۸۰ صفحات ہے، قیمت تین روپیہ ہے۔ شائقین مہتمم کتب خانہ شاہنامۂ اسلام انارکلی لاہور سے طلب فرمائیں

راؤ بہادر تاراچند شاکی رام اڈوانی نے کراچی کے وکٹوریا میوزیم کو بعض نادر چیزیں عطا فرمائی ہیں جن میں دو سو سرسٹھ ۲۶۷ مصوری کے نمونے، دو سو بتیس ۲۳۲ قدیم سکے، ہاتھی دانت کی پچی کاری کے نمونے، نایاب برتن وغیرہ شامل ہیں۔

مدراس کے مسٹر یعقوب حسن نے جیل خانہ میں رہکر ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی جس کی پہلی جلد "کتاب الہدیٰ" کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ اب اعلیحضرت حضور نظام نے اس کتاب کی تکمیل کے لئے ساٹھ ہزار روپیہ کی منظوری صادر فرمائی ہے۔

اس نمبر میں کوہ ایورسٹ کے متعلق ایک مفصل مضمون ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ایورسٹ کی چڑھائی کے لئے مسٹر رٹلیج کی سرکردگی میں ایک اور مہم تیار کی جارہی ہے، جس کے انتظامات ۱۹۳۵ء تک مکمل ہوجائیں گے مسٹر رٹلیج نے شملہ میں ایک تقریر کے دوران میں بیان کیا ہے کہ کوہ ایورسٹ کا راستہ خطرناک اور مشکلات سے لبریز ہے، اور جب تک موسم موافق نہ ہو اس پر چڑھنے میں کامیابی نہیں ہوسکتی۔ وہ چوٹی تک پہونچنے کی دو مرتبہ کوشش کرچکے ہیں مگر موسم کی خرابی کے باعث چوٹی سے ایک ہزار فٹ کے فاصلہ پر پہونچکر رہ گئے۔

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور ملاحظہ فرمائیں

رامائن مسدس

(مصنفہ جناب منشی رام جی مل صاحب کپور سنبھلی)

اس رامائن کی مخصوص خوبی یہ ہے کہ قابل مصنف نے شری رامچندر جی کے چرتر کو عجیب و غریب انداز میں بیان کیا ہے مصنف کی جدت طراز ذہن رسانی نازک و نادر استعارات اس حسن و خوبی سے استعمال کی ہیں جو روحانی و وجدانی لطافت سے مملو ہیں ہر شعر لیا ہوا جادو ہے لطف محاکات بلند پروازی تخیل قابل تحسین و داد ہے اشعار میں فصاحت و بلاغت کا دریا موجیں لے رہا ہے رامائن کے اندر نو تصویریں رنگین نہایت قیمتی ہیں صفحات ۲۰۰ مجلد قیمتی
قیمت مجلد باتصویر ؎، مجلد بلا تصویر عا بلا جلد عہ

غدر کے بعد سے موجودہ زمانے تک کی شاعری کی بسیط اور مستند تاریخ

جدید اردو شاعری

تصنیف جناب عبد القادر صاحب سروری عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد دکن) قیمت مجلد تین روپیہ

پریم چند کی تازہ تصنیف

بیوہ

اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات لکھے گئے ہیں اور انکی ترغیبات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ بیواؤں کے لئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے۔

حجم ۱۵۰ صفحات قیمت ایک روپیہ عہ

ملنے کا پتہ

منیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور

واہ! دیکھئے وہ شخص کیسا تندرست اور طاقتور نظر آتا ہے

چند ہفتہ تک سناٹوجن کا استعمال کرنے سے ہی آپ کی تندرستی اور قوت میں ایسی ترقی ہوگی کہ جملہ مرد اور عورتیں آپ کو دیکھکر متعجب ہو جائینگے اور آپس میں کہنے لگیں گے کہ آپ کیسے طاقتور ہیں۔ مشہور جہاں مقوی غذا سناٹوجن کے استعمال سے ہی آپ کی تندرستی اور قوت لوٹ آئی ہے اس امر کا خیال آپکے دل میں ہونے سے کتنی فخر اور خوشی آپکو حاصل ہوگی۔

جسم میں کافی مقدار سے نئی طاقت بخشنے والے جملہ اشیا سناٹوجن میں موجود ہیں۔

ایک دفعہ سناٹوجن کا استعمال شروع کر دینے سے ہی آپ کی کمزوری جسمانی اور کمزوری قوت باہ رفع ہو جائینگے اور آپ بہ نسبت قبل زیادہ تندرست اور طاقتور ہو جائینگے۔

آج ہی ایک بوتل خرید کریں۔

ہر ایک دواخانہ
اور بازار میں ملتا ہے

SANATOGEN

زمانہ

مرتبہ دیانرائن نگم بی اے

نمبر ۵	نومبر ۱۹۳۳ء	جلد [illegible]

فہرست مضامین

تصاویر۔ ڈاکٹر اینی بیسنٹ مرحومہ۔ پنڈت مایا پرشاد دوبی

[illegible]

بجرہ فارمیسی جام نگر کاٹھیاواڑ

ہیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

ڈاکٹر اینی بیسنٹ مرحومہ

تھیاسوفیکل سوسائٹی کی مشہور ومعروف صدر ڈاکٹر بیسنٹ کے انتقال پُرملال پر آج تمام متمدن دنیا میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔ آہ! آج ہم سے وہ ہستی ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئی جس نے بنی نوع انسان کو اپنی گوناگوں اور گراں قدر خدمات سے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک مالامال کیا۔ آج ہندوستان کی آنکھیں ان کے غم میں اشکبار ہیں کیونکہ ہندوستان ہمیشہ کے لئے اس بلند ہمت اور اُولوالعزم ہستی کے نورانی اثر سے محروم ہو گیا۔ لیکن اے ہندوستان تو خوش قسمت ہے کہ اس مرحومہ نے تقریباً چالیس سال سے تجھے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کا آخری جولاں گاہ بنا رکھا تھا اور قدرت نے اُن کی ہستی میں جو گنجینہائے گرانمایہ چھپا رکھے تھے وہ سب تیرے کام آئے۔

مگر ذرا قانون قدرت پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عالمِ آب و گل کی ہر چیز فانی ہے اور سچ ہے موت نہ ہو تو زندگی کا کیا لطف۔ زندگی کی داستانِ راز کا حل موت ہی سے معلوم ہوتا ہے موت گویا کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کل ڈاکٹر بیسنٹ کے طلسم زندگی پر جو پردہ پڑا ہوا تھا وہ آج اُٹھ گیا اور ہم اُن کی ہستی کو آج زیادہ واضح اور صاف طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ کل وہ صرف زندہ تھیں، آج وہ زندۂ جاوید ہیں۔

اُن کی شہرت اور ان کے کارناموں کی مقبولیت دنیا میں اس درجہ ہے اور اُن کے کارہائے

نمایاں اس کثرت سے ہیں کہ اِن سب کی تفصیل اس چھوٹے سے مضمون میں ناممکن ہے۔ تاہم مسٹر جنراجِ داس کا یہ قول ہم نقل کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان کی زندگی کچھ اس شان سے بسر ہوئی کہ موجودہ ترقی کے بہت سے شعبے انھیں کے مرہون منت نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے بنی نوع انسان کی عموماً اور ہندوستان کی خصوصاً جو خدمات انجام دی ہیں ان کا صحیح اور منصفانہ اندازہ لگانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی تمام حقیقی، گوناگوں اور مختلف النوع مصروفیتوں کا جائزہ لیا جائے جن میں ان کی خدمات اور ایثار کی مستقل مزاجانہ زندگی کے آخری ساٹھ سال بسر ہوئے

مشرقی اور مغربی ممالک میں علم و عمل کی بعض بڑی بڑی ہستیاں زندگی کے صرف ایک یا دو شعبوں میں چمکی ہیں، انھوں نے یا تو سیاست داں کی حیثیت سے شہرت حاصل کی یا اجتماعی مصلحین کی حیثیت سے۔ یا پھر ماہر تعلیمات کی حیثیت سے مشہور ہوئیں یا مذہبی اور روحانی علم کی حیثیت سے فلسفی اور حکیم کی حیثیت سے یا ماہر صحافت اور مصنف کی حیثیت سے۔ لیکن ڈاکٹر مرحومہ کی نسبت بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے (اور اس لحاظ سے وہ بے نظیر بھی ہیں) کہ انھوں نے انسانی علم و عمل کے مندرجہ بالا تمام شعبوں میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں چھوڑے ہیں

انھوں نے انگلستان میں اجتماعی اور ملکی مصلح کی حیثیت سے خدمتِ خلق کی زندگی شروع کی اور ہندوستان میں ہندوستان کی آزادی کے لئے عظیم الشان اور گراں قدر سیاسی کارنامے چھوڑ کر رحلت فرمائی۔

خاتونِ اعظم | ڈاکٹر بیسنٹ نہایت بلند ہمت و راسخ العزم خاتون تھیں جس کام کو وہ شروع کرتی تھیں نہایت مستقل مزاجی سے اسے انجام تک پہنچاتی تھیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ نیک مزاج اور شریف النفس بھی تھیں اور دوسروں کے ساتھ ہمیشہ مہربانی سے پیش آتی تھیں، حقیقت میں وہ خاتون اعظم تھیں ان کی ہستی کئی لحاظ سے بہت بلند تھی جن لوگوں کو ان سے دوستانہ تعلقات کا شرف حاصل تھا وہ اُن کی کشادہ دلی کے قدرداں ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ کن کن باتوں میں اُن کی ہستی عام انسانوں سے بلند تر تھی

مستعدی اور ذوقِ عمل | سچ پوچھیئے تو ان کی زندگی کی زینت عمل سے تھی، وہ جس طریقے پر اپنے قلب و دماغ کو عمل کی مشعل سے منور کرنے میں کامیاب ہوئیں وہ تاریخ کا ایک زندہ کارنامہ رہیگا۔ وہ حد سے زیادہ مستعد اور سرگرم کار رہنے والی خاتون تھیں۔ ان کی تیزی طبع اور انہماک ضرب المثل

ہے۔ وہ صبح چار بجے سے رات کو دس بجے تک مسلسل کام کرتی رہتی تھیں اور ایک لمحہ بھی بیکار نہیں کھوتی تھیں۔ اُن کی مصروفیتوں میں اس قدر باقاعدگی تھی کہ جب ایک کام سے فراغت پاتی تھیں تو فوراً بغیر سستائے ہوئے دوسرا کام شروع کر دیا کرتی تھیں۔ ان کی زندگی ذوق عمل کا ایک عجیب دغریب نمونہ تھی۔ وہ ہر ایک کام کو دل لگا کر نہایت ہوشیاری سے کیا کرتی تھیں۔ ۱۹۳۱ء تک اُن کی صحت بہت اچھی رہی۔ بعد کو جب انتہائی پیرانہ سالی کی وجہ سے ضعف نے عاجز کر دیا تو وہ گوشہ نشین ہوگئیں۔ اس طویل اور پُر از واقعات زندگی میں انھوں نے نہایت محنت اور مشقت سے کام کئے جن سے بڑے بڑے عظیم الشان اور گراں قدر نتیجے برآمد ہوئے۔ گاندھی جی نے ان کی نسبت بالکل صحیح فرمایا ہے کہ وہ غیر فانی قوتِ عمل اور غیر مغلوب ہمت و استقلال کی مالک تھیں۔

چند خصوصیات | وہ مظلوموں کی حامی و مددگار تھیں، وہ متعدد تحریکوں کی محض بانی نہ تھیں بلکہ ان کی ترقی اور بہبودی میں ہمیشہ کوشاں رہتی تھیں۔ ان میں یہ حیرت انگیز قدرت تھی کہ وہ نہ صرف اپنی طلاقت لسانی بلکہ عملی مثال سے مردوں اور عورتوں کو اپنا ہم زبان اور ہم خیال بنا لیا کرتی تھیں۔ اس بات میں ان کا کوئی نظیر نہیں کہ وہ دوستوں کے ساتھ ہمدردی کرنیکے علاوہ دشمنوں پر بھی مہربان رہتی تھیں وقت کی پابندی ان کی بڑی خصوصیت تھی خواہ مدراس کے آدھی دراوید اسکول کا جلسہ ہو خواہ لندن کے کوئن ہال کی انجمن، وہ ٹھیک مقررہ وقت پر پہنچ جایا کرتی تھیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ اُن کی طلاقت بیانی اور تنظیمی قابلیت بے مثل تھی۔ انگریزی زبان کی وہ بہترین مقرر تھیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مسٹر گلیڈسٹن اور پارلیمنٹ کے دیگر مشہور و معروف مقرروں سے بھی بازی لے گئیں تھیں۔

بحیثیت مصنف | وہ نہایت سرگرم اور قابل مصنفوں میں سے تھیں۔ وہ مضامین اور کتابیں اس قدر جلد تصنیف کرتی تھیں کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ کتابیں محض تھیاسوفی ہی کے متعلق نہیں ہوتی تھیں بلکہ متفرق مضامین میں اُن کی طبیعت یکساں طور پر لڑتی تھیں۔ ان کی تیزیٔ طبع اور ذکاوتِ ذہن کسی خاص مضمون پر بند نہیں تھی۔ بلکہ علم و عمل کے ہر شعبے میں وہ مہارت تامہ رکھتی تھیں۔ لاکھوں انسان اُن کی تقریروں اور کتابوں سے مستفید ہوئے اور اُن کے مطالعہ کی برکت سے وہ شک و شبہ کی تاریکیوں سے نکلے اور اُن کی مدد سے اپنی روحانی زندگی کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا۔ سب سے پہلے اُنھوں نے مذہب اور اخلاق کی دو مبسوط کتابیں تالیف کیں اور ہندوستان اور انگلستان میں ہندو مذہب، بدھ مت، عیسائی مذہب اور اسلام پر بہت سی تقریریں کیں۔ یہ تمام تقریریں کتابوں کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں میں مذہبی اور اخلاقی مسئلوں کے صحیح طریقۂ تفہیم اور معقول ذریعۂ

توضیح سے نئی روشنی ڈالی گئی ہے۔ متعدد بیش بہا اور فاضلانہ کتابوں مثلاً اسٹڈی ان کانسینشس (مطالعۂ شعور) اینشینٹ وزڈم (عقل قدیم) اسوٹرک کرسچینٹی (باطنی عیسائی مذہب) اور تھاٹ پاور (طاقت خیال) اس کی تربیت اور ضبط۔ ان کتابوں کی مصنف کی حیثیت سے انھیں بے انتہا شہرت حاصل ہوئی۔

ابتدائی زندگی | وہ پکے مذہبی ماحول میں پیدا ہوئیں، لیکن بہت جلد ان مذہبی زنجیروں سے گھبرا کر وہ آزادی کے لئے جد و جہد کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ جس تنگ نظری اور سختی کے ساتھ عیسائی مذہب ان کے روبرو پیش کیا گیا تھا اُس سے اُکتا کر اُنھوں نے دہریت کی طرف رُخ کیا اور کئی سال تک نہایت سرگرمی اور قابلیت سے عیسائی مذہب کے عقائد اور راہ و رسم کو مہمل اور بے سود سمجھکر انھوں نے اسے ترک کر دیا اور "آزاد خیالی" اختیار کی لیکن عام "آزاد خیال" مصنفوں کی طرح اُن کی تحریروں میں ابتذال نے کبھی دخل نہیں پایا۔ ان کے ملاقاتیوں میں سے ایک نے ان کی دہریت کے متعلق اس طرح لکھا ہے کہ "اگرچہ وہ دہریہ تھیں لیکن کبھی انھوں نے یہ نہیں کہا کہ خدا نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف یہ کہا کرتی تھیں کہ خدا کی ہستی کی کوئی شہادت نہیں ہے اس لئے میں اس پر ایمان نہیں لا سکتی" اُنکی خانگی زندگی بہت ناخوشگوار تھی۔ انھوں نے ایک مرتبہ اس سے اُکتا کر زہر پی لینا چاہا۔ لیکن جونہی اُنھوں نے پیالہ لب سے لگایا اُنھیں ایک صاف غیبی آواز یہ کہتی سنائی دی کہ "اے بزدل تو شہادت کی خواہشمند تھی، مگر یہ چند روزہ تکلیف بھی تجھ سے برداشت نہ ہو سکی"۔

جنگ آزادی | شروع شروع میں وہ اپنی آزادیِ ضمیر کے لئے جنگ کرتی رہیں، اور اس کے حصول کے بعد پھر دوسروں کی جنگ آزادی میں شریک ہوئیں۔ ان کے ۱۸۹۱ء تک کے حالات اُن کی خود نوشت سوانحعمری سے معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں وہ واقعات ہیں جن سے اُن کی اس روحانی جنگ کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے، جو انھوں نے ظلمت سے نور میں اور غلامی سے آزادی میں آنے کے لئے کی، اور پھر ان سخت آلام و مصائب کا ذکر ہے جنھیں انھوں نے نہایت ثابت قدمی سے برداشت کیا اور پھر ان انعامات کا حال بھی ہے جو انھیں اس جد و جہد کے بعد ملے۔

چارلس بریڈلا سے ملاقات | مسز بیسنٹ کو سیاسی دلچسپی زیادہ تر مسٹر چارلس بریڈلا کی صحبت میں رہ کر ہوئی جو دار العوام میں نمایندگی کے لئے جد و جہد کر رہے تھے۔ انھیں کے اثر سے ان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ جب مسٹر بریڈلا نے بہ حیثیت ایک آزاد خیال شخص کے ایسے حلف اُٹھانے سے انکار کیا جس میں خدا کا نام آتا تھا کیونکہ وہ خدا کے منکر تھے، بلکہ اپنے طریقہ پر حلف لینے کا دعویٰ کیا

تو دارالعوام نے اُن کی سخت مخالفت کی اور اُنھیں قید کر دیا۔ اس پر مسز بیسنٹ کی پُر زور جدوجہد پر اس قدر شورش ہوئی کہ مسٹر بریڈلا آزاد کر دیئے گئے۔۔۔۔۔۔ اور دارالعوام نے اپنا وہ ریزولیوشن بھی واپس لے لیا جس کی رو سے مسٹر بریڈلا کو اپنے طریقے پر حلف لینے سے روکا گیا تھا۔ انھوں نے پھر اپنے طریقہ پر حلف اٹھایا اور نمائندگی حاصل کی۔ اس واقعہ کے بعد سے مسز بیسنٹ کی پبلک مصروفیتوں میں یہ دو پہلو بہت زیادہ نمایاں رہے، یعنی جبر و تشدد سے نفرت اور آئین و قانون کی پابندی۔

اجتماعی خدمات | ان کی اجتماعی مصروفیتیں ۱۸۸۸ء سے شروع ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر پچیس سال کی تھی۔ اس سال سینٹ کے حلقے کے غریب بیماروں کی خدمت میں مصروف رہیں جو میعادی بخار میں مبتلا تھے۔ مشرقی لندن کے تنگ و تاریک کوچوں میں ان کی خدمات، دیا سلائی بنانے والی لڑکیوں کے حقوق کی حفاظت اور اس میں کامیابی، اور دیگر محنت و مشقت کرنے والوں مثلاً بندرگاہوں کے مزدوروں اور قلیوں وغیرہ کی خدمات اس قدر مشہور ہیں کہ یہاں ان کی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی اجتماعی مسئلے کی بنا پر مسٹر بریڈلا سے جدا ہو کر وہ فیبین سوسائٹی میں شریک ہو گئیں اور پبلک جلوسوں اور جلسوں کے حقوق ..... اور مزدوروں کو مناسب معاوضہ دیے جانے کیلئے کام کرتی رہیں۔ اس فیبین سوسائٹی کے بعض ممبر اب بھی زندہ ہیں مثلاً جارج برنارڈ شا، لارڈ پاسفیلڈ۔ لارڈ اولیور اور مسٹر رمزے میکڈانلڈ۔ مصیبت زدہ اور مظلوموں کی اعانت میں اُن کی سرگرمی وانہماک اور صداقت کی پیروی میں ان کی بیباکانہ تقریریں یہ ایسی باتیں تھیں جنکی وجہ سے ان کے خلاف دشمنوں کی ایک خاصی تعداد پیدا ہو گئی۔

تبدیلیٔ مذہب | اس سے سب واقف ہیں کہ انھیں تھیاسوفی کی طرف کس طرح رغبت ہوئی۔ مسٹر ڈبلیو ٹی اسٹیڈ نے ان سے اپنے رسالہ کے لئے میڈم بلاوٹسکی کی "سیکرٹ ڈاکٹرن" (پوشیدہ عقائد) پر تنقید لکھنے کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے اسے پڑھکر اس کی صداقتوں سے آگاہی حاصل کی۔ اس کتاب کو پڑھتے ہی ان کے دل میں صداقت کا وہ نور چمکا جس سے اُن کی ساری زندگی منور ہو گئی۔ اس کے بعد وہ خود میڈم بلاوٹسکی سے ملیں اور اُن سے روح اور عقیدہ پر گفتگو کی اور بہت سی معلومات حاصل کیں، چنانچہ وہ بلاوٹسکی کی معتقد اور مرید ہو گئیں، اور مرتے دم تک اسی اعتقاد پر قائم رہیں۔ تھیاسوفی کے متعلق جو کچھ انھوں نے کیا اس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ وہ تھیاسوفی کی زبردست حامی اور روح رواں تھیں۔ ۱۹۰۷ء میں کرنل اولکاٹ کی وفات کے بعد وہ صدر منتخب کی گئیں اور سات سال تک صدر رہیں۔ اس کے بعد پھر تین مرتبہ ان کا انتخاب ہوا۔ ان کے عہد صدارت میں سوسائٹی کو

بڑی زبردست ترقی ہوئی یعنی جب کرنل اولکاٹ کا انتقال ہوا اُس وقت صرف گیارہ نیشنل سوسائیٹیاں تھیں لیکن اس وقت سینتیس ۳۷ سوسائیٹیاں اور شامل ہو گئی ہیں۔

ہندوستان میں آمد | اول بار وہ ۱۶۔ نومبر ۱۸۹۳ء کو ہندوستان آئیں، اُنھیں ہندوستان سے اس قدر محبت تھی کہ ایک مرتبہ جب اُن کے ایک دوست نے یہ دریافت کیا کہ "آپ وطن کب جا رہی ہیں" (یعنی انگلستان) تو اُنھوں نے جواب دیا کہ "کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ میں وطن کب واپس آ رہی ہوں، میرا وطن تو ہندوستان ہے"

ہندوستانی خدمات کے سلسلہ میں سب سے پہلے انھوں نے انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں خصوصًا جنوبی ہندوستان کے باشندوں کے دلوں سے انیسویں صدی کی خیالی بے راہ روی اور مادہ پرستی کے رجحانات کو دُور کیا۔ وہ قدیم فلسفہ کی حامی تھیں، انھوں نے اس میں اس قدر واقفیت اور علمیت کا اظہار کیا کہ تعلیم یافتہ ہندوؤں کو سخت حیرت ہوئی۔ اُن کی ہر تقریر سے یہ پتہ چلتا تھا کہ انھیں ہندوستان کی گذشتہ عظمت سے غیر معمولی محبت اور ملک کی موجودہ پستی سے بیحد نفرت ہے۔

ہندو مبلغہ کی حیثیت سے | ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۷ء تک وہ ہندو مذہب کی اشاعت و تبلیغ میں مصروف رہیں اُنھوں نے تمام ہندوستان میں ہندو مذہب کی عظمت پر جا بجا تقریریں کیں۔ اُن کی تقریروں اور اُن کے مضامین سے لوگوں کے دلوں میں قدیم مذہب اور شائستگی کی گذشتہ وقعت پھر قائم ہو گئی۔ اُنھوں نے بابو بھگوان داس اور دیگر اصحاب کی علمی مدد سے سناتن دھرم پر کتب شائع کیں جن سے ہندو مذہب کو بہت تقویت پہنچی۔ اُنھوں نے اپنی متعدد کتابوں میں اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ تمام مذاہب کی حقیقت کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور اسلئے مختلف مذاہب میں اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ خوش اعتقاد ہندوؤں نے ان کی بہت عزت اور وقعت کی اور اُن کو ہندو مذہب کا زبردست حامی سمجھا اور یہی وجہ تھی کہ ان کی کوششوں سے مذہبی سرگرمی اور احیاء کو زیادہ مدد پہنچی اُنھوں نے زیادہ تر سری کرشن جی کی تعلیمات کی جو بھگوت گیتا میں ہیں اشاعت کی۔ دورِ حاضرہ کی تاریخ میں سب سے پہلے انھوں نے مختلف مذاہب کے اصولی اتحاد پر زور دیا اور یورپ اور ہندوستان میں اپنے پیرووں کو قومی اور نسلی، جنسی اور مذہبی منافرت کو دُور کرنے کی ہدایت کی۔ اور باہمی رواداری اور بُردباری برتنے اور انسانی اتحاد کو اپنا مقصدِ زندگی بنانے پر زور دیا۔ اُن کی نسبت یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اور انگلستان کی وہ پہلی لیڈر تھیں جنھوں نے حاکم اور محکوم کے درمیان باہمی مفاہمت کا احساس پیدا کرایا، اور برطانوی مدبروں اور ہندوستانی سیاست دانوں کو مغائرت اور قومی تفاخر کے خطرات سے صاف صاف متنبہ کر کے ان میں باہم سمجھوتا کرانے کی کوشش کی۔

سنٹرل ہندو کالج کا قیام | ۱۸۹۸ء میں انھوں نے مقدس شہر کاشی میں سنٹرل ہندو کالج کی بنیاد ڈالی،
اس کالج میں انگریز اور ہندوستانی ایک ہی قسم کی خدمات کے صلہ میں یکساں تنخواہیں پاتے تھے۔
کالج میں اُن کی امداد کرنے کے لئے برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ سے تھیاسوفسٹ آئے، ان میں سے
بعض مشہور ترین اصحاب یہ تھے:۔ ڈاکٹر اے۔ رچرڈسن۔ مسٹر جی۔ ایس۔ ارنڈیل، اور مس فرانسسکا
ارنڈیل۔ ہندوستانی راجاؤں اور دیگر رؤسا نے بھی ان کی بہت امداد کی۔ اس کالج کی ترقی اور کامیابی
کا ایک راز یہ بھی تھا کہ مسز بیسنٹ کا جوش عمل دیکھکر شریف اور اولوالعزم کارکنوں کی ایک جماعت اس کالج کو ہر
طرح مکمل بنانے کے عزم و ارادہ سے اُن کی مدد پر کمربستہ ہوگئی۔ آئندہ چلکر اس کالج کا الحاق ہندو یونیورسٹی
سے ہوگیا۔ ہندو یونیورسٹی کے حکام نے ان کی خدمات کا جو انھوں نے کالج کے سلسلہ میں انجام دی
تھیں، دریادلی سے اعتراف کیا اور انھیں مجلس انتظامیہ کا ایک رکن بنایا۔ تعلیمی حلقہ میں انھوں نے
انگلستان اور ہندوستان میں نہ صرف اسکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے اور ان کو باقاعدہ بنانے
میں مدد کی ہے بلکہ تعلیم اور اس کے نظریوں میں بعض بہت معقول اضافے کئے ہیں۔ انھوں نے
تعلیمی آزادی، ترقی انفرادیت، معلم اور طالب علم کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرانے اور ابتدائی
اور ثانوی اسکولوں میں جسمانی سزا کو منسوخ کرانے میں بہت جدوجہد کی ہے۔ ہندوستان میں تعلیم
کی خدمات و ترقی کے صلہ میں یونیورسٹی نے انھیں ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی۔

تعلیمی حلقہ میں سنٹرل ہندو کالج کو ہندو یونیورسٹی سے ملحق کرنے کے بعد ان کی خدمات ختم
نہیں ہوئیں، بلکہ انھوں نے "تھیاسوفیکل ایجوکیشنل ٹرسٹ" کی بنیاد ڈالی جس سے بہت سے کالجوں
اور اسکولوں کا الحاق ہوا، اور تھیاسوفی کے مقاصد کی اشاعت و تبلیغ کے لئے انھوں نے دو رسائل
"تھیاسوفسٹ" اور "ادیار بلیٹن" نامی جاری کئے اور ان کی ادارت کے فرائض خود انجام دیتی رہیں
کچھ عرصے کے بعد قومی تعلیم کی ترقی کی خاطر سوسائٹی اور نیشنل یونیورسٹی قائم ہوئیں۔ اس یونیورسٹی
کے پہلے چانسلر ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور تھے۔ سربرآوردہ لیڈروں کی مدد سے اس باب میں بہت کچھ
کام ہوتا رہا۔ لیکن جب مونٹیگو چیمسفورڈ ریفارمز پر بحث و مباحثہ کا دور آیا تو یہ جاری نہ رہ سکی۔

بوائے اسکاوٹ تحریک | انھوں نے ہندوستان میں تحریک بوائے اسکاوٹ کی بنا ڈالی قبل اس کے کہ
کسی اور شخص کو اس تنظیم کا خیال ہوتا انھوں نے ادیار میں ان لوگوں کی ایک جماعت بنائی جو اسکاوٹنگ
میں دلچسپی رکھتے تھے۔ شروع میں جو لوگ اس میں شامل ہوئے انھیں وردی اور بلّہ (بیج) وہ خود اپنے
پاس سے دیتی تھیں۔ ابتدا ہی سے یہ تحریک اس قدر مقبول ہوئی کہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے

بوائے اسکاوٹ جاری کرنے کے لئے کارکنوں کی مانگ ہونے لگی۔ جب مدراس گورنمنٹ نے ان
کی سیاسیات سے نفرت کا اظہار کیا تو اُن کی اس اسکاوٹ تنظیم سے بھی بے التفاتی برتی جانے لگی۔
چنانچہ انھیں دق کرنے کے لئے گورنمنٹ کی حمایت میں اور تنظیمیں جاری کی گئیں۔

سیاسیات موجودہ زمانے کے لوگوں میں ڈاکٹر بیسنٹ کی شہرت بہ نسبت کسی اور چیز کے زیادہ تر
ان کی سیاسیات کی بنا پر ہے۔ انھیں لفظ پردیسی سے سخت نفرت تھی۔ ایک مرتبہ مسٹر گوکھلے نے انھیں
ہندوستانی کہا تھا، جس پر انھوں نے بہت فخر کیا تھا۔ وہ نہایت قابل صحیفہ نگار تھیں، انھوں نے ہوم
رول کی حمایت میں ہندوستان کی متحدہ قوم کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کرنے کیلئے "کامن ویل"
اور "نیو انڈیا" دو اخبار جاری کئے۔ ان کا سب سے پہلا کام انڈین نیشنل کانگریس کے دو حصوں کو جو
بمقام سورت ۱۹۰۷ء میں علیحدہ علیحدہ ہو گئے تھے باہم متحد کرنا تھا۔ یہ دونوں حصے جن کے نمایندے مسٹر
تلک اور مسٹر گوکھلے تھے انھیں کی کوششوں سے باہم متحد ہو گئے۔ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء میں "نیو انڈیا" کے ذریعہ
سے انھوں نے کانگریس کی تائید بہت زوردار الفاظ میں کی جس کی بنا پر گورنمنٹ کا غصہ بھڑک اٹھا اور اُن
سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی جسکو مسز موصوفہ نے بخوشی ادا کر دیا۔ جولائی ۱۹۱۶ء میں بمبئی گورنمنٹ نے "ڈیفنس
آف انڈیا ایکٹ" نافذ کیا جس کی رو سے احاطہ بمبئی میں ان کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔ اسی سال ستمبر کے مہینے
میں ممالک متوسط کے چیف کمشنر نے بھی اُنکی روک تھام کے لئے اسی قسم کا قانون نافذ کر دیا لیکن ادھر تو حکمران
مسز بیسنٹ کو طرح طرح سے دق کر رہے تھے اُدھر تمام ملک میں ہوم رول کی اشاعت ہو رہی تھی۔ اور جب لکھنو
میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تو مسز بیسنٹ کو جدید سیاسی تحریک کا زبردست علمبردار تسلیم کیا گیا۔ لکھنو
کانگریس درحقیقت ہوم رول کانگریس تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی ہندوستان میں اسیطرح
آزاد ہوں جس طرح انگریز انگلستان میں۔ یہاں خود ہندوستانیوں کے انتخاب کردہ ہندوستانیوں کی حکومت
ہو، ہندوستان خود اپنے وزرا کا انتخاب کرے اور جب ضرورت ہو تو خود ہی انھیں علیحدہ کر دے ہتھیار
رکھنے پر مزاحمت نہ ہو، بری اور بحری فوج اپنی ہو۔ اپنے ہی کارکن ہوں خود ہی ٹیکس وغیرہ عائد کریں اور اپنے
بجٹ خود بنائیں، اور اپنی رعایا کو خود ہی تعلیم دیں، یعنی اپنی حدود میں خود مختار حکومت ہو۔ ۱۹۱۷ء میں جب
وہ کانگریس اور لیگ کے تعلیمی پروپیگنڈا میں ہمہ تن مصروف تھیں تو مدراس گورنمنٹ نے انھیں نظر بند کر لیا
لیکن اس نظر بندی سے اس قدر ہل چل مچی کہ تین مہینے کے اندر اندر ہی وہ آزاد کر دی گئیں۔ ادھر گورنمنٹ
اُن کی سبکی کرنے پر کمربستہ تھی اُدھر ہندوستانیوں نے ان کے سر پر عزت و عظمت کا تاج رکھا۔ یعنی اپنی
نظر بندی کے زمانے میں جب کہ گورنمنٹ ان کو امن عامہ کے لئے خطرناک سمجھ رہی تھی ہندوستان نے انھیں

صدر کانگریس

وہ بہترین انعام پیش کیا جو اس کی طاقت میں تھا یعنی ان کو انڈین نیشنل کانگریس کا صدر منتخب کیا۔ ۱۹۱۷ء تک کانگریس کا صدر صرف کانگریس کے اجلاسوں میں صدارت کیا کرتا تھا اور اس کے علاوہ کوئی عملی کارروائی نہیں کرتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر بیسنٹ نے ایک نئی کارروائی کی۔ یعنی انھوں نے پریسیڈنٹ کانگریس کو سال بھر کیلئے ایک باقاعدہ حکمراں عہدہ قرار دیا۔ لوگوں نے اول اول ان کا مذاق بھی اڑایا کہ وہ اپنے آپ کو کرسیِ صدارت پر پاکر خود پسند ہوگئی ہیں لیکن اب یہ قاعدہ عام ہوگیا ہے۔ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے متعدد کام کئے اور کانگریس کمیٹیوں کی بھی صدارت کی۔ سیاسیات میں اس قدر دلچسپی کے باوجود وہ کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ تھیاسوفیکل اجلاس بھی منعقد کیا کرتی تھیں مثلاً ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ ۱۹۱۷ء میں بمقام کلکتہ، ۱۹۱۸ء میں بمقام دہلی اور ۱۹۱۹ء میں بمقام امرتسر۔ ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ آف انڈیا بل پر شہادت دینے انگلستان گئیں۔ اس ایکٹ نے بعد میں مونٹیگو چیمسفورڈ ریفارمز کی شکل اختیار کی۔ ۱۹۲۰ء سے ان کی شہرت کو قدرے زوال ہوا کیونکہ انھوں نے گاندھی جی کی تحریک ترک موالات کی مخالفت شروع کردی تھی۔ دو سال کے بعد انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے جدید تحریک کی ابتدا کی جس نے بعد میں نیشنل کنونشن (قومی اجلاس) کی شکل اختیار کرلی۔ اسی کی حمایت میں کامن ویلتھ آف انڈیا بل ۱۹۲۵ء پاس ہوا۔ اس بل میں تدریجی استحقاق رائے زنی کا بے نظیر طریقہ بیان کیا گیا تھا، اور مسز بیسنٹ کے نزدیک صرف یہی طریقہ ہندوستان اور اس کے کروڑوں غیر تعلیم یافتہ دیہاتیوں کے حسب حال ہے۔

ہوم رول اور نیشنل کنونشن کی تحریکیں مسز بیسنٹ کی سیاست دانی اور اُن کی بے نظیر تنظیمی قوت اور قابلیت اور اپنے کارکنوں میں ہمت و استقلال کی روح پھونک دینے کی بیّن مثال ہیں۔

دیا

ریداس ذات کے چمار تھے جن کے چھونے سے راہگیروں کو نفرت تھی، وہ گلیاں جن میں شانے سے شانہ چھلتا تھا انکے لئے سنسان ہوجاتی تھیں۔ سوامی رامانند صبح کے وقت اشنان کرکے مندر کو جارہے تھے۔ جب ریداس نے دور ہی سے انکے آگے سرِ تسلیم خم کیا تو سوامی جی ٹھٹکے اور استفسار کیا کہ "اے دوست تم کون ہو؟" جواب ملا "مہاراج میں ایک خشک اور اوسر زمین ہوں جسے حقارت کرنیوالے شبانہ روز پامال کرتے ہیں، آپ میرے گرو ہی نہیں بلکہ دور کے آسمان پر سحاب ہیں اگر آپ کی دیا کی بارش اس ناچیز زمین پر ہوجائے تو کیا عجب ہے کہ اس بنجر سے ویرانی گلفشانی کی بہار پیدا ہوجائے" گرو نے چھاتی سے لگالیا اور اپنے مراعات بے غایت کا اس پر ایسا ترشح کیا جس سے بھجنوں کی ترنم خیز سیلابی کا طوفان ریداس چمار کے سینہ میں امنڈ نکلا

ٹیگور

جاپان میں بودھ دھرم

(از مسٹر گنگا چرن کھنا)

زین (دھیان) مت

زین (Zen) مت بودھ دھرم کی ہی ایک شاخ ہے، مگر بدھ مت کی کتب اس پر کچھ روشنی نہیں ڈالتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زین وہ چیز ہے جس کی شروعات اُس جگہ سے ہوتی ہے جہاں بودھ کتابوں کی تعلیم ختم ہوتی ہے۔ بھگوان ساکیہ منی گوتم بُدھ نے پینتالیس[۴۵] برس تک اپنے مذہب کی تلقین کی، ہزارہا مرد عورتوں سے گفتگو کی اور وعظ دیا۔ اُن میں سے کچھ کا ذکر بودھ دھرم کی بنیادی تین کتابوں تری پٹک (Tripitaka) میں ملتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان سب باتوں کا دھیان جن کا تذکرہ ہم کو ان کتابوں میں ملتا ہے۔ بھگوان بودھ کے دل و دماغ میں اُسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب ارویلا کے جنگل میں ایک پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے بھگوان کو روشن ضمیری حاصل ہوئی؟ اس سوال پر تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ نہیں اُس درخت کے نیچے تو اُنھیں ایک خاص تجربہ حاصل ہوا یعنی ایک خاص نور ایک خاص سکون اُنھیں نصیب ہوا۔ اُن کے دل نے ایک خاص طرز اختیار کر لیا۔ وہ ایک خاص منزل پر پہونچ گئے۔ اور جو بیانات ہم کو تری پٹک میں ملتے ہیں اُن میں اسی نظارہ کی تصریح و تفصیل ہے جس کو بھگوان بودھ نے اُس خاص بلندی سے پینتالیس[۴۵] برس تک دیکھا۔ اس لئے ہمارا اصلی مدعا یہی ہے کہ ہم اس تجربے کو حاصل کریں۔ جب ہمارے دل میں اُس کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو قدرتاً بھگوان بودھ کے غیر معمولی ایثار اور اُن کی سخت ریاضت کا خیال کر کے ہمارا دل بیٹھ جاتا ہے اور ہم مایوس ہو جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اسی موقعہ پر زین ہمارے دل کو تسکین دیکر ہماری حوصلہ افزائی کرتا ہے

[۱] اس سلسلے کے پہلے دو نمبر زمانہ بابت ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۳ء میں ہدیۂ ناظرین ہو چکے ہیں۔

کیونکہ وہ بتاتا ہے کہ گو کام دشوار ہے مگر حوصلہ شکن نہیں۔ بھگوان بودھ نروان حاصل کرنے سے پیشتر گم گشتہ راہ تھے۔ اُنھوں نے بڑی بڑی سخت ریاضتیں کیں، جن کو اُنھوں نے بعد میں خود غلط اور نقصان دہ قرار دیا۔ اب جبکہ یہ کڑی منزل طے ہو چکی ہے اور بھگوان بودھ کے ہزاروں معتقد اس تک پہونچ چکے ہیں تو اُن کے تجربات و ہدایات ہماری رہنمائی کے واسطے موجود ہیں۔ اب اگر ہم ان کے تجربات سے فائدہ اُٹھانے کے لئے تیار ہوں تو یہ راہ ہمارے لئے اتنی دشوار نہیں رہی جتنی کہ متقدمین کے واسطے تھی۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ بھگوان بودھ راجگڑہ میں گدرکوٹ کی پہاڑی پر مقیم تھے۔ ایک دن انھوں نے وعظ کہنے کے بجائے اپنے مریدوں کے سامنے صرف ایک پھول رکھا اور مسکرا دیئے۔ اس میں جو رمز پنہاں تھا اس کو ایک مرید مہاکشب کے سوائے اور کوئی نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ اُسی وقت سے بودھ نے اُس کو اپنا خاص شاگرد بنالیا اور اس کو مخفی تعلیم بھی دی۔ اُسی تعلیم کے پیرو کار بدھ دھرم پر عامل ایک ہندوستانی بزرگ تھے جو ایک ہندو راجہ کے شہزادے تھے مگر دنیا سے منھ موڑ کر اعلیٰ درجہ کی روحانی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ مہاتما چھٹی صدی میں چین پہونچے، جہاں ہزارہا اشخاص اُن کے معتقد ہو گئے۔

ان مہاتما کے تعلیم دینے کے طریقے بالکل نرالے تھے، اور اُن کی زندگی بھی اہل چین کے واسطے عجوبہ سے کم نہ تھی۔ وہ سات برس تک چپ چاپ ایک دیوار کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے، اور جب کسی نے کوئی سوال کیا تو کبھی انگلی دکھادی، کبھی آسمان کی طرف اشارہ کر دیا، کبھی زمین کی طرف، مگر ان اشاروں میں عجب روحانی قوت تھی جس کی بدولت متلاشیانِ حق پر دین و دنیا کے سارے بھید کھل جاتے تھے۔ اسی تعلیم کا نام جاپان میں زین (ZEN) پڑ گیا اور آج گیارہ سو برس سے یہ وہاں رائج ہے۔

جاپانیوں کے دل میں اس تعلیم کے لئے بڑی عظمت ہے۔ دراصل یہی اُن کی تہذیب و روحانیت کا لب لباب ہے۔ جاپان کے بڑے بڑے مہاتما، بڑے بڑے بہادر، بڑے بڑے شاعر، بڑے بڑے دستکار زین مت کے ماننے والے ہیں۔ سچ پوچھئے تو جاپان کی موجودہ ترقی اور خوشحالی زین تعلیم کا نتیجہ ہے۔ زین مذہب جاپانیوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ یہی اُن کی زندگی کا خاص جوہر اور اُن کی آزادی کا اصلی سبب ہے۔ جاپانیوں کے قومی احساس کا باعث بھی زین تعلیم اور عمل ہے۔ جب ہم لوگ ایک دوسرے سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جدا ہو جاتے ہیں تو اپنی رائے اور عقل کو بہتر سمجھ کر بڑے سے بڑے رہنماؤں پر نکتہ چینی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور اس کو ایک قسم کی خوبی سمجھنے لگتے ہیں۔ جاپانیوں کے قومی اتفاق اور یگانگت کی تہ میں بھی یہی زین مت عمل پیرا ہے۔ یہاں پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ پھر جاپان کی غیر ملکی پالیسی اتنی خود غرضانہ کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں جاپان

کا کوئی تصور نہیں ہے۔ درحقیقت آجکل ہم بین الاقوامی اتفاق کا گیت تو گاتے ہیں، مگر ہمارا عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ جب واقعی بین الاقوامی احساس کا زمانہ آئیگا تو جاپان سب سے پہلے اُس میں شریک ہوگا۔
زین مشرقی فلسفہ کا لب لباب ہے لیکن اس میں ہم کو گیتا جیسی کوئی کتاب نہیں ملتی کیونکہ زین ایک نقطۂ خیال، ایک طریقِ عمل کا نام ہے۔ اور گو زین مت میں گیان کوٹ کوٹ کر بھرا ہے پھر بھی وہ گیان سے پرے ہے، کیونکہ اس میں نہ کوئی منطق ہے اور نہ کوئی ایسے اصول جن پر اعتقاد لازمی ہو۔ زین ایک طرح کی پوشیدہ روحانی تعلیم ہے، مگر اس کی کوئی خاص کتاب نہیں ہے نہ کوئی خاص منتر ہے۔ البتہ وہ روحانیت کی روحِ رواں ہے۔

یہ بودھ دھرم کی ایک شاخ ہے، اس میں نہ کسی مقدس کتاب کا سہارا لیا گیا ہے اور نہ کسی خاص عقیدے پر زور دیا گیا۔ اس مت کے مندروں میں بودھ مورتیاں ضرور ملتی ہیں اور اُن میں دوسرے مندروں کی طرح پوجا بھی ہوتی ہے لیکن اس مت کے لئے کسی خاص قسم کی پرستش یا پوجا کی ضرورت نہیں ہے جیسے دیگر فرقوں میں بعض لوگ بھکشوؤں کی زندگی اور بعض عیالداروں کی زندگی بسر کرتے ہیں، اُسی طرح زین مت کے پیرو بھی تارک الدنیا اور گرہست دونوں ہیں۔ اس پر بھی ان میں اور دیگر فرقہ کے لوگوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ زین تعلیم کی مزید توضیح سننا ہو تو ایک زین مہاتما کا قول سن لیجئے جو یہ ہے کہ "نہ مہاتما نروان پاتے ہیں اور نہ پاپی دوزخ میں جاتے ہیں"۔ بات یہ ہے کہ زین مت اُس شئے کا جویا ہے جو عذاب و ثواب کے تصور، پاپ پن کے خیال سے بالاتر ہے۔
میں نہیں کہہ سکتا کہ زین مت وحدانیت کا معتقد ہے یا ہمہ اوست کا۔ یہ بھی ٹھیک نہیں کہا جا سکتا کہ زین کے پیروان خدا کی ہستی کے قائل ہیں۔ مگر ہاں زین مت ناستک نہیں ہے کیونکہ وہ ایک خاص روحانی تجربہ پر زور دیتا ہے جو کسی حالت میں نفی نہیں ہو سکتا۔ زین مت کی اصلی غایت سمجھنے کے لئے برسوں کی ریاضت درکار ہے۔ وہ روشن ضمیری حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے ایک طرح کا یوگ ہے، یا یوں کہئے کہ بدھ یوگ ہے۔ مگر اس میں اور ہمارے یوگ میں بڑا فرق ہے کیونکہ اس میں آنکھ کے درمیانی نقطہ یا کسی چکر یا کسی مورت یا صورت پر دھیان لگانے کی تلقین نہیں کی جاتی ہے بلکہ یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی باغ میں بیٹھکر پھولوں اور سبزہ زار کی سیر کیجئے۔ صبح کے نظارہ کو دیکھئے، چاند کی چاندنی کا لطف اُٹھائیے، سمندر کے کنارے بیٹھکر پانی کی سفید چادر ملاحظہ کیجئے بہرحال جب کبھی آپ کسی زین مہاتما سے اس کے بارے میں کوئی سوال کریں گے تو وہ

یا تو وہ گردن ہلا دیگا یا کھنکھار دیگا، یا اُنگلی دکھا دے گا یا کوئی پھول سُنگھا دیگا یا بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک یا ہوا اور پانی کی طرف اشارہ کر دے گا۔ یا یہ کہدے گا کہ تمہارے روزمرہ کے خیالات زین ہیں۔

زین بھکشوؤں کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی جویندۂ حق کے دل میں بھکشو بننے کی خواہش ہوتی ہے تو وہ مختصر سامان سفر لیکر اپنے گھر سے نکلتا ہے اور کسی زین خانقاہ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، دروازہ کھلتا ہے اور اُس کو بتا دیا جاتا ہے کہ خانقاہ میں اُس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مگر وہ اُس کا مطلق خیال نہ کرکے دروازے ہی پر پڑا رہتا ہے۔ پھر وقت مقررہ پر اُس کو خوراک پہونچا دی جاتی ہے، کیونکہ زین خانقاہ کے دروازے پر کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا۔ رات آتی ہے جویندہ سے پھر جانے کو کہا جاتا ہے، مگر جب وہ پھر دروازے پر پڑا رہتا ہے تو مجبوراً اُس کو صرف رات بھر کے لئے خانقاہ میں جگہ دی جاتی ہے۔ مگر دوسرے دن صبح کو اُسے پھر دروازے کے باہر نکال دیا جاتا ہے، مگر جویندہ تمام دن وہیں پڑا رہتا ہے۔ یہ مشق کئی دن تک قائم رہتی ہے اور آخرکار جویندہ کو عارضی طور پر خانقاہ میں داخل کر لیا جاتا ہے اور کسی کوٹھری میں اُس کا سامان اُس کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور جویندہ اُس کے سامنے بیٹھا رہتا ہے۔ صبح کا وقت ہوتا ہے نپا ہوا پانی ہر ایک بھکشو کو دیدیا جاتا ہے، کیونکہ خانقاہ مین کسی چیز کا بیجا استعمال نہیں کیا جاتا۔ پھر بھکشو اپنے اپنے ذمہ خدمتی کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ کوئی مندر میں جھاڑو دیتا ہے، کوئی فرش کو پانی سے صاف کرتا ہے، کوئی باغ میں سینچائی کرتا ہے، کوئی کھیتی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض خدمت سے کوئی بھکشو بھی مستثنےٰ نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے۔ پھر کسی دن بھکشو لوگ ایک قطار باندھکر بھیک مانگنے نکل جاتے ہیں، اور جو کچھ ان کو مل جاتا ہے اس پر بسر کرتے ہیں کبھی خانقاہ ہی میں کھانا پکاتے ہیں، جب ایسا ہوتا ہے تو کھانا تیار ہونے پر گھنٹی بجتی ہے اور بڑے کمرے میں سب لوگ کھانے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ کھانے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے برتن خود ہی صاف کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر آرام کرکے کتب بینی کرتے ہیں اور وقت مقررہ پر گُرو کے ہاں تعلیم کے لئے جاتے ہیں۔ گورو کے کمرے کے دروازے پر ایک گھنٹی رکھی رہتی ہے، ہر ایک مرید داخل ہونے سے پہلے اُس کو بجا دیتا ہے۔ بہرحال گورو جو سبق دیتا ہے اُسکی مشق کی جاتی ہے۔ اس کے لئے سب لوگ پھر بڑے کمرے میں جاتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک بزرگ ٹہلتا رہتا ہے اور ہر ایک شاگرد کے چہرے کو بغور دیکھتا ہے جہاں

کسی پر نیند کا غلبہ معلوم ہوا یا طبیعت کے انتشار کے آثار دکھائی دیے اُس نے اپنے عصا سے شاگرد کو چوکنا کر دیا۔ جس کے بعد بزرگ اور شاگرد ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں۔ رات کو بھی سب لوگ اسی کمرے میں برابر برابر سوتے ہیں۔ مہاتما لوگ نہایت جفاکشی اور ایثار کی زندگی بسر کرتے ہیں اُن کی زندگی کا کوئی منٹ بھی بیکار نہیں جانے پاتا ہے۔ اُن کے روحانی تجربات بہت اونچے درجے کے ہوتے ہیں۔ آج اِن خانقاہوں میں بڑے بڑے تعلیم یافتہ جاپانی فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں اُنھیں کی بدولت ملک کی بڑی بڑی درسگاہیں قائم ہیں۔ کاش ہندوستان میں بھی اس قسم کے فقیر ہوں۔ بہر نوع زین مت لافانی ہے، جب تک ایک آدمی بھی روحانی تجربات میں مصروف رہے گا اُس وقت تک یہ دنیا سے غائب نہیں ہو سکتا ہے۔

شادی

"اگر بہترین شادی کرنا چاہتے ہو تو اپنے ہم پایہ کے ہاں کرو" (آوڈ)

"اچھا گانا اور اچھی شادی، دونوں خداداد ہیں" (پرتگیزی شہادت)

"شادی ایک ایسا مقام ہے جس میں روز ازل سے جو لوگ داخل ہو جاتے ہیں، باہر نکلنے کے لئے، اور جو باہر ہوتے ہیں، اس میں داخل ہونے کے لئے بیتاب رہتے ہیں" (ایمرسن)

مردوں کو چاہیئے کہ شادی سے پہلے آنکھیں خوب کھلی رکھیں، لیکن شادی کے بعد نیم بند" (مادام سکوڈری)

"انسان کے سب کاموں میں سے شادی ہی ایک ایسا کام ہے جو کسی اور شخص سے ذرہ بھر تعلق نہیں رکھتا لیکن اسی میں اور لوگ سب سے زیادہ دخل دیتے ہیں۔" (جان سلڈن)

"شادی میں بھی، دوسری باتوں کی طرح، دولت کی نسبت قناعت کی افراط ہوتی ہے۔" (مولیئر)

دنیا کے خیال میں شادی کے بعد سب قصے ختم ہو جاتے ہیں، حالانکہ اس سے ہر قصے کا آغاز ہوتا ہے (میڈم جوہن)

امیر آدمی اُس دولت کے لئے شادی کرتا ہے جیسے اُس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور غریب آدمی اُس حسن کے لئے جسے وہ محسوس نہیں کر سکتا" (گولڈ اسمتھ)

اُن دونوں میں سے جو بھی کرو گے، پچھتاؤ گے"
(سقراط۔ اس سوال کے جواب میں کہ کیا شادی کرنا چاہیئے یا نہیں)

(نخلستان)

مصحفی

(از جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل غازی آباد)

آپ کا نام شیخ غلام ہمدانی تھا، اور مصحفی تخلص کرتے تھے۔ آپ شیخ ولی محمد کے بیٹے تھے جو امروہہ ضلع مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ عنفوانِ شباب میں دلّی آ کر مولوی مستقیم گوپاموی سے عربی صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں، فارسی میں بھی عمدہ استعداد بہم پہونچائی۔ چونکہ طبیعت میں موزونی خداداد تھی اور اُس وقت دلّی میں شعر و سخن کا بہت چرچا تھا اور اہل کمال کا مجمع تھا، اُن کی صحبت میں شرکت کرتے کرتے شعر گوئی شروع کر دی۔ کچھ دنوں میں کافی مشق بہم پہونچائی اور اپنے مکان پر مشاعرہ قائم کیا جب تک دلّی میں رہے برابر مشاعرے کرتے رہے۔ آپ کے مزاج میں غربت، مسکینی اور ادب کی پابندی بہت تھی اسی وجہ سے دلّی کے تمام شاعر اور معزز اشخاص آپ کے ساتھ لطف و مروت سے پیش آتے تھے۔ اُس زمانہ میں غالباً آپ آسودہ حال تھے اسی وجہ سے آپ نے نوکری کی بھی کہیں جستجو نہیں کی۔ فکر سخن میں مبتلا رہے۔ لیکن جب دلّی پر تباہی آئی اور یہاں کے گھرانے فیض آباد اور لکھنؤ کو روانہ ہوئے تو آپ بھی شاہجہان آباد سے نکلے۔ آپ دلّی کو اپنا وطن سمجھتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

دلّی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا

دلّی سے نکل کر پہلے آپ کیٹھر گئے، وہاں شیخ قیام الدین قائمؔ نواب محمد یار خاں کی سرکار میں ملازم تھے، آخر الذکر نے آپ کا قصیدہ پیش کر کے تنخواہ مقرر کرا دی۔ چند روز آپ ٹانڈہ میں نہایت خوشی اور فارغ البالی کے ساتھ رہے۔ جب نواب صاحب کا کھیل بگڑا تو آپ لکھنؤ تشریف لے گئے، کچھ دنوں وہاں رہ کر پھر دلّی واپس آئے مگر چند روز بعد آب و دانہ کی کشش پھر لکھنؤ لے گئی اور آپ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ محنت و کاوش کے ساتھ آپ نے مشقِ سخن جاری رکھی، اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی اُستادی کو خاص و عام سب نے تسلیم کر لیا۔

سید انشاؔ سے آپ کے بہت معرکے رہے، دونوں نے ایک دوسرے کی مذمت کرنے میں کوئی

کسرنہ اُٹھا رکھی۔ آزاد نے یہ حال کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے، ہم کو یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تاریخ پیدائش ۱۱۶۴ہجری ہے کیونکہ آپ نے چہتر برس کی عمر میں ۱۲۴۰ہجری میں انتقال کیا اور لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

آپ نے آٹھ دیوان اردو اور ایک دیوان فارسی میں ترتیب دیا ہے۔ اور دو تذکرے تحریر کئے ہیں جن میں سے ایک فارسی شعرا کا دوسرا اردو شعرا کا مگر دونوں فارسی زبان میں ہیں۔

تعجب ہے کہ آپ نے کسی سے مشورۂ سخن نہ کیا، حالانکہ دلّی میں اُس وقت اعلیٰ درجہ کے شعرا موجود تھے۔ آزاد نے حاشیہ پر سراپا سخن کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امانی کے شاگرد تھے۔ یہ امانی کون بزرگوار تھے؟ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ چونکہ کسی اور تذکرہ میں آپ کی شاگردی کا ذکر نہیں ہے اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ آپ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" میں داخل تھے۔

کلام پر تبصرہ آپ جملہ اصناف سخن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، قصائد، قطعات، غزلیں، تاریخیں، مستزاد، مخمس، رباعیات وغیرہ سب آپ کے یہاں موجود ہیں۔ سنگلاخ زمینوں میں نہ صرف غزلیں بلکہ قصائد بھی کہے ہیں، اور سب میں زور کلام پایا جاتا ہے۔ آپ پُرگو شاعر تھے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کا کلام رطب و یابس سے پُر ہے۔ آپ نے جو قصیدہ مرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں بطور معذرت پیش کیا ہے اور جس کا مطلع ہے:-

قسم بذاتِ خدائے کہ ہے سمیع و بصیر کہ مجھ سے حضرتِ شہ میں نہیں ہوئی تقصیر

اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ادائے مطالب پر کس قدر قدرت رکھتے تھے۔ نیز آپ کی قادر الکلامی اُس قطعے سے بھی عیاں ہے جو آپ نے انشا کے جواب میں لکھا ہے۔ حضرت انشا نے تو آپ پر ایک سیدھے سادے قطعہ میں اعتراضات وارد کئے لیکن آپ نے اُسی معرکۃ الآرا غزل کی طرح میں قطعہ لکھا اور حق یہ ہے کہ خوب لکھا جس کے چند شعر حسب ذیل ہیں:-

اے آنکہ معارض ہو مری تیغ زباں سے تو نے سپر عذر میں مستور کی گردن
ہے آدمِ خاکی کا بنا خاک سے پُتلا گر نور کا سر ہووے تو ہو نور کی گردن
میں لفظ سقنقور مجسّم نہیں دیکھا ایجاد ہے تیرا یہ سقنقور کی گردن
گردن کی صراحی کے لئے وضع ہے ناداں بیجا ہے خم بادۂ انگور کی گردن
اس سے بھی میں گزرا غلطی اور یہ سنئے باندھے ہے کوئی خوشۂ انگور کی گردن

آزاد لکھتے ہیں کہ "دیوان اِن کی استادی کو مسلّم الثبوت کرتے ہیں، انواع و اقسام کی صدہا غزلیں

ہیں۔ جو غزلیں نہایت سنگلاخ زمینوں میں لکھی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت مشق سے کلام پر قدرت کامل پائی ہے۔ الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کرکے اِس درو بست کے ساتھ شعر میں کھپایا ہے کہ جو حق اُستادی کا ہے ادا ہو گیا ہے۔ ساتھ اس کے اصل محاورہ کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔" ایک جگہ لکھا ہے کہ "اصول سے ماپ کر اور قول سے تول کر بات کہتے ہیں۔"

نواب شیفتہ تحریر فرماتے ہیں: "اکثر کلامش بر کم پایہ و از لطائف خالی است امّا گزیدہ اشعار او درنہایت رتبت و الا و مرتبت عالی است۔"

حضرت مصحفی کا درجہ نہ صرف اس وجہ سے کہ انھوں نے آٹھ دیوان اپنی یادگار چھوڑے بلند ہے بلکہ وہ اس وجہ سے بھی قابل تعریف ہیں کہ اُن کے متبع اور پیرو سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ لکھنؤ کی شاعری کے بابا آدم درحقیقت یہی بزرگوار ہیں۔ ناسخ بالواسطہ اور آتش، ضمیر، خلیق، اسیر وغیرہم بلاواسطہ سب آپ کے شاگرد تھے جنھوں نے استادی کا رتبہ پایا بلکہ اپنے شاگردوں کو بھی استاد بنا گئے۔ ضمیر کے شاگرد دبیر اور خلیق کے شاگرد انیس دونوں نے مرثیہ گوئی کو معراج کمال پر پہونچا دیا۔ جس اُستاد کے اتنے شاگرد اور شاگرد در شاگرد ہوں اُس کی فیض رسانی اور اُستادی میں کون شبہ کر سکتا ہے۔

آپ کے ہم عصروں میں سید انشا اور جرأت نے اپنی خاص روش اختیار کی۔ سید انشا کا صاحب طرز ہونا مسلّم لیکن خدا اس جدت سے سب کو محفوظ رکھے۔ جرأت کے یہاں معاملہ بندی زیادہ ہے اور اسی معاملہ بندی کی بدولت رکاکت پیدا ہو گئی ہے۔ تاہم انشا کے مقابلہ میں غنیمت ہے۔ مصحفی نے کوئی بھی بات پیدا نہیں کی، پرانی لکیر کے فقیر بنے رہے، جو بزرگوں سے ورثہ ملا تھا اُس میں اضافہ نہیں کیا۔ صرف اُس کو محفوظ رکھا۔ انشا نے عموماً اور جرأت نے کہیں کہیں شاعری کو بدنام کیا اور دوسرے لفظوں میں بزرگوں کے ورثہ کو خراب و برباد کیا۔

اس زمانہ میں یعنی میر و سودا کے بعد دراصل اردو شاعری نے فی نفسہٖ کوئی ترقی نہیں کی، مصحفی نے صرف تقلید سے کام لیا۔ انشا نے بے راہ روی سے اور جرأت نے عامیانہ پن سے۔ میں حضرت مصحفی کا محض اس وجہ سے مداح ہوں کہ آپ نے اس زمانہ میں جبکہ اُردو شاعری صرف تفریح طبع کا سامان بن رہی تھی اور بوالہوسی کی تعلیم دے رہی تھی صدائے احتجاج بلند کی اور حتی المقدور کوشش کی کہ اُردو شاعری کا پرانا ٹھاٹ بندھا رہے۔ اگرچہ

صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں

تاہم اس کا یہ اثر ضرور ہوا کہ انشا کو ایک بھی مقلد بہم نہ پہنچا اور جرأت کے متبعین کی تعداد بھی بہت کم رہی

اِن دونوں حضرات کے انتقال کے بعد وہ ہنگامہ تو فرو ہوگیا جو اُن کی زندگی میں برپا تھا لیکن یہ خرابی ضرور پیدا ہوگئی کہ مضمون آفرینی کے بجائے صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات نے شاعری پر قبضہ کرلیا۔ رعایت لفظی نے وہ زور پکڑا کہ شعر ایک کھلونا بن گیا۔ یہ بات اس وجہ سے نہیں پیدا ہوئی کہ انشا اور جرأت کا کلام آیندہ نسلوں نے خوب پڑھا اور اُسے پسند کیا بلکہ اس وجہ سے ظہور میں آئی کہ نوجوان شعرا نے انشا اور جرأت کی طرح صاحبِ طرز بننے کی کوشش کی۔ اِس جدت طرازی کی بدولت شاعری کا اصل مفہوم ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور شاعران لکھنؤ الفاظ کی بھول بھلیاں میں اپنا رستہ گم کر بیٹھے۔ اگر وہ اپنے استاد مصحفی کی تقلید اسی طرح کرتے جس طرح مصحفی نے اپنے پیش رو شعرا کی پیروی کی تھی تو ممکن نہ تھا کہ اُن کی شاعری میں درد و اثر نہ پایا جاتا جس کو شعر کا ماحصل سمجھنا چاہیئے۔ بیشک جن اصحاب نے شعر گوئی ترک کرکے مرثیہ گوئی شروع کی آنھوں نے اس جدت سے فائدہ اُٹھایا کیونکہ اُنھوں نے رعایت لفظی اور تشبیہات و استعارات کو بطور نمک استعمال کیا۔ تمام کھانا نمک نہیں بنایا اور اصل مقصد کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

المختصر مصحفی کا کلام ہر قسم کا ہے، پُر جوش بھی ہے، پُر درد بھی ہے، شیریں بھی ہے، پُر کیف بھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ پھیکا بھی ہے، بے لطف بھی ہے، پھس پھسا بھی ہے، کمزور بھی ہے، کہیں کہیں بندشیں چست ہیں تو کہیں کہیں سست، مضمون آفرینی کم ہے اور قافیہ پیمائی بہت زیادہ سادگی البتہ بہت ہے۔ عشق و عاشقی کے معمولی مضامین ہیں، اُن سے ایک انچ اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ تصوف کا شائبہ تک نہیں۔ البتہ ایک غزل خوب لکھی ہے جو شانِ تصوف لئے ہوئے ہے۔

مخلوق ہوں یا خالقِ مخلوق نما ہوں	معلوم نہیں مجکو کہ میں کون ہوں کیا ہوں؟
ہوں شاہدِ تنزیہ کے رخسار کا پردہ	یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردے میں چھپا ہوں
ہے مجھ سے گریبانِ گلِ صبح معطر	میں عطرِ نسیمِ چمن بادِ صبا ہوں
گوشِ شنوا ہو تو مرے رمز کو سمجھے	حق یہ ہے کہ میں سازِ حقیقت کی نوا ہوں
ہستی کو مری ہستیِ عالم نہ سمجھنا	ہوں ہست تو، پر ہستیِ عالم سے جدا ہوں
یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا	ہر چند کہ خود عقدہ کُشا ہوں
اے مصحفی شانیں ہیں مری جلوہ گری میں	ہر رنگ میں مَیں مظہرِ آثارِ خدا ہوں

آپ کے کلام میں سادگی کے ساتھ فارسی تراکیب کی جا بجا کھپت خوب مزا دیتی ہے۔ چند فارسی ترکیبیں ذیل میں درج ہیں:۔

آوارگانِ شوق، آسودگانِ خاک، دلِ سودا زدہ، دیدۂ حیرت زدگاں، کشتۂ وفا، کشیدہ تیغ

شعر:- کشیدہ تیغ ہے وہ قاتل اور اُس کے حضور کھڑے ہیں سارے گنہگار دیکھئے کیا ہو؟

برافروختہ رخسار ع "یعنی وہ برافروختہ رخسار غضب ہے"

عربدہ جو، آتشِ خفتہ، روکش، بالشِ پر، خاک بسر، سر بگریباں، ستم نادیدہ، زلفِ مشک فام، روزِ بازپرس، آغشتہ بخوں- شعر

جوں نالہ کہ آغشتہ بخوں سینے سے نکلا پایا نہ میں اس میں بھی بجز لے اثری رنگ

واقفِ راہ وروش، فتنۂ برخاستہ، جاں برلب رسیدہ، دلِ ستم زدہ وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے یہاں مقامی رنگ بھی جھلکتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

کیا اور مصحفی میں کروں وصفِ لکھنؤ روے زمیں پہ اب یہ صفاہاں ہے دوسرا

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں دلّی ہی میں چوری مرا دیوان گیا تھا

روے وطن نہ دیکھا تو نے جو مصحفی پھر شاید کہ چھٹکتے تو اے یار گھر سے نکلا

اس اتنی حیا پہ پھر یہ شوخی بازار میں پان کھاکے چلنا

مصحفی رائے بھورا کے وہ ہیں اب بھی نشاں تھے عمارت کے لئے اُس نے جو جوڑے پتھر

اے مصحفی مت پوچھ کہ دلّی سے نکل کر کیا کہئے کہ ہم کتنے پشیمان ہوئے ہیں

جمنا میں کل نہا کر جب اُس نے بال باندھے ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

سر اُس کے پہ کیا کوئی دستار باندھے جو پھرتا ہو گلیوں میں زنّار باندھے

نہ ساون کرے پھر برسنے کا دعوے جو یہ دیدۂ تر کبھی تار باندھے

ہوا جو مصحفی گھربار تج کے گوشہ نشیں اِسی میں اُس نے نگر اپنی بہتری دیکھی

آپ کے یہاں بعض الفاظ ایسے پائے گئے ہیں جو اگرچہ اب مستعمل نہیں لیکن قابل استعمال ہیں، مثلاً قدغن، افشرہ- شعر:-

جب تک کہ آنسوؤں کا ہمارے ہے افشرہ ان منعموں کے ہم نہیں محتاج آب یخ

مودی، شعر:-

اے مصحفی مودی کو نوں ٹوک تو وہ مجھ سے کہتا ہے کہ ہاتھی بھی سرکار کے بھوکے ہیں

بعض بعض اخلاقی کے اشعار بھی خوب ہیں، مثلاً:-

نوبت سخن کی ہم تک جب آئی ہے ادب نے خاموش کہہ کے سب کو خاموش کر دیا ہے

کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا | بو آتی ہے اس میں فارسی کی
مصحفی دوں میں جہاں ریختہ گوئی کو رواج | قدر شیرازی کی ہو وہاں نہ صفاہانی کی
چشم کم سے نہ نظر مصحفیِ خستہ پہ کر | وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

آپ نے بعض الفاظ غلط باندھے ہیں، مثلاً انتظاری بجائے انتظار، شعر:-

وعدہ کرکے مصحفی کس دن وہ آیا تیرے پاس | تجھکو اُس پیماں گسل کی انتظاری ہے عبث

فق کو فخ باندھا ہے، شعر:-

آتے ہی حبب عیاں ہے اُس نے چمن میں رخ | دیکھ اُس کو ہو گیا ہے ہر اک گل کا رنگ فخ

شتابی بجائے شتاب، شعر:-

ابر سیہ نے مجھکو گھیرا ہے گلستاں میں | ساقی پہنچ شتابی جام شراب لیکر

رنگا میں کاف فارسی کو مشدد استعمال کیا ہے۔ ع

زخموں سے خوں میں رنگّا تصویر کیا نکالی

بعض جگہ آپ نے واو عطف سے اُردو کے دو جملوں کو ملایا ہے یہ بھی طریقہ آجکل متروک ہے

اِس آنے و جانے میں کیا ناز نکلتا ہے | صدقے ترے آنے کے قرباں ترے جانے کے

بعض جگہ معشوق کی شان میں گستاخیاں فرماتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بازاری معشوق ہے۔

کب وقتِ بوسہ آکے وہ دیتا تھا گالیاں | ہم نے ہی منہ لگا کے اُسے بے ادب کیا

بعض اشعار آپ کے یہاں بھی رکیک پائے گئے ہیں، مثلاً

یہ طرفہ اختلاط نکالا ہے تم نے واہ | آتے ہی پاس چٹ سے وہیں مار بیٹھنا
یوں جاتے ہوئے کر گیا پامال جو مجھکو | ہاں تھا تو وہ لڑکا ہی پہ تصویر پری تھا
یوں مجھ پہ شبِ وصل میں سوالات چلاؤ | پر تم کو قسم ہے جو کہیں بات چلاؤ
کہے تھی یہ طفلی میں دیکھ اُس کو دایہ | یہ لڑکا طرحدار پیدا ہوا ہے

آپ کے یہاں متروکات کی فہرست بھی خاصی لمبی چوڑی ہے۔ شاید ابتدائی کلام میں زیادہ ہوں کیونکہ آپ کا ابتدائی زمانہ سوداؔ کے آخر زمانہ میں بسر ہوا ہے یا بقول آزادؔ "آپ کو پرانے الفاظ بامزہ معلوم ہوتے ہونگے اور اُن کو ترک کرنا معیوب سمجھتے ہونگے" مثلاً چند الفاظ لکھتا ہوں:-

ٹک بجائے ذرا۔ اُن نے بجائے اُس نے۔ نت بجائے ہمیشہ۔ میں اور ہم کے بعد "نے" کا حذف، آگو بجائے آگے۔ تئیں بجائے کو۔ یہاں بالکل متروک ہے مگر آپ کے یہاں بہت استعمال ہوا ہے۔ آقے

بجائے آئے۔جستجو کے بیچ بجائے جستجو میں۔کسو بجائے کسی۔ ندان بجائے آخر کار۔زور بجائے بہت۔کبھو بجائے کبھی۔لیک بجائے لیکن۔نہیں رونے کا بجائے نہیں روئیگا۔جوں بجائے مانند۔آپی بجائے آپ ہی۔جوش مار نکلا بجائے جوش مار کر نکلا۔اُس بن بجائے اُس بغیر۔بل بے ترک متروک ہے۔ جھگڑا بھی بالکل متروک ہے پوں بجائے ہوا۔آنکھیں نکالیاں بجائے آنکھیں نکالیں۔ذری بجائے ذرا۔وغیرہ وغیرہ۔

ذل میں آپ کے کلام سے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

خداوندا نہیں مشتاق میں سرو صنوبر کا
بروز حشر میرے سر پہ ہو سایہ پیمبر کا

غرض ہر وقت روتے ہی رہے ہم دل کے ماتم میں
نہ سوکھا ایک دم رومال اپنے دیدۂ تر کا

میں اسی رشک سے مرتا ہوں کہ کل غیر نے ہائے
ہاتھ منگا یم قسم کیوں ترے سر پر رکھا

آج کل سینہ میں دل ہے خود بخود بیتاب سا
کر رہا ہے بیقراری پارۂ سیماب سا

کیا جانے کیا کرے گا یہ دیدار دیکھنا
اک دن میں آئینہ اسے سو بار دیکھتا

ہوں گرچہ بے گنہ پہ مجھے تیرے روبرو
سر کو جھکائے مثل گنہگار بیٹھنا

جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

یادِ ایامِ بیقراریِ دل
وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا

درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط
یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

کہتے ہو ایک آدم کی ہے میرے ہاتھ موت
ہم بھی سمجھتے ہیں یہ سناتے ہو ہم کو کیا

کہتے ہیں جسے اہلِ جہاں شورِ قیامت
سو پیش قدم ہے وہ تری جلوہ گری کا

مارا گیا گلی میں تری مصحفی دریغ
اُس کشتی کے سر سے نہ حکمِ قضا پھرا

تھا اگر روزِ قیامت تو بھی ہم شاداں رہے
وہ جو اک دن اُس کے ملنے کا مقرر ہو گیا

اے مصحفی بتوں میں ہوتی ہے یہ کرامت
دل پھر گیا نہ تیرا آخر خدا سے دیکھا

نامے کے میرے پرزے لا ڈالے میرے آگے
نامے کا میرے قاصد یہ کیا جواب لایا

مرضِ عشق سے گر اب کے سنبھل جاؤنگا
تو میں دو چار برس کو کہیں ٹل جاؤنگا

مت میرے رنگِ زرد کا چرچا کرو کہ یہاں
رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا

میں حسرتیں لئے ازبس جہاں سے جاتا تھا
جنازہ دوش پہ یاروں کے تھا گراں میرا

بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مدام
کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا

عشوہ و ناز و ادا اُس کے یہی کہتے ہیں
لے سکے کون یہاں نام شکیبائی کا

کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہم سے
یہاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا

تلوار کو کھینچ ہنس پڑے وہ
ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

تری گو میں اس بہانہ مجھے دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

قاصد کا منہ تو دیکھو رکھے گا وہاں قدم کو
جس کی گلی میں اب تک پائے صبا نہ گزرا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

کرتا ہے کوئی اتنا تغافل، خدا سے ڈر
مرنے میں میرے کیا بتِ مغرور رہ گیا

افتادگان وادیِ غربت کی سرگذشت
کرتا ہے خود بیاں لبِ خاموشِ نقشِ پا

فغانِ بانگِ جرس تھی نہ ایسی درد آمیز
قفائے قافلہ کوئی تو بیقرار رہا

آنے کی تیری کہہ کے مرا دل تو خوش کیا
قاصد نے گو کہ اپنی طرف سے بنائی بات

گلی کو یار کی سمجھے ہے اپنا وہ کعبہ
یہ مصحفی سے نہ پوچھو کدھر ہے سجدہ درست

اے مصحفی بہار کے دن ہیں یہ بے نصیب
چل تو بھی باغ میں گل و شبنم کی سیر کر

جوں شمع داغِ غم نے جلایا بدن تمام
نکلی نہ دل سے پر ہوسِ سوختن تمام

وہ چاندنی رات اور وہ ملاقات کا عالم
کیا لطف میں گزرا ہے غرض رات کا عالم

پھٹ چکا جب سے گریباں تب سے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی
چھیڑ مت ہم کو بھرے بیٹھے ہیں

وہی دشت اور وہی گریباں چاک
جب تلک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں

تو آئے نہ آئے ولے ہم تو ہر شب
تری راہ تا صبحدم دیکھتے ہیں

فلک گر ہنساتا ہے مجھ پہ کسی کو
میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں

کھانے نہیں دیتے ہیں مجھے خونِ جگر بھی
نالے تو مرے حلق کے دربان ہوئے ہیں

وہ سنتے یا نہ سنتے اُس کو ہم اپنا احوال
پسِ دیوار کھڑے ہو کے سنا جاتے ہیں

کوچے سے نکل کر ترے میں نالہ کروں گا
معلوم ہوا اب مجھے تاثیر نہیں یاں

اے مصحفی وہاں سے ہم خوب رو کر آئے
سوئے چمن گئے تھے کیوں موسمِ خزاں میں

جس بیابانِ خطرناک میں اپنا ہے گزر
مصحفی قافلے اس راہ سے کم نکلے ہیں

میں دعا عرش پہ بھیجوں ہوں بامید قبول
نالہ بنا ہے بے اثر میں ہی دعا کا لے لوں

بچے تھے مرکے جس آزار سے سببِ الفت میں
ہوا ہے پھر وہی آزار دیکھئے کیا ہو؟

اپنا بھی جی سے جانا اب ہو گیا مسلّم ٭ ہم رہ سکیں ہیں کوئی جب تم چلے سفر کو

کمر ہوئی تری یاں تک تو شہرۂ آفاق ٭ کہ سر کے بال ترے دیکھنے کمر کو چلے

کب درد جگر مجھ کو بیتاب نہیں کرتا ٭ کب ہُوک کلیجے سے یکبار نہیں اُٹھتی

کُنج قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر ٭ فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

ہم نذر تیغِ یار کریں اُس کو مصحفی ٭ گریہ کے ہاتھ سے جو بدن میں لہو رہے

اب تو اُس درد دل کی تاب نہیں ٭ مصحفی کچھ دوا کئے ہی بنے

دامن کی اک جھپک نے مدہوش کر دیا ہے ٭ مثلِ چراغ ہم کو خاموش کر دیا ہے

کس طرح کوئی چین سے بیٹھے کہ رات دن ٭ دورِ سپہر در پئے ایذائے خلق ہے

دیکھیو پاؤں رکھ دیا کس نے ٭ آج کیوں نوکِ خار پھر چمکی

حیران ہے کس کا جو سمندر ٭ مدت سے رکا ہوا کھڑا ہے

ہم وہ وارفتہ ہیں یارو جو سمجھتے ہی نہیں ٭ شوق کہتے ہیں کسے اور جستجو کیا چیز ہے

کون اِس باغ سے لے بادِ صبا جاتا ہے ٭ رنگ رخسار سے پھولوں کے اڑا جاتا ہے

میں وہ نہیں ہوں کہ اُس بت سے دل مرا پھر جائے ٭ پھروں جو اُس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے

غمِ دل کا بیان چھوڑ گئے ٭ ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے

نہیں معلوم کہ کیا نام ہے اُسکا لیکن ٭ کوئی اس کوچہ میں اک آہ تو بھر جاتا ہے

ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی ٭ کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

ملنے کو جو تم چاہو تو ہے بات ذرا سی ٭ ایک آن میں ہوتی ہے ملاقات ذرا سی

نہ کہیں صبح ہی ہوتی ہے نہ خواب آتا ہے ٭ رات کیا آتی ہے اک مجھ پہ عذاب آتا ہے

ہائے کعبہ سے پھرا اب تک نہ ہرگز مصحفی ٭ اُس کو وہاں کیا جانے کس بت سے محبت ہو گئی

دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے منتِ دست ٭ پُرزے ہو ہو کے گریبان اُڑا جاتا ہے ۔

یہ شبِ ہجر میں اُٹھ اُٹھ کے قلق کے ملتے ٭ دل کو دیتا ہوں تسلی کہ سحر ہوتی ہے

وعدۂ قتل سے رکھتا ہوں دل اپنے کو میں شاد ٭ کہ اسی وعدہ میں اک وعدۂ دیدار بھی ہے

صبح کی شام ہوئی شام کی پھر رات ہوئی ٭ یہی وعدے ہیں تو کب اس سے ملاقات ہوئی

ہرگز ور اُس کا وا نہ ہوا ہم سے سیکڑوں ٭ سر کو پٹک پٹک پسِ دیوار مر گئے

مجھکو پامال کر گیا ہے ابھی ٭ یہ جو دامن اُٹھائے جاتا ہے

پنڈت مہابیر پرشاد دُویدی

(از حضرت اقبال ورما سحر ہتگامی)

خوشی کی بات ہے کہ ۲۔مئی گذشتہ کو ہندی کے نامور ادیب پنڈت مہابیر پرشاد دُویدی سابق اڈیٹر رسالہ "سرسوتی" الہ آباد کی دیرینہ علمی خدمات کے اعتراف میں اُن کی ستّرھویں سالگرہ الہ آباد اور بنارس میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ ناگری پرچارنی سبھا بنارس نے اپنا سالانہ جلسہ کیا جس میں سبھاندکور کی جانب سے مہاراجہ اورچھا کے ہاتھوں ایک یادگاری کتاب پنڈت جی کے نذر کی گئی جو خصوصاً اسی غرض سے تیار کرائی گئی تھی۔ اور ۴ سے ۷ مئی تک الہ آباد میں بھی دُویدی میلا کے نام سے موسوم ایک ادبی جلسہ کیا گیا جس کی افتتاحی رسم پنڈت مدن موہن صاحب مالوی کے دست مبارک سے ادا ہوئی۔ اِن دونوں تقریبات میں ہندی دنیا کے نامی گرامی اہل قلم نے شرکت فرمائی جس سے پنڈت جی کی موسیع ہر دلعزیزی کا پتہ چلتا تھا۔ ہم اس اعزاز پر پنڈت جی کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

پنڈت مہابیر پرشاد صاحب کا اعزاز صرف اس وجہ سے نہیں ہوا کہ اونھوں نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ ہندی زبان کی خدمت میں صرف کیا بلکہ اُنھوں نے ہندی کو اُس جدید طرز تحریر کے سانچے میں ڈھال دینے کی زبردست کوشش کی جس کو بھارتیندو ہریشچندر نے اونیسویں صدی کے آخری دَور میں ایجاد کیا تھا اور جس کا مقصد ہندی نظم ونثر کو "کھڑی بولی" یعنی اُردو کی روش پر لانا تھا۔ اس کے لئے پنڈت صاحب کو موجودہ صدی کے آغاز ہی سے ہندی کا مشہور ومعروف رسالہ "سرسوتی" ایک اچھا خاصا ذریعہ مل گیا تھا۔ جو ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے تحت میں انڈین پریس سے شائع ہوتا تھا، بابو شیام سندر داس اُس کے اڈیٹر تھے مگر اُنھیں سبھا کے کاموں سے کافی وقت نہ ملتا تھا اس لئے انڈین پریس کے علم دوست مالک بابو چنتامنی گھوش مرحوم نے دُویدی جی کو اس کا اڈیٹر منتخب کیا۔ آپ کی عمر اُس وقت تقریباً چالیس سال تھی، اور وہ

پنڈت مہابیر پرشاد دویدی

شاعر و مضمون نگار کی حیثیت سے کافی مشہور بھی ہو چکے تھے۔ دُویدی جی نے انڈین پریس کی ریڈروں کی ذرا سختی سے تنقید کی تھی مگر گھوش بابو نے ناراض ہونے کے بجائے دُویدی جی سے نئی ریڈریں بھی لکھوائیں اور انھیں "سرسوتی" کی ایڈیٹری کا چارج بھی دیدیا۔ یہ ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔

اس کے قبل دُویدی جی ڈسٹرکٹ ٹرافک سپرنٹنڈنٹ ریلوے جھانسی کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ اور قریبًا پچاس روپیہ ماہوار بھتہ ملتا تھا۔ بائیس سال کی ملازمت تھی۔ اِن دنوں آپ کا افسر آپ سے بجا رعب و داب سے کام لینا چاہتا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے استعفٰی دیدیا اور اس کے بجائے انڈین پریس کی بیس پچیس روپیہ ماہوار کی ملازمت قبول کرلی۔ خوش قسمتی سے آپ کو بیوی بھی قانع اور وفاشعار ملی تھی جس نے قدر و منزلت کی قلیل آمدنی میں بھی مطمئن رہنا اپنا فرض خیال کیا۔ انھیں اوصاف سے متاثر ہو کر دُویدی جی نے اس نیک بخت خاتون کی وفات پر اپنے موضع میں ایک یادگاری مندر تعمیر کرایا جس میں سرسوتی جی اور لکشمی جی کی مورتوں کے درمیان اس نیک خاتون کا بھی مجسمہ موجود ہے۔ مندر کے دروازے پر منوجی کا وہ مشہور اشلوک درج ہے جس کا مفہوم ہے "جہاں عورتوں کی پوجا ہوتی ہے وہاں دیوتاؤں کا باس ہوتا ہے۔"

انڈین پریس سے دُویدی جی کا تعلق ہندی زبان کی ترقی کے لئے فال نیک ثابت ہوا دو ہی سال کے اندر رسالہ "سرسوتی" کی کایا پلٹ ہوگئی، اس وقت یہ اپنے طرز کا واحد رسالہ تھا۔ اُس کے پہلے کے سبھی ہندی رسالے تحریر میں وہی پرانا رنگ ڈھنگ اختیار کیا کرتے تھے جو اَب بالکل متروک ہے۔ "سرسوتی" نے نہ صرف اُن کی رہنمائی کی بلکہ آیندہ کے لئے بھی ایک ایسی زبردست مثال قائم کردی جس کی تقلید ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

ہندی میں اُس وقت تک برج بھاشا کی بعد از وقت شاعری کے علاوہ نثر کا کوئی عمدہ لٹریچر موجود نہ تھا۔ اچھے لکھنے والوں کی تعداد بہت مختصر تھی، ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینا اولوالعزم ادیب کا کام تھا۔ پھر بھی اُنھیں کافی مضامین نہ ملتے تھے اور بعض اوقات اُنھیں رسالہ کا بیشتر حصہ اپنے ہی مضامین سے پُر کرنا پڑتا تھا۔ اسی کے ساتھ اُنھیں مخالفین کے حملے بھی برداشت کرنا پڑتے تھے۔

دُویدی جی ۱۸۶۴ء میں دولت پور ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ گھر پر اپنے چچا سے

سے کچھ سنسکرت پڑھ کر گاؤں کے مدرسہ میں داخل ہوئے اور تیرہ سال کی عمر میں انگریزی پڑھنے کے لئے رائے بریلی بھیجدیے گئے جو اُن کے گانوں سے پندرہ سولہ کوس ہے۔ ان دنوں دویدی جی کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر اتوار کو گھر جا کر خوراک کا سامان خود ہی لیجاتے اور اس طویل مسافت کو پیادہ پا طے کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ پوروہ ضلع اناؤ کے انگریزی اسکول میں بھیجدیے گئے۔ جو قریب تر تھا۔ اور جس کے شکست ہو جانے پر اُنھوں نے فتحپور اور اوناؤ کے اسکولوں میں تعلیم پائی۔ بعد کو اُن کے والد پنڈت رام سہائے دویدی نے جو بمبئی میں مقیم تھے اُنھیں اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں دویدی جی نے انگریزی کے ساتھ ساتھ سنسکرت بھی پڑھی اور مرہٹی و گجراتی زبانوں سے واقفیت حاصل کی جن سے اُنھیں "سرسوتی" کی ایڈیٹری میں بہت بڑی مدد ملی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ ریلوے کی ملازمت میں داخل ہوگئے جہاں بتدریج ترقی کرتے ہوئے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی اسامی پر مقرر ہوئے

ملازمت کے زمانہ میں بھی وہ پڑھنے لکھنے سے باز نہیں رہے بلکہ اسی زمانہ میں انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی اور اپنے ادبی کاموں کا ایک معیار قائم کر لیا۔ سنسکرت پڑھنے کے لئے آپکو بڑے سویرے اُٹھنا پڑتا تھا "سرسوتی" کی ایڈیٹری قبول کرنے سے قبل وہ نثر و نظم دونوں لکھتے تھے اُن کے مضامین میں صفائی، سادگی، روانی اور جدت ہوتی۔ ہماری رائے میں اونھیں ناظم کی بہ نسبت ناثر ہی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، اور اس میں بھی اُن کی شہرت کی بنیاد زیادہ تر تنقید نگاری پر قائم ہوئی۔ اُن کی تنقیدیں پرزور اور کھری ہوتی تھیں، وہ بلا خوف و ہراس لکھتے تھے اور زبان کی اصلاح و ترقی کے خاطر کسی کا لحاظ نہ کرتے تھے۔ سنسکرت اور انگریزی میں بھی وہ اچھی استعداد رکھتے ہیں، چنانچہ کالی داس کے رگھوبنش اور میگھ دوت وغیرہ اور مل کے لبرٹی (آزادی) اور اسپنسر کے ایجوکیشن (تعلیم) و دیگر کتب کا ترجمہ کیا۔ کالی داس پر انھوں نے ایک تنقیدی کتاب بھی لکھی ہے۔

جس محنت و انہماک سے اُنھوں نے "سرسوتی" کی ایڈیٹری کی خدمت اٹھارہ سال تک انجام دی اُس سے اُن کی صحت خراب ہوگئی۔ اور وہ مجبوراً ۱۹۲۲ء میں اس خدمت سے دستکش ہوگئے، مگر اس کے بعد بھی ۱۹۲۹ء تک اس رسالہ میں برابر مضامین لکھتے رہے، حتیٰ کہ اُن کی بگڑتی ہوئی صحت نے اُنھیں بالکل معذور کر دیا۔ اُس وقت سے اُنھوں نے ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق لکھنا پڑھنا تقریباً ترک کر دیا ہے۔ اور اب وہ اپنے مکان واقع دولت پور میں آرام و سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں جس کے وہ اپنی دیرینہ مصروفیتوں کے بعد بہمہ وجوہ مستحق ہیں۔ آپ کو

اب بھی نیند نہ آنے کی شکایت ہے۔ معالجہ کے متعلق آپ لوئی کوہنی کے جدید طریقۂ شفایابی کے بڑے معتقد ہیں۔ اس طریقۂ علاج کے بارہ میں آپ نے "جل چکتسا" (پانی کا علاج) نامی ایک چھوٹی سی کتاب بھی لکھی ہے جس میں لوئی کوہنی کے اصولوں کا مختصر ذکر ہے۔

آپ مہاتما گاندھی کے بھی بڑے بھگت ہیں، مزاج بہت نرم ہو گیا ہے۔ رامائن سے آپ کو بیحد محبت ہے اور اُس کے رموز و نکات سے لطف اندوز ہونا آپ کا ایک دلچسپ شغلہ ہے۔ موجودہ شعرا میں آپ پنڈت ناتھورام شنکر شرما کے بڑے معتقد ہیں جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور جو برج بھاشا اور کھڑی بولی ہر دو اصناف شاعری پر یکساں قادر تھے۔

کفایت شعاری آپ کی طبیعت کا خاصہ ہے جس کے سبب آپ مفلسی میں بھی فارغ البال رہ سکتے ہیں۔ ایک ایک پیسہ کا حساب رکھنا آپ کا معمول ہے، لفافوں اور پیکٹوں کے ساتھ کا غذات تک کو آپ ضائع نہیں ہونے دیتے بلکہ حسب ضرورت اُن پر بھی لکھتے ہیں۔ آپ کے نزدیک کفایت شعاری سے مراد فضول خرچیوں سے بچا کر ضروریات میں صرف کرنا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ سخاوت ہے جس کا آپ کے مزاج میں اچھا خاصا دخل ہے۔ جب آپ کی تنخواہ صرف بیس پچیس روپیہ ماہوار تھی اُس وقت بھی آپ مہینہ میں دو چار روپیہ خیرات کے لئے بچا لیتے تھے۔ آخر آخر میں آپ نے تقریباً سات ہزار روپیہ کی رقم ہندو یونیورسٹی کو اس غرض سے دیدی کہ طلبا کو وظائف دیئے جائیں، یہی آپ کی عمر بھر کی بچی کھچی پونجی تھی۔ آپ نے اپنا پورا کتب خانہ بھی ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی نذر کر دیا ہے جو کتنی ہی اہم کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ ابھی ۲ مئی کے جلسہ میں بھی آپ نے سبھا مذکور کو دو سو روپے اس غرض سے دیدیئے تھے کہ اس کے چپراسیوں اور چاروب کشوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ ۴ مئی کو دویدی میلا الہ آباد کے موقع پر بھی آپ نے اکیسو روپے میلا کمیٹی کو اس غرض سے دیئے کہ زبان پر بہترین مضمون نگار کو بطور انعام دیئے جائیں۔

آپ کا کھانا پینا، رہنا سہنا، بہت سادہ ہے۔ اس پیرانہ سالی میں بھی اپنے کاموں کو خود اپنے ہاتھوں سے کر لینے میں کسر شان نہیں سمجھتے۔ نوکر کمرہ کی صفائی کر جاتا ہے مگر وہ خود اسے دوبارہ صاف کرتے ہیں، ہر بات میں قرینہ نظر آتا ہے، ہر چیز کام لینے کے بعد مقررہ جگہ پر رکھدی جاتی ہے۔ غرض آپ کے مکان کے اندر و باہر ایک ایسی فرحت بخش فضا کا ظہور ہے جس میں داخل ہوتے ہی دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ دویدی جی کی زندگی اب عملاً ایک تارک الدنیا کی زندگی ہے۔ دعا ہے کہ اس میں قرار واقعی وسعت ہو۔

۵۷ء کا غدر

(از جناب خواجہ عبدالرؤف۔ عشرت لکھنوی)

بی مرزائی نے کہا "حکیم آغا مرزا میرے باپ کا نام تھا، اُن کا مطب خوب چلتا تھا، میرے شوہر جھوٹے منشی کمشنر صاحب کے منشی کے نائب تھے، اور میرے بھائی آغا حسن کی شادی ہو چکی تھی، بھاوج گھر میں رہتی تھی، ہم پانچ آدمی اور ایک ماما ایک نوکر اسی گھر میں رہتے۔ ہمارا مکان سبحان نگر منشی سالک رام مالک مطبع شگوفۂ گلزار کی دیوار بدیوار تھا۔ منشی صاحب نہایت نیک مزاج تھے، ہمارے گھر میں اُن کی بی بی کی آمد و رفت تھی اور علاج بھی حکیم صاحب کا ہوتا تھا۔ بھگدر کا حال مجھے اچھی طرح یاد ہے، میرا سن اُس وقت اٹھارہ برس کا تھا دفعتہ شہر پر گولہ باری ہونے لگی لوگ مال واسباب چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ سب سے پہلے منشی سالک رام نے حکیم صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ خاندان سمیت پیشتر سے ہمارے ساتھ راتے بریلی کی طرف نکل چلئے ورنہ پھر موقع نہ ملے گا۔ حکیم صاحب نے اُن کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور کہا سردست میرا گھر سے نکلنا تو محال ہے ضرورت پر دیکھا جائے گا۔ دوسرے دن کیا دیکھتے ہیں کہ بوڑھے۔ جوان، بچے سب شہر بھر کے تباہی کے جھانتے میں سوا ہیں، جو عفت مآب وثیقہ دار بیگمیں تھیں زمین پر آنسو بہا کر آسمان سے فریاد کر رہی تھیں۔ جو غیرت دار بی بیاں مارے شرم کے سورج سے آنکھیں چار نہ کرتی تھیں وہ اب چادر اوڑھے گرتی پڑتی پیادہ پا جا رہی تھیں لوگ اس بدحواسی میں بھاگے کہ بہت سی لڑکیاں بہت سے لڑکے راہ میں گم ہو گئے۔ سب کو اپنی اپنی جان کے لالے تھے، شہزادیاں جو چھپر کھٹ سے پاؤں باہر نہ رکھتی تھیں وہ اس مجبوری اور بیکسی کو دیکھکر کنوئیں میں ڈوب کر مر گئیں کہ ہماری آبرو رہ جائے۔ ایک قیامت برپا تھی۔ رجب کا مہینہ تھا لیکن محرم کا عاشورہ معلوم ہوتا تھا۔ گھر گھر ماتم تھا، ایک ٹڈی دل تھا کہ منہ اُٹھائے بھاگا جاتا تھا۔ پھر قدم قدم پر جان کا ڈر، آبرو کا خوف، بچوں کے چھٹ جانے کا صدمہ، دولت برباد ہونے کا رنج، راستہ کی مصیبت، راتوں رات خلقت خدا بھاگ رہی تھی۔ کرن پھوٹتے پھوٹتے سب ناکہ سے باہر نکل گئے۔ گورے، سکھ، پوربئے رعیت کا مال اسباب لیکر جان سے مار ڈالتے تھے۔ اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا، چاروں

طرف سے گولوں کا مینہ برس رہا تھا۔

اس وقت ہمارے باپ آغا مرزا کی عمر نوے برس کی تھی، بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا تھے۔ چلنے پھرنے کی طاقت نہ تھی، اسی سبب سے جی چراتے تھے۔ جب سارا شہر خالی ہوگیا اور جن کی جان فالتو تھی وہی شہر میں رہ گئے تو حکیم صاحب نے بھائی آغا حسن سے رائے لی، انھوں نے کہا اس تلاطم میں جانا کیسا کہیں امن نہیں ہے۔ گھر سے قدم نکالا اور مار ڈالے گئے، آپ میں تو قدم اٹھانے کی بھی طاقت نہیں اگر کہیں کوئی عورت کھو گئی تو زندگی بھر قلق رہیگا، اگر موت آئی ہے تو دم اپنے گھر میں کیوں نہ نکلے؛ جو کچھ ہونا ہو یہیں ہو جائے، ہماری رائے کہیں جانے کی نہیں ہے، آپ کو اپنے فعل کا اختیار ہے۔

حکیم صاحب نے کہا بیٹا ہم تو آفتاب لب بام ہیں، نہ جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم۔ دو قدم چلنا دشوار ہے تمہاری جان کی حفاظت کے لئے کہا تھا جب تم کو منظور نہیں تو ہم تم کو چھوڑ کر کہاں جا سکتے ہیں جب لڑکے کا جواب سن چکے تو داماد کو بلاکر کہا، سارا لکھنؤ کیا امیر کیا غریب سب سر بصحرا جان بچاکر نکل بھاگے ہم تو آغا حسن کی سمجھ سے مجبور ہیں اس کے سبب سے کہیں نہیں جاسکے مگر تمہارا کیا ارادہ ہے؟ یہ تو نہایت عقلمند آدمی تھے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "ہم آپ کے قدم چھوڑ کر کہاں جائیں گے، جس طرح آپ بھائی کے سبب سے نہیں جاسکے ہم آپ کے قدم چھوڑ کر کہاں جائیں گے۔"

جب یہ بات طے ہو گئی تو محلے میں جو ایسی عورتیں تھیں جن کے یہاں کوئی مرد نہ تھا اُن میں کچھ ہماری عزیز کچھ ہمسائیاں تھیں سب اکیس عورتیں اور چار پانچ مرد تھے، مکان کے دروازے بند کرکے سب ایک جگہ بیٹھ رہے، شام کو چراغ تک فوج کے ڈر کے مارے نہیں جلایا۔ در و بام پر گولے برس رہے تھے، پختہ پختہ مکان جل رہے تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہنومان جی نے لنکا پھونکی ہے، گاہ زمین تھرّاتی تھی، اطفال اپنی ماؤں سے چمٹے ہوئے تھے، حکیم صاحب یہ حال دیکھکر کونے میں جا نماز بچھائے سجدے میں پڑے تھے سجدہ گاہ اور پیشانی اشکوں سے تر تھی، ہر وقت الامان الحفیظ ورد زباں تھا، خدا خدا کرکے وہ اندھیری رات حفاظت سے کٹی، صبح ہوئی گورے سارے شہر کا مال اسباب لوٹنے لگے، گھروں میں گھسنے لگے، گھر میں جو زندہ آدمی ملا اُسے گولی ماردی، شہر کے مکان فیصدی نناوے تو خالی پڑے تھے اسباب بھرا پڑا تھا جو بیچارے لنگڑے لولے اندھے بیمار بڈھے مجبوری سے نہ بھاگ سکے اُن میں بھی اکثر قتل ہوگئے، اتفاق سے کوئی کوئی بچ گیا، گھوڑے، ٹٹو، اونٹ، ہاتھی، گائے بھینس اور چوپائے بندوق کا نشانہ بنائے گئے، سونا چاندی، جواہر، موتی، زیور سب لوٹ لیا۔

اتفاق سے جس گھر میں ہم لوگ اجل کے امیدوار پڑے ہوئے تھے اس میں فوجی گورے آئے دروازہ

کی زنجیر ہلا کر کہا، دروازہ کھولو۔ آواز سن کر سب بی بیاں تھر تھر کانپنے لگیں مرد بھی لرز گئے، عورتوں نے اپنے منہ پر خاک ملکے دعا کی کہ اے پروردگار بے نیاز تو ہی نے ہم کو دامان عصمت دیا، جامۂ عفت بنایا، آنکھ کو حیا کے پردے عنایت کئے، زیور شرم سے آراستہ کیا، موتی کو چمک عطا کی ہم کو آبرو دی، آج تک غیر مرد کی نظر سے اس طرح بچائے رکھا جس طرح عقل و ہوش نہاں ہیں یا جیسے الفاظ میں معانی پوشیدہ ہیں، بی بی فاطمہ زہرا کے دامن کا صدقہ، ہماری پردہ دری نہ کیجیو اتبو ہر آن آبرو کا غم ہے، آفت میں مبتلا ہیں تو ہی نگہبان ہے۔"

آخر جب گورے نہ ٹلے تو چھوٹے مرزا نے حکیم صاحب سے کہا: "اب جواب نہ دینا اور دروازہ بند کئے بیٹھے رہنا مصلحت کے خلاف ہے۔ فوج ہم کو باغی سمجھ کر گھر میں زبردستی گھس آئے گی اور ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑے گی"۔ فوراً دروازہ کھولا گیا تو گورے گھس آئے اور جس کونے میں ہم سب عورتیں ایک سے ایک ملی ہوئی چادر سے منہ چھپائے بیٹھی تھیں اسی طرف بھری بندوق جھکائی۔ حکیم صاحب سینہ سپر ہو کر سامنے آکھڑے ہوئے اور کہا ان سب عورتوں کے بدلے مجھے گولی مار دو۔ ان بیکس بی بیوں نے کیا قصور کیا ہے جن کی جان کے دشمن ہو، ہم لوگ نہ سپاہی ہیں نہ تیغ زن، باغی نہیں رعیت ہیں، کسی دشمن کے شریک نہیں، لڑائی کا نام تک نہیں سنا۔

چھوٹے مرزا نے بھی سمجھایا، ہم لوگ سرکار کے نمک خوار اور خیر خواہ ہیں، میں چیف کمشنر کی کچہری کے میر منشی کا نائب ہوں، لڑائی کے دن تک میں نے کام کیا ہے۔ دفتر میں میرا نام لکھا ہے۔ اس آفت میں بھی کانپور تک سرکاری پیام لیکر گیا، صاحب کی چھٹی اور سارٹیفکٹ موجود ہے ان میں سے ایک کچھ پڑھا لکھا تھا کاغذ دیکھ کر جان کی امان دی، مگر بعض لالچیوں نے ٹھہر کر سب مال لوٹ لیا، اور جب ظاہری اسباب لے چکے تو بچوں کو عورتوں کی گودیوں سے چھین لیا اور کہا صاف صاف بتا دو تم نے روپیہ کہاں چھپایا ہے نہیں تو ان سب بچوں کو قتل کر کے تمھیں مار ڈالینگے" اور تلواریں ان کے گلے پر رکھ دیں، بچے دہل گئے، زار قطار رونے لگے جب ایسی سختی دیکھی تو عورتوں نے کہا مال جان کا صدقہ ہے، جہاں جہاں مال زیور گاڑا تھا بتا دیا، جب سارا زیور اور مال لے چکے تو حکیم صاحب کے داماد اور بیٹے کو قید کر لیا۔ سب عورتوں نے بہت شور مچایا حکیم صاحب بیچارے قدموں پر گر پڑے مگر ان ظالموں کو رحم نہ آیا ان کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلے، ہر چند حکیم صاحب نے کہا ان کے عوض مجھے گرفتار کر لو۔ کچھ سماعت نہ کی، بیچارے حکیم صاحب روتے کے روتے رہ گئے سفید ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، گریبان چاک کر لیا، منہ پہ خاک ڈال لی، کبھی لڑکے کو یاد

کر کے روتے کبھی داماد کے فراق میں گریہ وبکا کرتے۔ کبھی ناموس وغرت کا خوف تھا، مختصر یہ کہ ایک جان پر اس ضعیفی میں ہزاروں غم تھے، سب اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا تھے، اتنا بھی ہوش نہ تھا کہ گوروں کے جانے کے بعد دروازہ بند کر لیتے۔

اس کے بعد دوسرے گورے، پوربیے، سکھ، شہر کے بدمعاش لٹیرے گھر میں دَرانہ گھس آتے اور جو کچھ ملتا لے جاتے، کسی کے پاس پانی پینے کا کٹورا نہ رہا، بدن پر جو کپڑے تھے اس کے سوا خدا کا نام تھا۔ آخر خدا خدا کر کے شام ہوئی، گھر میں اندھیرا ہو گیا مگر ہم غمزدوں کو نیند کہاں، کسی طرح رات کاٹے نہ کٹتی تھی، سب دعا مانگا کئے الٰہی آبرو کا تو محافظ ہے۔

صبح ہوئی تو پھر اسی طرح گلی میں فوج آئی، شاندار مکان دیکھکر کہا دروازہ کھولو، حکیم صاحب نے دروازہ کھولدیا، وہ سب اندر گھس آئے، دیکھا تو ہندوستانی فوج ہے، حکیم صاحب نے ان لٹیروں سے کہا "تم لوگ بیکار دل دُکھاتے ہو، ہندو مسلمان سب سے ہمارا ایک سوال ہے دو دن سے برابر ہر وقت ہمارا مال لوٹا جاتا ہے، آخر ان میں کوئی خدا ترس بھی ہے، مصیبت زدوں کو ستانے سے کیا فائدہ، ہر بار سب اسی گھر میں آتے ہیں، خدا کے غضب سے ڈرو، مظلوم کی آہ خدا کا قہر ہوتی ہے، بے گناہوں کی فریاد سے ڈرنا چاہیئے، تلنگوں نے ایسے ایسے ظلم کئے کہ خدا کا قہر ان پر لوٹ آتا، پہلے اُنھوں نے لوٹا اب تم نے گھر صاف کر دیا۔ غضب ہے کہ تم نے وضو کرنے کا برتن بھی نہ چھوڑا، مگر ایک آبرو کا موتی باقی رہ گیا ہے، خدا اس کا محافظ ہے، ہم کو مال تلف ہونے کا افسوس نہیں ہے مگر ہمارے داماد اور بیٹے کو فوجی گورے پکڑلے گئے ہیں، اس صدمے سے جگر میں دو داغ پڑ گئے ہیں، جب ہمارے ایسے ایسے لائق جگر گوشہ گرفتار بلا ہو گئے تو ہم کو زر و مال کا تم سے چھپانا کیا، اب گھر میں ایک جھنجھی باقی نہیں رہی، جہاں چاہے دیکھ لو۔ مگر ایک آرزو ہے کہ خدا عورتوں کی آبرو بچالے، اسی واسطے ہم اس گوشے میں پڑے ہوئے ہیں، آخر تمہاری بھی ماں بہنیں ہیں کہ نہیں، ہم تو اسی غم میں مرے جاتے ہیں، اور کچھ بس نہیں چلتا کہ ہزاروں نامحرم گھر میں دَرانہ چلے آتے ہیں، عورتوں کی بے پردگی ہوتی ہے، تم سارے گھر کی تلاشی لے لو مگر عورتوں کی طرف سے منہ پھیر کر آیا کرو۔"

یہ حال سنکر سنگدل سپاہیوں کو رحم آگیا، کہا "بڈھے تم اس قدر مضطرب نہ ہو، ہم کو لوٹنا ہے تو شہر میں بہت سے گھر بھرے پڑے ہیں، ہم تمہاری بے حرمتی نہیں چاہتے، تمہاری بیکسی اور مجبوری پر افسوس معلوم ہوتا ہے، مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ گورا فوج نہایت بدمعاش جفا پیشہ ہے جو دس اچھے

ہیں تو سو برے، اس گھر میں تو آبرو کا بچنا محال ہے، نہ تم ان سے چھپ سکتے ہو نہ بھاگ سکتے ہو ہاں ایک تدبیر ہے اگر تم اسے پسند کرو، تم سب کے سب ہماری چھاؤنی میں چلے چلو، تمہارے رہنے کو ایک پال کھڑی کر دیں گے، وہاں تم سے کوئی آنکھ نہیں ملا سکتا۔"

حکیم صاحب نے جب یہ باتیں سُنیں تو دل میں متردد ہوئے، کیا کروں کیا نہ کروں، یہاں رہتا ہوں تو عورتوں کی عزت کا اندیشہ، فوج میں جاتا ہوں تو خدا جانے کیا معاملہ پیش آئے، ایسا نہو یہ فوجی سپاہی دغا کریں تو اُس وقت سب بیوقوف بنائیں گے، حکیم صاحب کے بشرے سے تشویش کے حالات معلوم کر کے فوجی کہنے لگے "آپ اُمید و بیم کو اُٹھا دیجئے، ہم کچھ زبردستی نہیں کرتے آپ کی خوشی ہو چلیئے خوشی نہ ہو نہ جائیے، یہ بات تو آپ کے فائدے کے لئے کہی گئی۔"

حکیم صاحب نے تسبیح اُٹھا کر استخارہ فرمایا، درست آیا، پھر واجب کیا واجب آیا۔ اس وقت حکیم صاحب نے بلند آواز سے کہا "بی بیو، تم کو اپنی عزت بچانا ہے تو چلو ظاہر میں تو سب غمخوار معلوم ہوتے ہیں اور استخارہ بھی واجب آتا ہے، اب جیسی تمہاری رائے ہو۔"

یہ بات سنتے ہی سب عورتیں، برقع اوڑھ نقاب سے منہ چھپا چادریں اوڑھکر ساتھ ہو لیں۔ آگے آگے بڑھے حکیم صاحب جریب ٹیکتے ہوئے، پیچھے پیچھے سب مصیبت زدہ عورتیں، فوجی لوگ کچھ ان سے دور پیچھے پیچھے عورتیں کچھ عجب طرح قدم اُٹھاتی تھیں کہ اُن کی چال سے بدحواسی ٹپکتی تھی، گھر سے کبھی باہر قدم نکالا نہ تھا، راستہ سے واقف نہ تھیں، ان کا گھر سے نکلنا حشر سے کم نہ تھا، حکیم صاحب کا تو آنسوؤں سے رومال بھیگ گیا تھا، بیچارے لکڑی کے سہارے سے چلتے تھے، دل میں خدا سے حفظِ آبرو کی دعا مانگ رہے تھے۔

اتنے میں دیکھا کچھ انگریز عربی گھوڑوں پر سوار چلے آتے ہیں، ان کے آگے پیچھے بہت سے سوار تھے، بیچ میں لاٹ صاحب، جب اِن مصیبت زدہ عورتوں کو قیدیوں کی طرح مایوس جاتے ہوئے، اور بڈھے حکیم صاحب کو رزہ براندام آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے، پسینہ میں تربتر آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے دیکھا، تو ایک سوار نے آواز دی، تم کون لوگ ہو، کہاں جاتے ہو، ہندوستانی فوجی آدمی جو ہم کو لیئے جاتے تھے ان میں سے دو ایک اچھی انگریزی جانتے تھے، اُنھوں نے آگے بڑھکر ہماری مصیبت کی کیفیت مختصر بیان کی، لاٹ صاحب نے فوراً باگ روک لی اور حکیم صاحب کی طرف کچھ مہربانی سے دیکھنے لگے۔ حکیم صاحب نے فوراً جھک کر صاحب کو فرشی سلام کیا، صاحب نے قریب بلا کر پوچھا، تم کون ہو اور یہ عورتیں کس کی ہیں۔ حکیم صاحب نے بوضاحت بیان کیا،

حضور یہ سب مصیبت کی ماری کی مریض ہیں، میں نحیف الجثہ ان کی دوا ہوں، شہر کا نامی حکیم ہوں جیسے آپ لوگ ڈاکٹر کہتے ہیں، میرے خاندان میں سب لوگ عالم فاضل ہوئے، شرافت اور نجابت میں ہمارا گھر مشہور ہے، ایک بیٹا اور ایک داماد تھا دونوں کو بے قصور گورے قید کرلے گئے، اب میں اکیلا اس گروہ کا پیشوا رہ گیا، یہ سب لڑکیاں میری بہو بیٹیاں ہیں، دو روز میں گھڑی گھڑی میرا گھر لوٹا گیا ایک تنکا تک نہیں بچا، جب سے آج تک کھانے پینے کا ہوش نہیں ہے۔"

لاٹ صاحب کو یہ حال سُنکر بہت رحم آیا اور ایک سوار کو اشارہ کیا ڈاکٹر خانے سے چند ڈولیاں بھی لے آؤ اور آپ وہیں ٹھہرے رہیے، بات کی بات میں ڈولیاں آگئیں، ہم سب اور حکیم صاحب ڈولیوں میں سوار ہو کر چھاؤنی سے کچھ آگے لاٹ صاحب کی کوٹھی کے سامنے ایک نفیس خیمہ میں اُتارے گئے، بازار سے جنس بھی مفت ملتی رہی، بہت آرام تھا پندرہ روز تک وہاں قیام رہا۔

اب یہ حال سنو میرا بھائی اور شوہر دونوں قید فرنگ میں الگ الگ وہاں بہت تکلیف تھی، بھائی تو شدائد قید نہ اُٹھا سکا، بیچارہ جیل میں مرلیا شوہر کچھ دنوں کے بعد رہا ہو کر مکان پر آئے تو مکان کو خالی پایا، بہت جستجو کے بعد معلوم ہوا کہ ہم لوگ چھاؤنی میں رہتے ہیں، فوراً لشکر میں پہونچکر خیمہ میں آئے سب کو زندہ دیکھکر خوش ہوئے، جب شہر میں امن ہوگیا تو سب کو گھر میں لائے۔ حکیم صاحب بھائی جان کے لئے بہت بیقرار تھے، آخر میرے شوہر چھوٹے مرزا اُن کی تلاش میں نکلے، پہلے جا بجا جیل خانوں میں حوالات میں دیکھا پھر فوجی جیل خانہ میں گئے۔ جیلر سے ملکر آغا حسن کا حال دریافت کیا، اُنھوں نے کہا آغا حسن جس دن سے یہاں آئے تھے بیمار ہوگئے، آخر ڈاکٹر کے زیر علاج جیل کے اسپتال میں بھیجدیئے گئے، بہت توجہ سے علاج کیا گیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، دس دن کا عرصہ ہوا کہ انتقال کیا، فوجی مسلمانوں نے ان کو تکیہ میں دفن کر دیا۔"

اِن دنوں شہر میں بڑی لوٹ تھی۔ مقتولوں کا حال نہ پوچھو، تمام راستے خون سے لال پڑے تھے، روزانہ دس دس بیس بیس عیش باغ کی کوٹھی کے پاس سولی دیئے جاتے تھے، ہر ایک کو اپنی جان کا خوف تھا، عیش باغ کی کوٹھی جو نواب آصف الدولہ کی بنوائی ہوئی تھی اُسے لوگ خونی کوٹھی کہنے لگے، کیونکہ خونی کچہری اسی میں تھی، لوگ چاروں طرف پریشان پھرتے تھے کہیں پناہ نہ ملتی تھی، جس گاؤں میں جاتے گاؤں والے لوٹ لیتے، کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا نہیں ملتا تھا، کھانے کو ایک دانہ نہ تھا جب سے یہ لکھنؤ جل چکا، گھر لُٹ چکا، مال اسباب لٹ چکا، جانیں تلف ہوچکیں، مکانوں کے مکین زمین کا پیوند ہوگئے، اکثر لوگوں نے لکھنؤ میں رہنا ترک کیا عبدالصمد سینگ سے نانپارے چلے گئے پھر انھیں لکھنؤ

دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا، بہت لوگوں نے فقیری اختیار کرلی، ہزاروں کربلائے معلیٰ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے، بہت ایسے تھے کہ گھر میں جان دیدی قدم باہر نہیں نکالا، بہتوں نے فاقہ سے تنگ آکر زہر کھالیا جن امیروں کے گھر لٹنے سے بچے تھے اُن کی دولت سرکار نے ضبط کرلی۔

مگر واہ رے لکھنؤ لاکھ لٹا، ہزار مٹا لوگوں کی خوش وضعی اُسی آن بان سے رہی، خوش لباسی کا تو اس شہر پر خاتمہ ہے۔ مال بھی ضبط ہوا گھر بھی ضبط ہوا۔ لیکن وہی چہل پہل وہی کروفر اب تک باقی ہے۔

جنبشِ گل

بہار آئی چمن و گلستاں، رشکِ فردوس بن گئے۔ آفتاب بلند ہوکر درختوں کو زرکار بنانے لگا۔ سبزہ شبنم سے لہک اُٹھا چشموں کی روانی میں تیزی پیدا ہو چلی۔ بوئے گل نے مشامِ جاں کو پیغام محبت دیا۔ بلبل آئی، پیارے گل، پیارے گل چلانے لگی۔ جب عروس چمن گل نے آواز محبت سنی تو شرما کر آنکھیں بند کرلیں۔ بلبل شاخ گل پر آبیٹھی اور چہک چہک کر اپنے شیریں نغمے سنانے لگی۔ نسیم سحر کا خوشگوار جھونکا آیا، دوشیزۂ بہار کو ایک جنبش خفی ہوئی اور ایک ادائے جانستاں کے ساتھ مسکرا دی۔ بلبل جوش محبت میں اپنا منہ گل کے منہ سے ملنے لگی، کبھی چہکتی اور کبھی سبک پروازی کے ساتھ گل کے چاروں طرف چکر لگاتی اور پھر ڈال پر بیٹھکر نہایت پیارا، نہایت سرور آمیز اور نہایت بلند آہنگ گیت گاتی تھی۔ جیسا جیسا دن ڈھل رہا تھا اُس کے دل کے ساز پر حزن و ملال کی چوٹیں پڑتی تھیں اور اُسکی پردرد آواز دھیمی ہوتی جاتی تھی، دن گزر گیا آفتاب ڈوب رہا ہے مگر وہ اپنا راگ گائے جاتی ہے۔ انتہائی محویت کے ساتھ، محبت و وارفتگی سے مست ہوکر تمام رنج و آلام کو بھول جانے کے لئے ۔۔۔۔ آہ بلبل تجھے کیا ہوگیا ہے کوئی نہیں جانتا ۔۔۔۔۔۔ اُس نے اپنی چونچ گل پر رکھ دی نیم بسمل کی طرح ۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ افسردہ گیت اب صرف آہ آہ کی نامعلوم آواز بنکر اس کے دل کو چیرتا ہوا لبوں سے نکل رہا ہے ۔۔۔۔۔۔۔

بہار کا آخری مگر عطر بیز جھونکا آیا، گل کو دوبارہ جنبش ہوئی اور اس کی ارغوانی پنکھڑیاں جو رنج و غم سے مرجھا گئی تھیں ایک ایک کرکے زمین پر بکھر گئیں ۔۔۔۔ بلبل بیتاب ہوگئی، ہائے گل ہائے گل چلانے لگی

گل فنا ہوگیا مگر اس کی یاد باقی تھی

(راز قاسمی حیدرآبادی)

مجلہ مکتبہ

پستول کا نشانہ

(قصہ)

(از جناب جگیشور ناتھ ورما بیتاب، بی۔ اے۔)

(۱)

سردی سی سردی تھی، انگلیاں موٹے موٹے اونی کوٹوں کی گہری گہری جیبوں میں بھی شل ہوئی جاتی تھیں، ساری کائنات کہرے کی غلیظ چادر میں منہ لپیٹے خاموش پڑی تھی، برقی قمقموں پر برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ کوئی چھ بجے ہونگے لیکن ابھی تک بازار، ہاٹ، گلی، کوچے سب اسی طرح ویران تھے۔ ایسی سرد بازاری تو کبھی نظر نہ آئی تھی۔

"کارنیلس بینس" یکایک کسی نے پکارا۔

"اوہ۔۔ اسپنک" دبی ہوئی آواز فضائے بسیط کی برف باریوں میں گھٹ کر رہ گئی۔ دونوں لق ودق سڑک پر دُور تک پھیلی ہوئی بے پایاں خاموشی کو ٹھکراتے ہوئے تیزی سے چلنے لگے۔ سڑک کے موڑ پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ شوفر اگلی سیٹ پر پڑا پڑا اونگھ رہا تھا، اُس کی پنج سے زیادہ سرد انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ نکبت وافلاس کے سخت پنجہ میں پھنسی ہوئی بیوہ کی طرح آہیں بھر رہی تھی۔ دونوں ٹیکسی میں گھس گئے۔ اسپنک نے شوفر کو شانہ سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "ہیمرسمتھ برا ڈوے، جلدی۔۔۔ بہت جلدی۔۔۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟ اسپنک!" بینس نے دریافت کیا۔

"آٹھ بجنے سے قبل ہمارا پہنچنا ناممکن ہے۔" اسپنک نے گھڑی دیکھتے ہوئے جواب دیا

"یہ خوب ہوا کہ مطلع صاف ہو رہا ہے۔" مشرقِ بعید کی طرف نظر ڈالتے ہوئے بینس نے کہا۔

"متواتر کئی راتوں کو تو وہ وائٹ ہارٹ میں دیکھا گیا ہے۔" سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے اسپنک کہتا گیا۔ "ہاں، وہیں کیس ہوگا۔ کم از کم اس کا قرب وجوار میں موجود ہونا تو عین یقینی نہیں ہوسکتا۔"

"تب تو ہم یقیناً سرخرو ہو کر لوٹیں گے .... اونہہ، دیکھا جائیگا، ابھی سے اس الجھن میں پڑ کر کیا ہوگا؟"

"الجھن؟ وہ کیسے!" اسپنک متعجب ہو کر بینس کی طرف گھورنے لگا۔

"کیا مطلب؟ کیا یہ ممکن ہے کہ لوگ اُسے جانتے ہی نہ ہوں؟" سر کھجاتے ہوئے بینس نے کہا

"وہ بڑا چلتا پرزہ ہے بینس!"

"خیر ہوگا"

بات یہ تھی کہ تقریباً دس سال پیشتر چارلس پارکر عرف کروکیٹ نے مالی مشکلات کا شکار ہو کر اپنے لاولد معمر چچا سے امداد طلب کی۔ لیکن زر زمین کے پرانے قضیہ قصہ میں بات اس قدر بڑھ گئی کہ اُس نے مغلوب الغضب ہو کر زہریلی چھری ضیف و خسیس چچا کے سینہ میں پیوست کر دی، اور اس کے دم توڑنے سے پہلے ہی کسی طرح جان لیکر فرار ہوگیا۔ اس واردات کے بعد پولیس برسوں اس کے پیچھے پڑی رہی مگر پارکر کی گرد کو بھی نہ پا سکی۔

حسن اتفاق سے اسکاٹ لینڈ یارڈ کو سراغ ملا کہ مطلوب پارکر لندن ہی میں ہے، اور حلقۂ احباب میں اپنے فرضی نام (کروکیٹ) سے مشہور ہے چنانچہ دو سراغرساں بینس اور اسپنک اس معاملہ کی مزید تفتیش پر مامور ہوئے۔

اُنھوں نے مشتبہ شخص کی باقاعدہ نگرانی شروع کی، لیکن جس وقت وہ بڑے غور و فکر کے ساتھ مفرور کے حلیہ سے اس کا موازنہ کرنے اور ثبوت بہم پہونچانے میں منہمک تھے کروکیٹ بھی اس طرف سے غافل نہ تھا، وہ پولیس کی کڑی نظر دیکھکر پہلے ہی کھٹک گیا تھا، اور خطرہ کا احساس کر کے بہت چوکنا رہنے لگا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اُنھوں نے استغاثہ کے گواہان وغیرہ ٹھیک کئے کروکیٹ گلاس ہاؤس اسٹریٹ سے یکایک غائب ہوگیا۔ لیکن اس کی بدقسمتی سے پھر مخبری ہوگئی بینس نے اس کے مکان کی تلاشی لی۔

"دیکھا بینس! کروکیٹ کتنا شاطر ہے؟" اسپنک نے دانت پیستے ہوئے کہا: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ بچوں کی طرح کھیل رہا ہے ......" بینس کو اس آخری جملے پر ہنسی آگئی، کمرہ کا جائزہ لیتے ہوئے اسپنک نے پھر کہا: "بینس! کروکیٹ کل رات اسی خواب گاہ میں شب باش ہوا ہے۔" بینس نے معنی خیز نگاہوں سے اُدھر دیکھا پھر اسپنک کا ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"ناممکن ...... اسپنک یہ حریف کی ایک چال ہے اور بالکل معمولی ..." ایک لمبی سانس

لیکن اسپنک نے اپنی آنکھیں خلا کی طرف پھیریں :۔" کروکیٹ کی عدم موجودگی صرف عارضی ہے ...... کم از کم اس کا اسباب دیکھکر تو یہی شبہ ہوتا ہے ۔"

"تم غلطی کر رہے ہو اسپنک ! اس کا مقصد ہمیں یہیں اُلجھائے رکھکر قانون کے آہنی شکنجے سے نکل بھاگنا ہے۔"

اسپنک نے ایک ایسی نظر سے جو اس کے ہم پیشہ کی پختہ کاری کی معترف تھی، ہینس کی طرف دیکھا وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ گاڑی ہیمراسمتھ پہنچ گئی اور دونوں بعجلت باہر نکل آئے۔

(۲)

سڑک کو پار کرنے میں انھیں بمشکل بیس منٹ لگے ہونگے ۔ اب وہ ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں سے پل صاف نظر آرہا تھا ۔ سامنے دریا تھا اُس کے بائیں جانب لوگوں کا اجتماع تھا اور اُس کے پیچھے کُہرے اور دھوئیں کے سیاہ بادل اُڑ رہے تھے ۔

"کیا ماجرا ہے اسپنک ؟ دریا کے کنارے اتنی بھیڑ کیوں ہو رہی ہے ؟"

"یہی کوئی سپیرا، شعبدہ باز مداری یا بازیگر ہوگا ۔"

"سبحان اللہ! ——" ہینس اپنے رفیق کی سادہ لوحی پر بیساختہ ہنس پڑا

"اگر ہم ادھر ہی سے نکل چلیں تو ؟" اسپنک نے قدرے خفیف ہو کر کہا ۔

"کچھ مضائقہ نہیں، ہم ادھر ہی چلیں گے ۔"

دو گرانڈیل ملاح پانی میں بہتی ہوئی نعش کو کنارے پر لاکر نکال لینے کی کوشش کر رہے تھے ، بہت سے لوگ اکٹھے ہو کر یہی تماشا دیکھ رہے تھے ۔ اسپنک نے بھیڑ چیرتے ہوئے اپنے اور اپنے ہمراہی کے لئے راستہ بنا لیا ۔ اور دونوں خدا خدا کر کے کنارے پر جا پہونچے ہینس نے پہلی ہی نظر میں شناخت کر کے کہا :۔"آئیں ! کروکیٹ ؟

"اور خودکشی ..... یہی تو ..... خدا کی قسم ہینس ! ....." کہتے کہتے اسپنک نعش پر جھک گیا ۔

اسٹینڈ کا سپاہی جو پہلے ہی جائے وقوع پر پہنچ چکا تھا شکن آلود پیشانی اونچی کر کے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا :۔

"آپ کیوں مزاحم ہوتے ہیں ؟"

ہینس نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے ایک کارڈ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا ، کارڈ پر تحریر تھا :۔

"کپتان کارنیکس ہینس ، اسکاٹ لینڈ یارڈ ۔"

منفعل و محجوب کانسٹبل باادب معذرت خواہی کرتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ بھیڑ ہٹ جانے کے بعد نعش کی جامہ تلاشی لی گئی، کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک گھڑی، کچھ سکّے، ایک خط اور ایک چیک برآمد ہوا خط غیر ملفوف تھا اور اس پر ۲۴ جنوری کی مہر ثبت تھی۔ چیک پر آئینس ہارکینس کے دستخط تھے۔ نعش کے داہنے بازو سے کچھ دُور نیچے کی جانب ایک سوراخ سا تھا، ہینس اسی پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

"قتل عمد؟" اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "معاملہ سخت پیچیدہ و سنگین ہے، یقیناً کروکیٹ کو گولی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ وہ خط کہاں ہے اسپنک؟ دیکھو شاید اس سے یہ معمہ حل ہو جائے!"

خط میں تحریر تھا۔

"شریر النفس کروکیٹ! بالآخر تم یہاں بھی پہونچ ہی گئے، کیا اب بھی اپنی اس حماقت سے باز نہ آؤ گے؟ میں ایک بار پھر تمہاری حرص و طمع کی آگ بجھانے کو تیار ہوں۔ تم کل شام کو جس وقت چاہو آ سکتے ہو...... غروب کے بعد میں تمہارا منتظر رہوں گا۔"

خط پر لکھنے والے کے دستخط نہ تھے، لیکن چیک کا یکساں اندازِ تحریر دیکھ کر یہ معلوم کر لینا چنداں دشوار نہ تھا کہ مکتوب بھی ہارکینس کے زورِ قلم کا رہین ہے۔

"ٹھیک، بالکل ٹھیک، چیک کل دیا گیا اور خط ایک دن پہلے۔"

(۳)

مارٹ لیک میں عین دریا کے کنارے ایک شکستہ و بوسیدہ مکان واقع تھا، یہی کپتان ہارکنس کی تفریح گاہ تھی۔ کپتان اوائل شباب میں افریقہ کی ایک انگریزی فرم میں ملازم تھا جب وہ ناکارہ و مضمحل ہو کر وطن واپس ہوا تو اپنے ساتھ بہت سی مخش افواہیں بھی لایا۔ اس کے متعلق بہت سی باتیں سنی گئیں۔ عام طور پر مشہور تھا کہ افریقہ میں اُس نے گوری نسل کے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ یہی سوچتا ہوا ہینس اپنے شریک کار کے ہمراہ تھانہ کی جانب روانہ ہوا۔

تھانہ میں پہونچکر اُس نے اپنی تحقیقات کی رپورٹ مرتب کی اور ایک سپاہی کپتان اور اس کے مکان پر نظر رکھنے کے لئے تعینات کر کے فی الفور باہر آیا۔

"عجیب گورکھ دھندا ہے، عقل کام نہیں کرتی، بمشکل تو کروکیٹ کی دم سے مخلصی ہوئی تھی لیکن اب ایک نئی مشکل کا سامنا ہے۔"

"لیکن اگر کسی طرح کپتان تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ مشکل بھی آسان ہو سکتی ہے۔" اسپنک نے

زور دیتے ہوئے کہا۔

"آہ، اسپنک! ممکن ہے کہ تمہارا خیال درست نکلے، لیکن اگر کپتان بیگناہ ہوا تو؟"

نو آموز سراغرساں ان قیاس آرائیوں سے عجب کشمکش وپیچ میں پڑکر اس کا منہ تکنے لگا۔

"تمہیں یاد ہے۔ کروکیٹ کے فرار اور مخبری کے مابین جتنا وقت گذرا اس عرصہ تک وہ ایک ایسے بدمعاش کا آلۂ کار رہا ہے جو بدقماش عربوں سے ساز باز رکھتا تھا اور بردہ فروشی کے مکروہ پیشہ سے شکم پُری کرتا تھا، مائیک ولکس شاید یہی اس ملعون کا نام تھا"

"ہاں، اسی شیطان کے ساتھ تو کروکیٹ اب سے چار برس پیشتر زنجبار میں دیکھا گیا تھا"

"لیکن، تم جانتے ہو یہ ولکس کون تھا؟"

"نہیں۔ شاید وہ اسی کمپنی کا.........

"ٹھہرو، میں بتاتا ہوں، یہ بعینہ اس شخص کا ہمشکل تھا جسے کپتان نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا

"کیا کہا؟ کیا یہ وارداتیں ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں تو نہیں ہیں؟"

تھوڑی دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے اور باقی راستہ اسی اُدھیڑبن میں طے ہو گیا اسکاٹ لینڈ یارڈ پہنچکر بینس نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر کپتان کے مکان کی تلاشی لینے اور ضرورت لاحق ہونے پر اُسے گرفتار کرنے کے لئے وارنٹ حاصل کئے، روانگی لکھی اور مارٹ لیک کا راستہ لیا۔

پارلنس برج سے مارٹ لیک تک یہی دو تین میل کا فاصلہ ہوگا، وہ بھی باتوں باتوں میں طے ہو گیا، اور ایک بجتے بجتے دونو موقع واردات پر جا پہنچے، یہاں خفیہ پولیس کا جمعدار پہلے ہی سے ان کا منتظر تھا۔ بینس کے دریافت کرنے پر اُس نے حسب ذیل کیفیت دی:-

"کوئی آٹھ بجے ہونگے جب میں یارڈ سے روانہ ہوا، اور نو بجے سے پیشتر مارٹ لیک آیا۔ یہاں پہونچکر منتیز سے معلوم ہوا کہ وہ تھانہ ہیمراسمتھ سے کپتان وغیرہ کی نگرانی کے لئے بھیجا گیا ہے تب تو ہم لوگ برابر اس مکان کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے مکان کے دونوں اندر دروازے اسی طرح مقفل پائے، اور نہ کسی کو آتے جاتے دیکھا۔ ڈاک کے ایک ہرکارہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کپتان اِن دنوں بالکل اکیلا رہتا تھا۔ اس کی ایک خادمہ ایک رات کو یکایک علیل ہوکر شفاخانہ چلی گئی تھی........

"کیا مطلب؟ کیا شکار ہاتھ سے نکل گیا؟" اسپنک نے بات کاٹ کر جواب دیا

"کم از کم میرا تو یہی خیال ہے"۔ جمعدار نے کہا۔

جینس جمعدار اور دوسرے کانسٹبل کو دروازوں پر کھڑا کر کے اندر داخل ہونے کی تجویز پر مشورہ کرنے لگا۔ تین بار گھنٹی بجائی گئی، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اسپنک نے ایک بار نقب زن کی نگاہ سے کھڑکی کی طرف دیکھا، اور آناً فاناً قلابہ توڑ کر کواڑ علیحدہ کر لیا پھر بڑی احتیاط سے نیچے اتر کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ دونو پستول سامنے کئے سانس روک کر آگے بڑھے۔ باورچی خانہ سے ملحق کمرہ کا فرش خون کے قطروں سے لتھڑا ہوا تھا، اور کچھ دور پر ایک باریک درازسی بنی ہوئی نظر آتی تھی۔

"یقیناً یہ کسی زمین دوز کمرہ کا دروازہ ہے"۔ جینس نے جوتے کی نوک سے اُسے ہٹانے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آئیں! ...... پانی؟ ...... شاید یہ کمرہ کبھی غسل خانہ رہا ہے"۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے کواڑ اوپر اٹھاتے ہوئے اُس کے دوست نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے یہ باؤلی نیچے ہی نیچے ٹیمز سے مل گئی ہے۔ اور اسی راستہ سے کروکیٹ کی لاش بہائی گئی ہے"۔ جینس نے اپنی پیشانی پر بل ڈالکر کہا۔

کواڑ چھوڑ کر دونو باہر آگئے۔ ابھی انھوں نے پاس والے ہال میں قدم ہی رکھا تھا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ نے انھیں ہوشیار کر دیا۔ اور وہ خونخوار شکاری کی طرح چوکنا ہو کر دروازہ کی آڑ میں ہو گئے۔ ایک ہی منٹ میں کوئی ضعیف سا آدمی سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے پاؤں بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ بال بے طرح بکھرے ہوئے تھے۔ مُردنی چھائے ہوئے چہرے سے وحشت برس رہی تھی، سر سے رومال لپٹا ہوا تھا۔ دائیں آنکھ کے اوپر ایک خراش سی معلوم ہوتی تھی، کپڑوں، ہاتھوں اور رخساروں پر کالا کالا خون جما ہوا دکھائی دیتا تھا۔

"کون؟ کپتان ہارکینس!" جینس نے گرج کر پکارا۔

"آہ، انسپکٹر ...... بہت دیر کر دی، ٹیلیفون کئے تو دس گھنٹے سے بھی زیادہ ہو گئے"۔ اُس نے دیوار کا سہارا لیکر کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹیلیفون؟" حیرت سے اسپنک نے کہا: "کپتان، ہم لوگ تمہارے کل شب کے مہمان کی جستجو میں"

"ہاں۔ ہاں، میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ ذرا تشریف رکھیے میں سارا واقعہ من وعن بیان

کئے دیتا ہوں.... بدمعاش ہمیشہ کے لئے گناہ کی زندگی سے بچ گیا۔ لیکن میں نے ایک بڑی غلطی کی ہے آہ ۔ میں آپ سے بالکل سچ عرض کرونگا۔ گذشتہ شب میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ کرو کیٹ کا قتل تو درکنار میں نے کسی شریر کتے پر بھی ہاتھ نہیں اٹھایا....."

"کرو کیٹ مجھ سے بالاکراہ و اجبار روپیہ وصول کیا کرتا تھا، اور اسی غرض سے وہ کل شب کو بھی یہاں آیا تھا...... جب وہ چیک لیکر جارہا تھا تو یکایک پستول چل جانے کی آواز ہوئی میں فوراً باہر نکل آیا، کرو کیٹ زمین پر پڑا دم توڑ رہا تھا اور میرے سامنے ایک نقاب پوش کھڑا غصہ سے کانپ رہا تھا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے مجھ پر ٹوٹ پڑا اور کوڑوں سے زدوکوب کرکے فرار ہوگیا۔ ہوش میں آتے ہی میں نے یارڈ کو ٹیلیفون سے اس واردات کی اطلاع کی۔ لیکن جب دیر تک کوئی شنوائی نہ ہوئی، تو گھبراہٹ اور نیم بیہوشی کی حالت میں میں نے نعش کو باؤلی کے راستہ سے بہا دینا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے بعد تمام رات مجھے غش پر غش آتے رہے اور ابھی آنکھ کھلنے پر معلوم ہوا کہ پولیس آگئی ہے....."

"پستول کا نشانہ لگانے کی مہارت کے علاوہ تمھیں کہانی گڑھ لینے کا ملکہ بھی حاصل ہے؟ کپتان! کاش تم اس طرف تھوڑی توجہ اور کرتے، تو ایک کامیاب افسانہ نویس بن سکتے تھے۔"

بینس کی بات ختم ہوتے ہوتے اس کے ساتھی کی نظر دیوار کے پاس پڑے ہوئے ایک ریوالور پر جا پڑی۔ اس نے بڑھکر اسے اٹھالیا۔

"آہ! یہ پستول میرا نہیں ہے، انسپکٹر! میں نے اب سے پہلے اسے دیکھا بھی نہیں ہے؟"

"کپتان! تمھیں کرو کیٹ کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔" اسٹینک نے وارنٹ دکھاتے ہوئے کہا، اور جواب کا انتظار کئے بغیر اسے پولیس کی حراست میں دیدیا

"آپ بڑی سخت غلطی کر رہے ہیں۔" اس نے استقلال کے ساتھ کہا "میں بالکل بیگناہ ہوں تاہم بخوشی آپ کے ہمراہ چلنے کو تیار ہوں۔"

جس وقت وہ کپتان کو لیکر ہال کے دوسرے دروازے سے گذر رہے تھے یکایک بینس کا پیر کسی چیز میں اُلجھ جانے سے وہ رک گیا اور چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ کمرہ میں لگے ہوئے ٹیلیفون کے تار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جسے کسی نے کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ اس وقت بینس کے دل میں سیکڑوں طوفانوں کا ہیجان ہلچل ڈالے ہوئے تھا، اور ایک دبی ہوئی آواز باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈھ رہی تھی۔ پسینہ سے نکلتے ہوئے ہوا کے ایک سرد جھونکے کے ساتھ اس کے ہونٹوں

کو جنبش ہوئی اور ہال کی ساری فضا شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سے بھر گئی۔ چند ٹوٹے
پھوٹے الفاظ اسپنک کے کان میں بھی گونج اُٹھے، جن کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ: "بیَنس! کپتان
بالکل بے گناہ ہے:"

(۴)

دوسرے دن بینس نے کپتان سے حوالات میں ملاقات کی، اور اس کے زخموں کا بغور
معائنہ کیا۔ سارے جسم پر کوڑوں کے نشان تھے۔ نیلی نیلی رگیں پھول کر ابھر آئی تھیں۔ زخموں کے
بارے میں ڈاکٹر کی رپورٹ تھی کہ وہ پستول کے کُندے یا ہنٹر کے دستہ سے لگائے گئے ہیں۔ جب
بینس باہر آیا اس وقت اسپنک دن بھر کی دوڑ دھوپ کے لئے تیار ہو رہا تھا۔

"کیا یہ ممکن ہے اسپنک! کہ کسی کو گولی لگ جائے اور وہ انتقام لینے کے لئے ہنٹر ہی کا
استعمال کرے؟ چہ جائیکہ اس وقت جبکہ ضرب اتنی کاری ہو کہ مضروب اس سے جانبر بھی نہ ہوسکے؟"

"دوسری حالت میں تو ہنٹر اُٹھانے کی سکت بھی باقی نہ رہے گی"

"لیکن یہ تو قرین قیاس ہے کہ ہنٹر کھا کر گولی چلائی گئی ہو"

"مگر اس صورت میں کروکیٹ کی جیب سے چیک برآمد ہونا قاتل کی غیر معمولی عیاری کا ثبوت ہے"

"تمھیں یاد ہے اسپنک! کپتان نے ٹیلیفون کرنے کی ناکام کوشش کی تھی؟"

"ہاں، شاید چیک کاٹ دینے کے بعد اس نے ایسا کیا ہو اور یہ اس نیت سے کہ وہ کسی
طرح کروکیٹ کو پولیس کے سپرد کر کے اُس کی دست درازیوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے"۔

"اور کروکیٹ نے اُسے اس حرکت سے باز رکھنے کے لئے زدو کوب کیا ہو۔ اسی جدو جہد
میں ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا ہو، اور کپتان نے اپنی حفاظت کے لئے گولی چلا دی ہو۔
...... یہی نا اسپنک؟ لیکن تجربہ ان واقعات کی تائید کرنے سے قاصر ہے...... ہمارا
قیدی ایک معمولی ذہانت کا آدمی ہے، اور اس کا رویّہ شاہد ہے کہ وہ کبھی اس فعل کا
مرتکب نہیں ہوا۔"

"کیا تعجب اس نے کسی سے مدد لی ہو"

"یہ اور بھی مشکل ہے"

"ہمیں کپتان سے اس شخص کا حال معلوم ہونے کی کوئی امید نہیں ہوسکتی؟"

"میرا خیال ہے کہ کپتان کا اپنا بیان حرف بحرف صحیح ہے، ورنہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے

کسی بھی دوسرے شخص کا سراغ دینے سے ہرگز گریز نہ کرتا"

"یعنی"

"یہی کہ کپتان پر اس فعل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی"

بہت دیر تک یہی چرچا ہوتا رہا مگر اسٹینک کسی دلیل سے بھی کپتان کو بے قصور تسلیم کر لینے پر راضی نہ ہوا۔ چنانچہ متواتر دو روز تک رات دن اس کی نگرانی رکھی گئی لیکن اس کے طرز عمل میں تمہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ اسی اثنا میں کپتان کو مجرم ثابت کرنے کے لئے اخبارات کے کالم سیاہ ہونے لگے۔ اس کے متعلق جو افواہیں مشہور تھیں اُن سے اس معاملہ میں شک وشبہ کی گنجایش ہی نہ رہی تھی کپتان کو غش پر غش آ رہے تھے لیکن اس کے سوا کوئی ایسی بات نہ ہوئی جو اس گتھی کو سلجھانے میں مدد دے سکتی۔

ایک روز بینس علی الصبح ہی مارٹ لیک چوکی کے جمعدار کے کمرہ میں جا گھسا۔ اور اُس سے روزنامچہ طلب کرکے ۴ جنوری کے بعد کے اندراجات دیکھنے لگا۔ ۵ تاریخ کی ایک رپورٹ پڑھکر انسپکٹر عجب کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ یہ ایک ٹیکسی ڈرائور کی رپورٹ تھی جو کرایہ نہ دینے پر کسی گمنام شخص کے خلاف کی گئی تھی۔ انسپکٹر نے جمعدار سے بہت سے سوالات کئے، بالآخر مایوس ہو کر اسٹینڈ کے سپاہی کو طلب کیا سپاہی نے بیان کیا کہ

"یہ واقعہ سات بجے شام کا ہے، وہ اس وقت اسٹینڈ پر موجود تھا، جب ایک شخص ٹیکسی سے اُترا اور جلدی جلدی بھیڑ میں ملکر گم ہو گیا۔ یکایک وہ کیو برج کی طرف جاتا ہوا نظر آیا، اور اُس نے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا اوجھل ہوا کہ پھر کہیں دکھائی نہ دیا ......" سپاہی تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ بینس کچھ سوچتا ہوا اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا، اس کے کان گرم ہو گئے تھے، وہ کبھی کبھی مٹھی باندھکر ہوا میں ہلانے لگتا تھا۔ کھانستے ہوئے سپاہی نے پھر کہنا شروع کیا:۔ "چوراہے کے سپاہی سے اُسے معلوم ہوا کہ ہو بہو اُسی حلیہ کے کسی شخص نے اس کے آنے سے کچھ دیر پہلے اس سے کپتان ہارکینس کے مکان کا پتہ دریافت کیا تھا....." وہ فوراً چوکی واپس آیا اور کپتان سے ٹیلیفون پر دریافت کیا، لیکن اُس نے جواب دیا کہ وہاں کوئی نہیں آیا........"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ بینس نے بڑھکر چونگا ہاتھ میں لیتے ہوئے

"ہلو!" جواب ملا: "اسکاٹ لینڈ یارڈ...... اسٹینک...."

"اسٹینک!" بینس نے دُہرایا۔ "کارفیکس.... مارٹ لیک..... ہاں، کیا معاملہ ہے؟"

"فرس گارڈن سے لوٹتے ہوئے گشت کے سپاہی کو قریب کی جھاڑیوں میں ایک کوڑا ملا ہے جو خون میں لت پت ہے۔"

بینس نے چونکا پھینک دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

(۵)

"اسپنک! اب ہم بہت جلد کامیاب ہونگے"۔ بینس کے چہرہ پر مسکراہٹ کی ایک جھلک دکھائی دی، دونوں جلدی جلدی کیو برج کی طرف قدم اُٹھائے چلے جا رہے تھے۔ "کارفیکس بینس! ——" کسی نے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھکر پکارا۔ "کپتان ایلنفورڈ ——"

بینس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کہئے کچھ پتہ لگا؟"

"ہاں مگر بہت خفیف"

"کیا معنی؟"

"یہی، کہ اگر ہم ایک شخص کا پتہ لگالیں تو معاملہ بالکل صاف ہوا جاتا ہے"

بینس نے اس کا حلیہ بیان کرتے ہوئے کہا "ٹھہریے! مجھے یاد آتا ہے کہ جب میں ۵ جنوری کی شب کو کیو برج سے یکایک موٹر غائب ہوجانے کے سلسلہ میں تفتیش کرکے واپس آرہا تھا تو میں نے بارہ اور ایک بجے کے درمیان ایسے ہی ایک شخص کو دریا کے کنارے کنارے تیزی سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن مجھے اس پر کسی قسم کا شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہ معلوم ہوئی۔ ورنہ......"

"اوہ اب ہم منزل کے بہت قریب آگئے ہیں"، بینس نے ایلنفورڈ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا اور ایک سرگرم مصافحہ کے بعد اس سے علٰحدہ ہوگیا۔

کروکیٹ کے قتل کے دوسرے روز ایک شخص کیو برج کے مشہور شراب خانہ میں داخل ہوا، اس کے کپڑوں میں گھاس پھونس کے تنکے چپکے ہوئے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے کسی اصطبل میں پڑکر رات بسر کی ہے۔ وہ مشکوک نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور بار بار چونک اُٹھتا تھا۔ اس نے ایک کرسی میز کے نزدیک کھینچ لی، اور وھسکی ڈھالکر جیب میں ہاتھ ڈالا، اور ایک خط پھاڑ کر نیچے پھینکنے لگا، جب وہ آخری ٹکڑوں کو پھینکنے جارہا تھا ٹھیک اسی وقت منیجر کمرہ میں داخل ہوا، وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا اور ان پرزوں کو ہوا میں اُڑاتے ہوئے پیسے گننے لگا۔ دام دیکر جاتے ہوئے وہ ایک بار دروازہ پر رکا اور منیجر کو اپنی تیز نگاہوں کا شکار بناکر آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ اُس کے اس انداز

سے منیجر کو شبہ ہونے لگا۔ اُس نے اِن کاغذ کے ٹکڑوں کو چن کر ایک لفافہ میں رکھ لیا، اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

کیمبرج پہونچکر دو تو کیفے میں داخل ہوئے اور چائے پینے بیٹھے بینس چائے پیکر منیجر سے باتیں کرنے لگا۔ یہ معلوم کر کے کہ اس کے مہمان یارڈ کے مشہور سراغرساں ہیں وہ اُن کے معاملات میں بہت زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ اور اپنے اس عجیب وغریب مہمان کا ذکر چھیڑ بیٹھا جو ۵ جنوری کو وہاں آیا تھا اور وہسکی پیکر چلا گیا تھا۔ اُس نے وہ لفافہ بھی اُن کے سامنے لاکر رکھ دیا جس میں کسی پراسرار خط کے پرزے چُنکر رکھے گئے تھے۔

بینس نے بڑے اشتیاق کے ساتھ پرزے میز پر پھیلا دیے اور اُنھیں جوڑ جوڑ کر پڑھنے لگا۔ یکبارگی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ زور سے چلّایا

"ٹام گرِیڈلے — اور اسپنک! بالآخر ہم منزلِ مقصود پر پہونچ ہی گئے"۔

اسپنک نے بینس سے آہستہ سے کچھ کہا .... پھر دونوں بعجلت باہر آئے اور ساؤتھمپٹن روڈ کی جانب چل پڑے۔ ایک تپلی سی گلی میں چھوٹے سے مکان کے دروازہ پر کھڑے ہو کر اسپنک نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں اسپنک مشہور مصوّر ٹام گریڈلے سے کئی بار ملاقی ہوا تھا۔

"اندر آجایئے!" کسی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اسپنک کو دیکھکر ٹام کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بینس نے آگے بڑھکر کہا:۔

"ہاتھ اُٹھاؤ ...... تم ہمارے قیدی ہو، ..... تمھیں پارکر کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔"

"کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟ دوست!" ٹام نے کہا۔

"یہ دیکھو تمہارے بھائی کا خط موجود ہے۔ ۵ جنوری کو تم کپتان پر کوڑوں کی بوچھار کرنے مارٹ لیک گئے تھے، وہاں پارکر کو گولی کا نشانہ بنا کر کیمبرج پہونچے اور کیفے میں اپنے گناہ کی یادگار چھوڑ کر یہاں آگئے"

اس سے قبل کہ اسپنک اپنی بات ختم کرتا ٹام اُچھل کر ایک طرف ہو گیا اور اپنے کوٹ کی جیب میں سے پستول نکال کر اسپنک پر حملہ آور ہوا۔ اسپنک شانہ میں گولی لگنے سے لہولہان ہو گیا مگر بینس نے بجلی کی طرح چمک کر اُسے زمین پر گرا دیا۔ اور رسّی سے اس کی مشکیں کس لیں۔

"آہ بینس!" اُس نے کراہتے ہوئے کہا: "میں کپتان سے اپنے بھائی کا انتقام لینے گیا تھا اس نے افریقہ میں اُسے قتل کرا دیا تھا۔ لیکن افسوس کہ غلطی سے پارکر موت کے منہ میں چلا گیا۔ اور کپتان کے لئے میرا پستول خالی رہ گیا ...." یکایک کمرہ میں ایک زور کی آواز ہوئی اور ساری

تنقید کتب

بہارِ گلشنِ کشمیر جلد اول و دوم

یہ کتاب تین سو چھیالیس (۳۴۶) کشمیری پنڈت شاعروں کے مفصل تذکرہ اور ان کے کلام کے معقول انتخاب پر مشتمل ہے۔ جلد اول پر جس میں ایک سو پچاسی (۱۸۵) شعرا کا مفصل اور دلچسپ تذکرہ ہے "زمانہ" بابتہ ماہ اگست ۱۹۳۱ء میں ریویو کیا جا چکا ہے۔ دوسری جلد میں بھی جس میں ایک سو اکسٹھ (۱۶۱) کشمیری شعرا کا تذکرہ اور انتخاب کلام درج ہے وہی خصوصیات ہیں جو جلد اول کا طرۂ امتیاز تھیں۔ جلد دوم میں جن حضرات کا تذکرہ ہے ان میں اکیاون (۵۱) اصحاب ایسے ہیں جنھوں نے زبان فارسی میں داد سخن دی۔ باقی ایک سو دس (۱۱۰) حضرات اردو کے شاعر ہیں۔ اس جلد کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی شامل ہے جس میں تیرہ (۱۳) فارسی سخنوروں اور بیس (۲۰) اردو شاعروں کا حال اور انتخاب کلام درج ہے۔

مسلمانوں سے قطع نظر عربی، فارسی اور اردو ادبیات میں جن ہندو قوموں نے امتیاز حاصل کیا ہے ان میں کایستھ اور کشمیری برہمنوں کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ فارسی میں پنڈت چندربھان برہمن اور ترکی (اصلی تخلص بیتاب، جنکا جنگنامہ شاہنامۂ فردوسی کی ٹکر کا ہے) اور پنڈت دیاشنکر نسیم لکھنوی و پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی کا نام نامی اردو کی ادبی دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیگا۔

اس بسیط تذکرے میں مؤلفین نے نہایت تلاش و تجسس ۔۔۔ اور محنت و جانکاہی سے کام لیا ہے۔ کتاب کی کتابت اور طباعت میں درستی اور صحت کا بھی بہت خیال رکھا گیا ہے، تاہم بتقاضائے بشریت بعض مقامات میں بعض غلطیاں رہ گئی ہیں جو بدنما معلوم ہوتی ہیں، مثلاً:-

پنڈت ریشہ پیر کے حالات میں یہ شعر لکھا ہے:-

ؔ ۔ مرتبہ جناب پنڈت برج کشن کول صاحب بیخبر و پنڈت جگموہن ناتھ رینہ صاحب شوق ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر،

امشب شاہِ شاہاں مہماں شد است مارا　　جبریل با ملائک درباں شد است مارا

پہلا مصرع غلط اور عروض سے خارج ہے، اس میں "امشب" کے بجائے "امروز" ہونا چاہیئے اور اصلی مصرعہ بھی یہی ہے :-

امروز شاہِ شاہاں مہماں شد است مارا

اسی بیان میں دوسرا شعر بھی غلط درج ہوگیا ہے ؎

در کارگاہِ وحدت کثرت چہ کار آید　　ہشت دہ ہزار عالم یکساں شد است مارا

دوسرے مصرعہ میں "ہشت دہ" کے بجائے "ہژدہ" ہونا چاہیئے۔

جلد اول کے "عرض حال" میں بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں، مثلاً "اکابر" کی جگہ "اکابران" اور "سامعہ یا سمع خراشی" کے بجائے "سامع خراشی"۔

امید ہے کہ یہ فروگذاشتیں جو بہت معمولی ہیں آئندہ اڈیشن میں درست کردی جائیں گی۔ دونوں جلدوں کا حجم ۱۷۳۶ صفحات ہے، لکھائی چھپائی خوشنما، کاغذ اعلیٰ، جلد مضبوط، پشتے پر سنہرے حروف میں کتاب کا نام درج ہے۔ یہ تذکرہ ایکسو بارہ اصحاب کی تصویروں سے بھی مزین ہے۔

سیرت محمد علیؒ [1]

مرحوم مولانا محمد علی بی۔ اے۔ (آکسن) اڈیٹر "کامریڈ" و "ہمدرد" کی یہ مفصل سوانحعمری دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصۂ اول میں مولانائے مرحوم کے سوانح حیات، عادات و خصائل، علم و فضل، عزم و استقلال، وطن دوستی، ایثار، شاعری وغیرہ سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور حصہ دوم میں مولانا کے مدبرانہ کارناموں اور سیاسی خدمات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ شروع میں پبلشرز کے نوٹ کے بعد مولانا عبد الماجد بی۔ اے دریابادی مدیر اخبار "سچ" کا ایک مبسوط دیباچہ ہے جو اس قدر دلآویز اور مؤثر پیرایہ میں لکھا گیا ہے کہ پڑھکر بے ساختہ دل سے داد نکلتی ہے۔

مادر ہند نے بڑے بڑے علما، فضلا، نامی گرامی مشائخ اور مشہور و معروف مصلحین پیدا کئے اور کرتی رہیگی، لیکن ان بزرگوں کا حلقۂ اثر عموماً ہندوستان تک محدود رہا، مگر مولانا محمد علی مرحوم کا اثر ہندوستان کے باہر بھی تھا۔ اور ترک موالات کے زمانے میں تو ان کا نام ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔

[1] مرتبہ مولانا رئیس احمد جعفری ندوی۔ رائل سائز کے ۴۳۵ صفحے۔ لکھائی چھپائی کاغذ نفیس قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ جامعہ دہلی

مولانا محمد علی نہ صرف اُردو کے زبردست انشا پرداز، شاعر اور لکچرار تھے، بلکہ انگریزی زبان پر بھی ان کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ بڑے بڑے انگریز ادیب ان کے قلم کا لوہا مانتے تھے۔

گذشتہ پچیس تیس سال کے اندر ہندوستان میں مسلمانوں کی شاید ہی کوئی تحریک یا کانفرنس ہوئی ہو جس میں مولانا محمد علی مرحوم کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر موجود نہ ہو۔ اس وسیع اثر کا مفصل حال اس سوانحعمری سے بخوبی ثابت ہوتا ہے۔

اگرچہ یہ کتاب نوجوان مؤلف کی اولین تصنیف ہے، تاہم انھوں نے تمام واقعات کو نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ زبان کے لحاظ سے بھی کتاب کی عبارت نہایت سلیس اور عام فہم ہے، اور فضول عبارت آرائی سے کہیں کام نہیں لیا گیا ہے۔ بہرحال ہمارے نزدیک فاضل مؤلف کی یہ کوشش قابل داد اور لائق تحسین ہے۔

نوجوان ورتھر کی داستانِ غم[1]

یہ کتاب جرمنی کے مشہور فلسفی گوئٹے کی تصنیف "سارو نز آف ینگ ورتھر" کا ترجمہ ہے جسے ریاض الحسن صاحب ایم۔ اے نے اُردو کا لباس پہنایا ہے۔

قدرت کے فیاض اور علم پرور ہاتھوں نے جو قابلیت اور جو دل و دماغ جرمنی کے اس مشہور آفاق شاعر گوئٹے کو مرحمت فرمایا وہ بہت لوگوں کو مقدر ہوا ہوگا۔ کتاب زیرنظر گوئٹے کی مشہور آفاق تصنیف کا ترجمہ ہے۔ یہ کوئی افسانہ یا ڈرامہ نہیں ہے بلکہ ورتھر نامی ایک نوجوان کے خطوط کا مجموعہ ہے جو اُس نے ایک لڑکی کی زلف گرہ گیر میں پھنسکر لکھے۔ خطوط کیا ہیں، ایک عاشق حرماں نصیب کے واردات قلب اور دلی جذبات کی سچی تصویریں ہیں۔ ہجراں نصیب ورتھر کی محبوبہ کی شادی جب ایک دوسرے نوجوان سے ہوجاتی ہے تو وہ دل شکستہ ہوکر فرط غم والم سے خودکشی کرلیتا ہے۔ مرنے سے پیشتر جو آخری خط اُس نے لکھا ہے وہ انتہا درجہ کا موثر ہے۔

جرمنی میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو پبلک نے بے اختیار ہوکر اس کو سر آنکھوں پر لیا حتیٰ کہ نوجوانوں نے اسی قسم کا لباس بھی پہننا شروع کردیا جو ورتھر کا بتایا گیا تھا، اور نہ معلوم کتنے عاشقوں نے ورتھر کی تقلید میں اپنی جانیں دیدیں۔ الغرض یہ کتاب واقعی لاجواب ہے۔

فاضل مترجم نے شروع میں اٹھاون صفحات پر مشتمل ایک "ابتدائیہ" تحریر کیا ہے جسمیں گوئٹے

---

[1] حجم ۲۰۲ صفحات لکھائی چھپائی کاغذ معمولی قیمت مجلد ۱۲؍ غیر مجلد ۱۰؍ ملنے کا پتہ: لٹریری سنڈیکیٹ نمبر ۱ بیلی روڈ۔ الہ آباد۔

کی سوانحعمری، علم وفضل، حکمت وفلسفہ، اس کی کردار نویسی اور اعلیٰ انشاپردازی پر روشنی ڈالی گئی ہے اس مقدمہ نے اصل ترجمہ کو گویا چار چاند لگا دیے ہیں۔

ایک زبان کے مفہوم کا دوسری زبان میں ادا کرنا ٹیڑھی کھیر ہے، اور گو اس ترجمہ میں بھی محاورات اور زبان کے اعتبار سے بعض خامیاں باقی رہ گئی ہیں تاہم اس کی شگفتگی اور بیساختگی نے اِن خامیوں کی بہت کچھ تلافی کر دی ہے۔ قدردانان اُردو کو فاضل مترجم کا ممنون ہونا چاہیئے جن کی بدولت وہ گوئٹے جیسے زبردست مصنف کی ایک مشہور آفاق تصنیف سے روشناس ہو گئے۔

تاریخ صقلیہ جلد اول[1]

یہ دلچسپ کتاب مولوی ریاست علی ندوی کی تصنیف لطیف ہے، جس میں جزیرہ صقلیہ (سسلی جو اطالیہ کے جنوب میں بحیرۂ روم میں واقع ہے) کے اس زمانہ کی مفصل اور محقق تاریخ قلمبند کی گئی ہے جب وہ دو سو برس تک مسلمانوں کے قبضۂ اقتدار میں رہا تھا۔ بحیرۂ روم میں جزیرہ صقلیہ اور مالٹا کا محل وقوع اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ جس طاقت کے قبضہ میں یہ دونوں جزیرے ہوں اُس کے ہاتھ میں گویا مشرق و مغرب کی کلید آ گئی۔ یہی باعث ہے کہ ان دونوں جزیروں کے لئے قدیم زمانہ ہی سے مختلف جہاز راں قوموں میں بڑی جدوجہد رہی رومتہ الکبریٰ اور قرطاجنہ (کارتھیج) کی دو زبردست طاقتوں کے درمیان جو طویل سلسلہ جنگ "پیونک وارس" کے نام سے شروع ہوا تھا اس کا سبب صرف صقلیہ کی حکومت اور قبضہ تھا۔ ساتویں صدی مسیحی میں جب افریقہ کے اندر مسلمانوں کی طاقت کو عروج ہوا تو اُن کی توجہ بھی جزیرہ صقلیہ کی طرف مبذول ہوئی۔ کیونکہ اسی جزیرہ کو اپنا بحری مستقر بنا کر سلطنت رومہ کی سواحل افریقہ و مغربی ایشیا پر تاخت و تاراج ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ ۶۵۲ء سے لیکر ۸۰۰ء تک مسلمانوں نے صقلیہ پر لگاتار حملے کئے، جن کا اصلی مقصد یہ تھا کہ رومہ کی توجہات دیگر محاذات سے ہٹا کر صقلیہ کی طرف منعطف کر دی جائیں نویں صدی مسیحی کے آخر میں رومیوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے بحیرۂ روم میں مسلمان تاجروں کے جہازوں پر حملہ کر دیا جس سے برافروختہ ہو کر مسلمانوں نے قاضی اسدالدین مشہور اہل قلم والسیف سردار کی ماتحتی میں صقلیہ پر حملہ کر دیا اور فتح پائی، چنانچہ اس جزیرہ پر مسلمانوں کا قبضہ وتسلط ہو گیا، اور وہاں مسلمانوں کا پہلا حکمران خاندان جنھیں "ملوک اغلب" کہتے ہیں سو برس تک داد جہانبانی دیتا رہا۔ ان کے بعد صقلیہ پر مصر کے سلاطین فاطمیہ نے قبضہ کر لیا جن کی سلطنت پچاس برس تک رہی۔ فاطمیوں کے بعد خاندان کلبی کی سلطنت قائم ہوئی مگر یہ سلاطین خانہ جنگیوں کی

[1] حجم پانچسو سولہ صفحات قیمت چار روپیہ للعہ، ملنے کا پتہ: دار المصنفین اعظم گڑھ۔

بدولت اس قدر کمزور ہوگئے کہ ان پر گیارھویں صدی کے آخر میں نارمن لوگوں نے حملہ کرکے عربوں کو جزیرہ سے نکال دیا۔

مولوی ریاست علی نے اس تاریخ کی تدوین و ترتیب میں نہ صرف عربی بلکہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن کتب سے بھی مدد لی ہے۔ کتاب میں مقلیہ کے تین نقشے بھی شامل ہیں جن سے قبل اور دوران حکومت اسلامیہ کی حالت پر روشنی پڑتی ہے۔ الغرض مولوی صاحب نے اس تاریخ میں عربوں کی بحری طاقت کے عروج و زوال کا ایک عبرت انگیز و نصیحت آموز مرقع پیش کردیا ہے جس کے لئے زبان اردو ان کی ممنون رہیگی۔

مونا وانا[1]

ملک بلجیم کے نامور ڈرامانگار مارس میٹرلنک کی اس مشہور و معروف تصنیف کو ہمارے دوست اور اردو کے نوجوان ادیب مسٹر جلیل احمد قدوائی ایم۔اے نے اردو کا جامہ پہناکر اردو پر ایک قابل قدر احسان کیا ہے جس کے لئے ہم ان کی نظر انتخاب کی داد دیتے ہیں۔

چند معمولی فروگذاشتوں سے قطع نظر مسٹر قدوائی کو ترجمے میں قابل قدر کامیابی ہوئی ہے۔ خاتمۂ کتاب پر ایک فرہنگ کے ذریعہ مشکل تلمیح طلب الفاظ کو حل بھی کردیا ہے جس سے ترجمے کی دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا ہے۔ قیمت ۱۲ہر ہے جو کتاب کے سائز اور حجم کے لحاظ سے یقیناً زیادہ ہے۔

قسمت اور دوسرے افسانے[2]

یہ کتاب پروفیسر سید عابد علی صاحب ایم۔اے کے چند مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ہر افسانہ میں زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے، مگر یہ پہلو زیادہ تر غیر معمولی اور عجیب نہیں۔ عام شائقین کے لئے یہ مجموعہ کچھ بہت دلچسپ نہیں ہے۔ اس کی زبان بھی سلیس نہیں ہے اور آمد کے مقابلہ میں آورد زیادہ ہے اور کہیں کہیں "شتر گربہ" کا عیب بھی نمایاں ہوگیا ہے مثلاً "چاروں طرف ایک مہیب چپ مسلط تھی"۔ یہاں "چپ" کی جگہ "خاموشی" ہونا چاہیئے۔ یا

"تقدیر تنہا بیٹھی ہے اور برے دن تخلیق کررہی ہے، ہاں میں ان آدمیوں کو جانتا ہوں جن کو دیوتاؤں نے پہلے سے میری طرح متنبہ نہیں کیا، وہ یکایک چکنا چور ہوگئے"

برُے دن کے ساتھ "تخلیق" کا جوڑ کچھ ٹھیک سا نہیں بیٹھتا۔ علاوہ بریں ہمیں "آدمیوں کے چکنا چور ہونے" کے

[1] ملنے کا پتہ: کتابستان الہ آباد [2] ملنے کا پتہ: رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور۔ قیمت ۹ر

محاورہ میں بھی کلام ہے۔ بایں ہمہ بعض کرداروں کی نفسی کیفیات واضح کرنے کی کوشش میں مصنف کو کامیابی ہوئی ہے۔ بہر حال یہ کتاب سفر میں وقت گذاری کا کام دے سکتی ہے۔

سرگذشت ادب ترکی

یہ چھوٹی تقطیع کے بیس صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں مولوی ریاست علی ندوی رفیق دارالمصنفین وسب اڈیٹر "معارف" اعظم گڈھ نے ترکی ادب کی ابتدائی تاریخ، ترکی شاعری کا آغاز، عہد بعہد کی ترقی، عہد اسلامی میں سلاطین عثمانیہ کی سرپرستی، دور ثانی میں ادبیات یورپ سے ترکی کی اثرپذیری دور حاضرہ کی ترکی شاعری، اور عہد بعہد کے ممتاز و باکمال ترکی شعراء کے مجمل حالات قلمبند کئے ہیں۔

۲۔ر قیمت میں دارالمصنفین اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے۔

مہاتما رسکن

یہ چھوٹی تقطیع کے تین جزو کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں مسٹر آنند سروپ بھٹناگر بی۔اے۔ سابق اڈیٹر "پراسپیریٹی کراچی" نے انگلستان کے مشہور مصلح اور زبردست ادیب جان رسکن کی مختصر سوانحعمری اسکی تعلیمات، نظریات اور اس کے "فلسفۂ حیات" سے بحث کرکے عوام کی اخلاقی رہنمائی کے لئے بعض پند و نصائح تحریر کئے ہیں۔ مصنف کی کوشش کامیاب ہے۔ زبان اگرچہ سلیس ہے مگر بعض جگہ عبارت میں انگریزی الفاظ کی فضول ٹھونس ٹھانس روا رکھی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی۔ کاغذ نفیس۔ چار آنہ ۴ر میں ساغر بکڈپو میرٹھ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

سلطان الہندؒ

یہ کتاب حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی منظوم سوانحعمری ہے جو مسدس حالی کے طرز پر لکھی گئی ہے اور واقعی خوب لکھی گئی ہے۔ کلام میں سلاست و روانی دونوں بدرجۂ اتم موجود ہیں، زبان بھی شستہ و پاکیزہ ہے۔ البتہ جہاں ہندوستان کی معاشرتی، مذہبی اور تمدنی حالت پر مصنف نے تبصرہ کیا ہے وہاں ایک صدی پیشتر کی "مولویت" کی بو آتی ہے۔

لہ مصنفہ امین الدین خاں صاحب مفتوں اجمیری۔ چھوٹی تقطیع، ضخامت پانچ جزو، لکھائی چھپائی، کاغذ معمولی، قیمت چھ آنہ ۶ر ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ، عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

دنیا میں ہر شخص کو خیالات و معتقدات کے متعلق پوری آزادی حاصل ہے لیکن دوسروں کے اعتقادات و خیالات کی مذمت کر کے ان کے جذبات کو ٹھیس لگانے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اس کتاب کے اس حصے میں جہاں اُس وقت کے ہندوستان سے بحث کی گئی ہے نامناسب طنزیہ لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ بایں ہمہ کتاب کا بڑا حصہ ایسے پند و نصائح اور حکیمانہ اقوال سے معمور ہے کہ انسان ان پر عمل کر کے دین و دنیا دونوں میں سُرخرو ہو سکتا ہے۔

مشاہیر ادب اُردو

چھوٹے سائز کے ۱۴۴ صفحات پر پروفیسر مہیش پرشاد صاحب صدر شعبۂ عربی، فارسی و اُردو ہندو یونیورسٹی بنارس نے اُردو کے تیس مشہور و معروف ادیبوں اور شاعروں کا مختصر تذکرہ لکھا ہے جس کا سلسلہ حضرت وؔلی دکھنی سے شروع ہو کر علامہ سر محمد اقبال پر ختم ہوا ہے۔ مختصر سوانح حیات کے علاوہ ہر ایک کے کلام یا تحریر کا دلچسپ انتخاب بھی دیا ہے جس سے کتاب کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اختصار کی وجہ سے فاضل مصنف کو زیادہ تفصیل سے کام لینے کا موقع نہیں ملا ہے تاہم طلبائے مدارس کے لئے یہ کتاب مفید ثابت ہونا چاہیئے۔ اس کی لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے۔

گلدستۂ ہومیو پیتھی

ڈاکٹر آر۔ ایس۔ دلیلہ ہومیو پیتھ پریکٹیشنر لکھنؤ نے اس چھوٹی سی کتاب میں سر سے پاؤں تک تقریباً تمام امراض کی علامات، اسباب اور علاج درج کر دیئے ہیں۔ اور ہر مرض کے معالجہ کے لئے دو دو چار چار ہومیو پیتھک دوائیں لکھدی ہیں۔ آخر میں ایک فہرست ہے جس میں دواؤں کے نام، اُن کی کیمیاوی نوعیت اور اُن کے نمبر لکھے گئے ہیں۔ اور بعض دواؤں کے متعلق مختصر ہدایات بھی درج کر دی گئی ہیں۔ الغرض اس مختصر نسخہ میں بقول مصنف "نہایت سہل الوصول طریقہ پر علاج دکھلایا گیا ہے" جن حضرات کو ہومیو پیتھک طریقۂ علاج سے دلچسپی ہو اُن کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

عالمِ نسواں

کرتار پور ضلع جالندھر میں ودھوا لواہ کانفرنس کے نام سے آریہ سماج کا ایک خاص جلسہ سوامی پورنا نند جی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ہندوؤں میں ازدواج بیوگان کی ترویج پر زور دیا گیا اور ہندوؤں سے اس کے متعلق قصبہ کرتار پور اور اس کے نواحی دیہات میں شادی بیوگان کا پروپیگنڈا کرنے کی اپیل کی گئی۔

اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں خواتین بمبئی کی ساتویں سالانہ کانفرنس نے منجملہ دیگر تجاویز کے دو خاص طور پر اہم تجویزیں پاس کی ہیں:-

اوّل یہ کہ شاردا ایکٹ کو زیادہ مؤثر بنانے کی غرض سے ملک میں شادیوں کی رجسٹری کرانا قرار دیا جائے۔

دوسرے لڑکیوں کے تحفظ کے متعلق اُس مسودۂ قانون کی تائید کی گئی جسے کنور رگھبیر سنگھ صاحب نے اسمبلی میں پیش کیا ہے۔

اِن ریزولیوشنوں سے ہندوستانی طبقہ نسواں کی سیاسی بیداری کا ثبوت ملتا ہے۔

ستمبر کے آخری ہفتہ میں مجلس اقوام کی کونسل کے زیر اہتمام عالمگیر خواتین کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا اس میں راجکماری امرت کنور (پنجاب) مسز حامد علی (بمبئی) اور مسز شیوا نا تھم (مدراس) نے عورتوں کی قائم مقامی کا حق ادا کیا ہے۔ تینوں خاتونوں نے اس امر پر زور دیا کہ اسلحہ کی حد بندی اور مزدوروں کی صحت وغیرہ کے بارہ میں جو کمیشن منجانب مجلس اقوام مقرر کئے جائیں، ان میں ہندوستان کی خواتین بھی بحیثیت ارکان شریک کی جائیں۔

پچھلے ماہ سنہا لائبریری پٹنہ میں آل انڈیا وومنس کانفرنس کی شاخ بہار کا ایک عظیم الشان جلسہ مہارانی صاحبہ ٹکاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہارانی صاحبہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں ترقی نسواں کی تحریک کا مفصل ریویو کر کے خاتونانِ بہار سے اصلاح و ترقی کی اپیل کی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ نصاب تعلیم میں ایسا کورس بھی داخل ہونا چاہئیے جسے پڑھکر عورتیں امور خانہ داری اور پرورش اطفال کے فرائض بخوبی انجام دے سکیں۔

اس جلسہ میں آل انڈیا وومنس کانفرنس کے لئے چھ خواتین نمایندہ منتخب ہوئیں اور مندرجہ ذیل تجاویز پاس ہوئیں۔ (۱) لڑکوں اور لڑکیوں کو اسکولوں میں ساتھ تعلیم دی جائے۔ (۲) عورتوں کا ایک خاص اخبار جاری کیا جائے۔ (۳) نوجوان بیواؤں کی دوسری شادی کرانیکی کوشش کیجائے۔

ریاست ریواں کے رئیس سیٹھ دیا چند صاحب نے اپنے مرحوم بھائی کنھیا لال صاحب کی یادگار میں ایک عالی شان دھرم شالہ تعمیر کرایا ہے، جس کا افتتاح جونیر مہارانی صاحبہ نے اپنے دستِ مبارک سے فرمایا۔ ریاست مذکور میں یہ پہلا موقعہ ہے جس میں کسی مہارانی نے اِس قسم کی رسم ادا کی ہو۔

اجمیر میں سری دیانند اردھ شتابدی کے سلسلہ میں ۲۰۔ اکتوبر کو مس شانتو دیوی پرنسپل کنیا مہا ودیالیہ جالندھر کی صدارت میں آل انڈیا آریا خواتین کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں رانی صاحبہ کالا کانکر بھی شریک ہوئیں۔ صدر صاحبہ نے عورتوں سے بدیشی مال کے بائیکاٹ کرنے کی اپیل کرتے ہوئے چرخہ کو رواج دینے کی پرزور سفارش کی۔ آپ نے رسمِ جہیز، نامناسب عمر کی شادیوں، چھوت چھات، توہم پرستی وغیرہ کی سخت مذمت کی۔ اور تمام زنانہ انجمنوں کو ملاکر ایک آل انڈیا ایسوسی ایشن قائم کرنے اور غریب یتیم اور بیوہ عورتوں کی پرورش کے لئے آشرم کھولنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے یہ بھی رائے دی کہ عورتوں کے لئے جو آشرم وغیرہ جاری کئے جائیں ان کا انتظام اور نگرانی خود عورتوں کے ہاتھ میں ہو۔ اِن مختلف امور کے متعلق کانفرنس میں ریزولیوشن بھی پاس ہوئے۔

گورنمنٹ میسور نے شریمتی ڈی سگاما کو تعلیم نسواں کی مشاورتی کمیٹی کا ممبر نامزد کیا ہے۔

کلکتہ کی مس اوما بوس سنے جو مسٹر ایس۔ ایم۔ بوس ممبر قانونی کونسل بنگال کی صاحبزادی ہیں

امسال کلکتہ یونیورسٹی کا امتحان ایم۔اے اول درجہ میں پاس کیا ہے۔آپ کا مضمون فلسفہ تھا جس میں آپ کو اس قدر نمبر ملے کہ آج تک کسی کو حاصل نہیں ہوئے چنانچہ اس امتیازی کامیابی کی قدردانی میں آپ کو ایک طلائی تمغہ بھی عطا کیا گیا۔مس مدوحہ نے ۱۹۲۷ء میں میٹرکیولیشن کا امتحان بھی اول درجہ میں پاس کرکے بیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ حاصل کیا تھا۔انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں بھی آپ یونیورسٹی بھر میں دوم رہی تھیں،جس کے صلہ میں پچیس روپیہ ماہوار وظیفہ اور کئی دیگر وظائف اور مختلف انعامات ملے۔۱۹۳۱ء میں آپ نے بی۔اے پاس کیا اور فلسفہ میں خاص اعزاز حاصل کرکے یونیورسٹی بھر میں اول رہیں،چنانچہ آپ کو بتیس روپیہ ماہوار کا جوبلی اسکالرشپ،کلنٹ میموریل پرائز،کیشب چندر گولڈ میڈل اور پرائز،فلپ اسمتھ پرائز،ہیمنت کمار گولڈ میڈل،پرتاب چندر گولڈ میڈل گنگامئی دیوی گولڈ میڈل،ولیم اسمتھ پرائز وغیرہ بہت سے تمغے اور انعامات ملے۔

ہندوستان میں ایک عرصۂ دراز سے فن موسیقی اور رقص وسرود ایک بدنام طبقے میں محدود ہوگیا ہے۔مگر کچھ دنوں سے ہمارے معیار ذہنی میں خاطرخواہ فرق ہورہا ہے اور اب اس فن لطیفہ کو اسکولوں اور کالجوں میں ترقی دینے کا خیال عام ہورہا ہے۔چنانچہ بنگال کی مس بینا ایڈی پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جنھوں نے مغنیہ کا پیشہ اختیار کرکے یورپ کے تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔آپ کلکتہ کے ایک شریف خاندان کی نورنظر ہیں،چار سال ہوئے یورپ تشریف لے گئیں جہاں انھوں نے یورپ کے ممتاز ترین ماہرین فن موسیقی یعنی مارکو لوٹا گنی نیپلز،فریڈرک کنگ ممبر رائل اکیڈمی لندن،اور ارنیاجر ڈمارٹ جرمنی کی شاگردی میں مغربی فن موسیقی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔پیرس،روما،برلن اور لندن میں جب آپ کا گانا ہوا تو آلات نشر صوت کے ذریعہ سے تمام دنیا نے سنا اور پسند کیا۔جب آپ لندن میں تھیں تو گول میز کانفرنس کے ممبروں نے بھی آپ کا گانا سنا تھا،اور اب انگلستان چھوڑنے سے قبل آپ کا گانا شہزادی ولسی،لیڈی آرگائل،مارشنس ڈوفن وآوا نے بھی سنا تھا ہندوستان میں بھی اکثر مقامات پر آپکی قدردانی ہوئی ہے

تہذیب اخلاق اور اصلاح معاشرت کا کام جس قدر جلد اور موثر طریقے پر عورتیں کرسکتی ہیں مردوں سے نہیں ہوسکتا۔جاپان کی عورتوں نے یورپ کی کورانہ تقلید کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا ہے چنانچہ ٹوکیو کی ایک انجمن خواتین نے طے کردیا ہے کہ اس کے ممبران شراب،سوڈا واٹر،چائے وغیرہ پینے والے مردوں سے شادی نہ کریں۔

مسز شرلا دیوی چودھرانی (لاہور) کو شکاگو کی ورلڈ فیلوشپ آف فیتھ (رفاقت مذاہب عالم) کانفرنس میں جو جون لغایت نومبر منعقد ہوگی شرکت کی دعوت دیگئی ہے

یادِ شباب

(از حضرت محشر لکھنوی)

ہر نفس اپنا تھا گویا نفسِ اعجازِ شباب | یاد ہے پیری میں ہمکو دورِ آغازِ شباب
روح ایک اِک قطرے کو دیتی تھی پیغامِ نمو | خون تھا پنہاں رگوں میں صورتِ رازِ شباب
نفسِ امّارہ کی نفسِ ناطقہ سے جنگ تھی | وہ عدوئے جاں گسل اور یہ تھا دمسازِ شباب
فیضِ قدرت سے ہوا حاصل یہ روحانی شرف | جلوہ حسن و عشق کا تھا آئینہ سازِ شباب
جس نے دیکھا حضرتِ یوسف کو موسیٰ ہو گیا | ہوش اُڑاتی ہے صدائے نغمۂ سازِ شباب
جلد کے پردے سے کیا چھپتا طلسمِ قدرتی | پھوٹ نکلا رنگِ خوں کا بنکے غمازِ شباب
ایک ادا میں زندگی و موت دونوں کی خبر | عقل میں آتے نہیں اسرارِ اعجازِ شباب
دل میں انساں کے نہ پیدا ہو جو روحانی اثر | مر بھی جائے لیکن اُٹھ سکتا نہیں نازِ شباب
طائرِ جانِ ملایک کا کیا بڑھ کر شکار | کس قدر رفعت پہ ہے پروازِ شہبازِ شباب
کر لیا زیرِ نگیں دنیائے حسن و عشق کو | اور کیا قدرت دکھائے زورِ اعجازِ شباب
شوق کو ہنگامہ آرائی سے مہلت ہی نہیں | اک قیامت سی قیامت ہے کہ آغازِ شباب
مد بھری آنکھیں ادائیں شوخ اور مستانہ چال | محفلِ اہلِ نظر میں یہ ہیں غمازِ شباب

مختصر محشر یہ ہے عمرِ رواں کا فلسفہ
موت انجامِ جوانی زیست آغازِ شباب

(از حضرت سلیم جعفر صاحب)

کوہِ طورِ راجپوتانہ، مقدس سرزمیں   بن رہا ہے صدیوں سے مرجعِ اہلِ یقیں
فخر اس کا ہے تجھے کب سے؟ پتا چلتا نہیں   تیرے غاروں جنگلوں میں تھے رشی عزلت گزیں
دیوتا اور عابد و عارف بھی رہتے تھے یہیں

زلزلہ کا شور سننے میں جو آتا ہے کبھی   سوئے گردوں نالۂ کہسار جاتا ہے کبھی
فکر سے مطلب جو اس کا کوئی پاتا ہے کبھی   بس وہ اتنا ہے کہ شاید طیش کھاتا ہے کبھی
دیوتا کوئی کہ اگلی سی پرستش اب نہیں

اس عقیدت کے ذرا دیکھو کرشمے تو سہی   وعدہ و تہدید سے صدیوں حکومت جس نے کی
کھینچ لاتا ہے برس اب بھی ہے لاکھوں جاتری   دیر دلواڑہ میں، اللہ اللہ وہ کاریگری!
غرقِ حیرت دیکھ کر جس کو کہ ہے ارژنگِ چیں

کیوں نہ وارژنگِ چیں کو کیوں بھلا حیرت نہو   گاتھا اس صنعت کا قائل اور اس کا کلمہ گو
آہ لیکن جو یہ کہتی ہے ذرا وہ بھی سنو   "میں نشانی جن کی ہوں وہ علم و حکمت صاحبو
نزع میں ہیں منہ میں پانی ڈالنے والا نہیں"

جینیوں نے اس کو بنوایا عبادت کے لئے   ہم خیال اب ہند میں جن کے بہت کم رہ گئے
جن کو ہے لاتا رہا شوقِ زیارت کھینچ کے   باعثِ تعمیرِ مندر خوب وہ ہیں جانتے
ذکر اس کا روبرو ان کے عبث ہے بالیقیں

بے تکلف ہے لبِ مغرب تبسم آشنا   حال پڑھ کر جین، وشنو اور پارس ناتھ کا
یوں ہے مشرق کا خیال اس باب میں واقع ہوا   دہر میں سب کی عبادت کا ہے واحد مدعا
فرقِ مسلک ہے حقیقی فرق تو کچھ بھی نہیں

غار میں لے جائے یا چوٹی پر اس کو جستجو دیوتا کے نقشِ پا کی، یا پھرلے سُو بہ سُو
یا کھڑا ہو دیر دلواڑہ میں بُدھ کے روبرو یا مراقب ہو گئو مُکھ[1] میں وہ مردِ نیک خو
خوش عقیدت کے لئے ہے کافی ہونا دلنشیں

"کیا غرض مجھ کو کہ حاکم کون ہے اس کوہ کا اُس کا مذہب ہے قدیمی یا کہ ہے بالکل نیا
مجھ کو پوجا سے غرض ہے، پاٹھ میرا مدعا عہدِ طفلی سے رہے ہیں جو کہ میرا مشغلہ
ہے کسی کو شک تو ہو، مجھ کو ذرا ان میں نہیں"

سُن کر اس کو دل پر اس کے کچھ اثر ہوتا نہیں چھینا تھا پرمار سے چوہاں نے یہ حصنِ حصیں
ہیں خیالات اس کے راج سوئے دورِ اولیں جب گرو شکھر[2] پہ وشنو تھے یہاں عزلت گزیں
اور دنیا تھی فقط اک طفلِ گہوارہ نشیں

زائروں کا ہر برس تانتا لگا رہتا ہے یاں اُن میں سے جن کو پسند آیا یہ کوہِ دلستاں
چھوٹتا ان سے بھلا پھر کب ہی یہ رشکِ جناں گرد ہو جاتا نظر میں ان کی ہے سارا جہاں
وہ یہیں رہتے ہیں۔ ہوں جبتک نہ پیوندِ زمیں

رباعیات

(از جناب منشی گرسرن لال صاحب ادیب لکھنوی)

امید بقائے زیست نادانی ہے جو کچھ ہے جہاں میں وہ سب فانی ہے
ہر رہروِ زندگی کو یہ منزلِ مرگ پیش آئی ہے پیش آتی ہے پیش آنی ہے

ناداں نہ اُلجھ کانٹوں میں بدبینی سے رکھ باغِ جہاں میں کام گلچینی سے
دنیا ہے سرائے سب مسافر ہیں یہاں حاصل کیا ہوگا نخوت آئینی سے

---

[1] गऊ मुख ایک وادی میں ایک مندر ہے

[2] गुरु शिखर پہاڑ کی ایک چوٹی۔

(از حضرت جگر مرادآبادی)

عجب عالم سا دل پر چھا رہا ہے — حسیں جیسے کوئی شرما رہا ہے

نگاہوں سے نگاہیں لڑ رہی ہیں — مزے دردِ محبت پا رہا ہے

پیامِ شوق کا اب پوچھنا کیا — برابر آ رہا ہے جا رہا ہے

وہ زلفیں دوش پر بکھری ہوئی ہیں — جہانِ آرزو تھرا رہا ہے

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں — محبت کا زمانہ آ رہا ہے

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں — مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

غمِ دل کو خدا آباد رکھے — نشاطِ زندگی برسا رہا ہے

وہ کچھ دل کو مرے سمجھا رہے ہیں — کچھ اُن کو دل مرا سمجھا رہا ہے

طبیعت ہی کہ ٹھہری جا رہی ہے — زمانہ ہے کہ گذرا جا رہا ہے

قطعہ

ازل ہی سے چمن بندِ محبت — یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے

کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے — وہیں اک پھول بھی مرجھا رہا ہے

جگر ہی کا نہ ہو افسانہ کوئی

در و دیوار کو حال آ رہا ہے

آئینِ تعیّن

(از جناب سید مقبول حسین بی۔اے احمد پوری)

ایک دن تھا حسن جب خود ہی محبت کوش تھا
عشق تھا لیکن کسی احساس میں روپوش تھا

فیضِ روح القدس ہر سو میکدہ بر دوش تھا
آسماں کا ہر ستارہ محوِ نائے و نوش تھا

کُن سے معمور تھا یہ سب نظامِ کُن فکاں
عالمِ امکاں کا ہر ذرہ ہمہ تن گوش تھا

نَے سے نَے، نغمے سے نغمہ، مَے سے مَے، اور مُل سے مُل
گل سے گل، بوٹے سے بوٹا طالبِ آغوش تھا

دیکھتا تھا کوئی یہ جلوے بصد کیف و سرور
سامنے سارا جہاں آئینۂ خاموش تھا

فتنہ سامانی پہ آمادہ تھے جلوے حسن کے
"ہوش تھا جتنا جسے اُتنا ہی وہ بے ہوش تھا"

حُسن سکھلانے لگا سب کو محبت کا چلن
جو جہاں تھا اپنے اپنے رنگ میں مدہوش تھا

رفتہ رفتہ جب دلوں میں رنگ پیدا ہو گیا
خود بخود دہر سَرَوں میں آشفتہ سری کا جوش تھا

کوئی غش کھا کر گرا سکتہ کسی کو ہو گیا
"جسمیں جتنا ظرف تھا اُتنا ہی وہ خاموش تھا"

ناگہاں اعلان آئینِ تعیّن کا ہوا
جس کو دیکھا داعیِ تحصیلِ عقل و ہوش تھا

الغرض مقبول جب عالم کا یہ عالم ہوا
عشق آوارہ ہوا حسنِ ازل روپوش تھا

لطفِ سخن

(از حضرت احسن مارہروی)

مدعی ذوقِ محبت کا طلبگار نہیں — طالبِ عیش ہے لذت کشِ آزار نہیں
مہربانی جو تری اسے نگہِ یار نہیں — چشمِ الطاف کسی کی مجھے درکار نہیں
تو نے ہرچند مجھے چھوڑ دیا ہے لیکن — یاد تیری ابھی دل سے مرے بیزار نہیں
کیوں نہ ہو موت سے بدتر یہ مری بیخبری — بے خبر جس نے کیا ہے وہ خبردار نہیں
حسن کا نام بھی بدنام کیا ہے کیا کیا — جتنے دلبر ہیں دلِ زار میں دلدار نہیں
بات کچھ اس سے کروں اسکا تو مذکور ہی کیا — اک نظر دیکھ لوں، اتنا بھی روادار نہیں
ساتھ ہے عمرِ رواں کا تو سکونت کیسی — کہیں دم بھر کے ٹھہرنے کے بھی آثار نہیں
شوخیاں شرم نے کھودیں مژہ و ابرو کی — تیر اڑتے ہوئے چلتی ہوئی تلوار نہیں
رشکِ گل خود ہے تو منت کشِ گلزار نہ بن — غیر کا ہاتھ ہے گردن میں تری ہار نہیں
آرزو یہ ہے کہ اک آہ دو حرفی سن لو — کوئی قصہ نہیں دفتر نہیں طومار نہیں
خوش نصیبوں کو میسر ہے یہ دولت احسن — بدنصیبوں کے لئے عشق سزاوار نہیں

(از حضرت بیتاب بریلوی)

مکتبِ عشق کی تعلیم بڑی مشکل ہے — سبق مسلکِ تسلیم بڑی مشکل ہے
زلفِ پیچاں سے اُلجھتا ہے تقاضائے جنوں — بیخودی میں تری تعظیم بڑی مشکل ہے
ہوں تو قائل تجھ اجورِ بتاں کا لیکن — مشربِ عشق میں ترمیم بڑی مشکل ہے
دل پہ لوٹی ہے اگر زلف تو مچلی ہے نظر — لوٹ کے مال کی تقسیم بڑی مشکل ہے
زلف رہ رہ کے بکھرتی ہے عجب عالم ہے — اس سیہ بخت کی تنظیم بڑی مشکل ہے
جلوۂ عشرتِ نظارہ ہے بیتاب مگر — سرنگوں ہو کے یہ تکریم بڑی مشکل ہے

(از جناب پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق)

کروں تھم تھم کے نالے لب پہ کھینچ کھینچکر فغاں آئے
مزہ جب ہے دلِ سوزاں سے رُک رُک کر دھواں آئے

میں وقفِ یاس و حرماں ہوں بلا آئے تو آنے دو
مرے ہوتے ہوئے کیوں وہ نصیبِ دشمناں آئے

چمن سے واسطہ چھوٹا، قفس سے اب تعلق ہے
ہمیں کیا ہے بہار آئے کہ گلشن میں خزاں آئے

نہ حسرت ہی نہ ارماں ہے نہ اب سوزِ نہاں باقی
یہ کس کو اور رونا تھا جو اشکِ خوں فشاں آئے

قفس میں آشیاں کی یاد ہم دم بھر نہیں بھولے
کفِ صیاد سے چھُٹ کر وہیں بہرِ فغاں آئے

یہاں پروا نہیں ہم کو کسی کی غمگساری کی
انیسِ غم وہی ہے پھر وہی دردِ نہاں آئے

اُسی کے دل میں رہنے سے تو کچھ تسکین ہوتی ہے
خدا کے واسطے لب تک نہ آہِ ناتواں آئے

اسیری نے بھُلا ڈالی ہے سب طرزِ نوا سنجی
قفس میں کیوں نہ ہر دم یادِ اندازِ فغاں آئے

رفیق و راہبر کیا ہو کوئی وادیِ غربت میں
نظر آئے بیکسی جس جا نہ گردِ کارواں آئے

عجب کیا ہے دلِ وحشی وہیں چل کر بہل جائے
جہاں ناقوس کا غل ہو، جہاں شورِ اذاں آئے

دُکھے دل کی کہانی ہائے سُننے کون بیٹھے گا
وہ اک لمبی حکایت ہے نہ ذکرِ دوستاں آئے

(از جناب جلیل قدوائی ایم۔ اے)

آنکھوں سے اشکِ گرم کہاں تک بہا کرے
اِک آبلہ سا دل ہے سو کب تک وفا کرے

کیوں میرے اضطراب کا کوئی گِلا کرے
قابو نہ اپنے دل پہ جسے ہو وہ کیا کرے

اُس سے بعید کیا ہے گدا کو کرے جو شہ
اُس سے بعید کیا ہے جو شہ کو گدا کرے

جس کے ہر ایک فعل میں پنہاں ہو سفلگی
اُس زندگی سے کوئی کہاں تک وفا کرے

کرلیں گے وہ قبول مگر اُن کے روبرو
جو دل میں ہے وہ آئے تو لب تک خدا کرے

بے نام بے ٹھکانے مرض کا علاج کیا
پہچان ہو مرض کی تو کوئی دوا کرے

اُس رخ پہ گیسوؤں سے اُلجھتی ہے بار بار
گستاخ ہو گئی ہے جو چاہے صبا کرے

صدقے میں اُس کرم کے مٹائے جو دردِ دل
قربان اُس ستم کے جو دردِ آشنا کرے

اس زندگی کی فکر سے فرصت نہیں ہوئی
اُس زندگی کی فکر بھلا کوئی کیا کرے

کہتے ہیں زندگی کا سہارا اُمید ہے
لیکن کوئی اُمید پہ کب تک جیا کرے

صحبت میں اُس مغنیِ آتش نفس کے اب
خو ہو گئی ہے دل کو کہ ہر دم جلا کرے

مدت ہوئی کہ سینہ میں دل محوِ خواب ہے
کہہ دو خرامِ یار سے محشر بپا کرے

اپنا بنا چکے اُسے جب ہم تو اے جلیل
ہے اختیار اُس کو جفا یا وفا کرے

علمی خبریں اور نوٹ

اُردو رزمیہ شاعری کے بادشاہ اور مداحان اہلبیت کے سرتاج میر ببر علی انیس کی قبر پر ایک خوبصورت اور وسیع یادگار قائم کرنے کے خیال کی اب تک تکمیل نہیں ہو سکی۔ مگر اب یہ خبر اطمینان بخش ہے کہ لکھنؤ کے چند ان معززین کی ایک کمیٹی قائم ہو گئی ہے جو اس مقصد کے لئے چندہ جمع کر رہی ہے۔ ایران کے شاہ رضا شاہ پہلوی نے فردوسی کے مزار کی درستی و تزئین کو ایران کا ایک ملکی فرض سمجھا ہے، پھر کیا مزار انیس کی درستی میں سلطان العلوم خسرو دکن کوئی امداد نہ دیں گے؟ بہر حال ہم امید کرتے ہیں کہ اب عنقریب ہی میر انیس کی ایک معقول اور شاندار یادگار قائم ہو جائیگی۔

جرمنی میں آجکل زندگی کے ہر شعبے میں نئے نئے احکام جاری ہو رہے ہیں، چنانچہ مطالعۂ کتب میں بندشیں قائم ہوئی ہیں، مثلاً ایک ضابطہ کے ذریعہ تمام کتب فروشوں کو تحریکات مجہول (Passive) نظریۂ ڈاروِن اور فلسفۂ فرائڈ کے متعلق کتابیں فروخت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ کتب خانوں کو بھی غیر ملکی زبانوں کی کتابیں خواہ وہ اصل ہوں یا ترجمہ اہل جرمنی کو اسی وقت پڑھنے کے لئے دینے کی اجازت ہوگی جب اُن کی عبارت جرمن جذبات کے مطابق سمجھی جائیگی۔ غیر آریا قوم کے افراد یا اُن جرمنوں کے لئے جو غیر آریا عورتوں سے شادی کر چکے ہیں، اخبار نویسی کا پیشہ ممنوع قرار دیدیا گیا ہے مگر ہندوستان کے لئے یہ خبر ضرور مسرت انگیز ہے کہ سنسکرت کی تعلیم تمام جرمن یونیورسٹیوں میں لازمی قرار دی گئی ہے۔ آرین تہذیب کا مطالعہ کرنے کیلئے چند جرمن فاضل مدبرین ہندوستان بھی آنیوالے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے اسیری کے زمانہ میں اپنی نورنظر مس اندرا نہرو کے نام الکیسو خط لکھے جن میں چھ لاکھ الفاظ ہیں۔ پنڈت صاحب نے دنیا کی تاریخ تحریر کی ہے۔ اس جدید تاریخ عالم کا ہندی ترجمہ پنڈت وینکٹیشن نراین صاحب تیواری ممبر کونسل و ممبر انجمن خادمان ہند کر رہے ہیں،

کیا اچھا ہو اگر پنڈت صاحب اس کے ساتھ ہی اس کتاب کے اردو ایڈیشن کی اشاعت کا بھی انتظام کردیں۔

انگریزی زبان کی بہترین اور مکمل ترین لغت "نیو انگلش ڈکشنری" گزشتہ نصف صدی کی مسلسل جانفشانی اور دماغ سوزی، تلاش و تحقیق کے بعد شائع ہوئی ہے۔ یہ علمی خدمت آکسفورڈ یونیورسٹی کی سرپرستی میں انجام دی گئی ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی نے اس کی پہلی جلد پچاس سال ہوئے شائع کی تھی، آخری جلد ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد تتمہ اور ضمیمہ جات کی ترتیب شروع ہوئی جن میں تمام جدید الفاظ اور محاورات درج ہیں جو انگریزی زبان میں حال میں داخل ہو گئے ہیں۔ پوری ڈکشنری کی قیمت اکیس پونڈ اور ضمیمہ جات کی قیمت سوا پانچ پونڈ (تقریباً اسی روپیہ) ہے۔ اصل کتاب میں چودہ لاکھ چودہ ہزار آٹھ سو پچیس الفاظ، پانچ لاکھ محاورات اور دو لاکھ ضرب الامثال ہیں۔ اگر تمام حروف کو ایک لائن میں سجادیا جائے تو ایک سو اٹھتر میل لمبا خط بن جائیگا۔ اردو میں بھی اعلیحضرت نظام دکن نے ایک مکمل لغت کی ترتیب و تدوین کا انتظام فرمایا ہے، اور اردو کے مشہور محسن مولوی عبدالحق صاحب اس کے انچارج ہیں۔ دیکھئے اسکی پہلی جلد کب تک شائع ہوتی ہے۔

مشہور مطبع نظامی پریس بدایوں سے روہیلوں کے سردار اور روہیلکھنڈ کے نامور حکمران حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی سوانحعمری "حیات حافظ رحمت خاں" کے نام سے زیر طبع ہے۔ غالباً وسط نومبر تک یہ کتاب شائع ہو جائیگی۔ کتاب کا حجم چار سو صفحات کا ہے۔ تقطیع $\frac{۲۰}{۸} \times ۲۶$ اور لکھائی چھپائی کاغذ سبھی میں نفاست کا خیال پیش نظر رکھا گیا ہے۔ دس ہاف ٹون نایاب تصویریں بھی اس کتاب میں شامل ہونگی۔ قیمت تین روپیہ تجویز کی گئی ہے۔ کتاب کے مؤلف مولوی سید الطاف علی صاحب بریلوی بی۔اے ہیں۔ اور صاحبزادہ عبدالواحد خاں صاحب ایم۔اے (علیگ) سابق پولیٹیکل سکریٹری ریاست بھوپال و رئیس بریلی نے اس کی چھپائی کے لئے ایک ہزار روپیہ کا گرانقدر عطیہ دیا ہے۔ اور مولانا نظامی بدایونی نے اس کے شروع میں ایک مفصل فاضلانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے غرض کتاب ہر اعتبار سے قدردانی کی مستحق ہے۔

دارالمصنفین اعظم گڈھ یا شبلی اکیڈیمی سے امسال تین کتابیں شائع ہونیوالی ہیں، اول خیام جس میں عمر خیام کی سوانحعمری اور تنقید کلام کے علاوہ اس کے چھ فلسفیانہ عربی، فارسی رسالے اور رباعیات کا صحیح اور مستند نسخہ شامل ہوگا اس کی ضخامت پانچسو صفحات سے زائد ہوگی۔

دوسری کتاب جو تیار ہو رہی ہے سیر الصحابہ کی ساتویں اور آخری جلد ہے۔ تیسری تصنیف کا نام افکار عصریہ ہے اس میں موجودہ سائنس کے تمام شعبوں کے نظریاتی مسائل سہل، آسان اور دلچسپ عبارت میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب دراصل انگریزی کتب سے اس لئے ترجمہ کی گئی ہے کہ عربی خواں طلبا کو سائنس کے جدید نظریات سے واقفیت ہو جائے۔

ناظرین زمانہ یہ سنکر خوش ہونگے کہ ایک نوجوان ہندوستانی انجنیئر مسٹر ہری جی گوئل نے انگلستان میں دیوناگری کی ایک لیتھو ٹائپ مشین ایجاد کی ہے جس میں انگریزی سنسکرت۔ ہندی اردو۔ مرہٹی گجراتی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے حرف چھاپے جا سکتے ہیں۔ اور لندن کے پرنٹر اس مشین کا معائنہ کرکے اس کو پسند کر چکے ہیں۔ اس میں پندرہ گنی رفتار کی تیزی سے ٹائپ صحت کے ساتھ نصب کیا جا سکتا ہے۔

قدیم ادبی نسخوں کی جو قدردانی مغربی ممالک میں ہوتی ہے اسکی ایک تازہ مثال سننے میں آئی ہے کہ لندن میں رباعیات عمر خیام کے انگریزی ترجمہ کا وہ نسخہ جو ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء میں شائع کیا تھا اور جسے ایک کباڑی نے دو آنے سے بھی کم قیمت میں کسی سے خریدا تھا۔ سال میں آٹھ سو نوے پاؤنڈ میں فروخت ہوا ہے۔ اس ترجمے کی ۱۸۶۸ء سے شہرت ہونے لگی، چنانچہ اس کا پہلا ایڈیشن چالیس پونڈ فی جلد کے حساب سے فروخت ہوا۔ اب یہ ایڈیشن نایاب ہے اسی طرح نپولین اعظم کے آٹھ عاشقانہ خطوط کا ایک مجموعہ جو ۱۷۹۶ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیان جوزیفائن کے نام لکھے گئے تھے چار ہزار چار سو پونڈ کو فروخت ہوا ہے۔ اب تک یہ مجموعہ لارڈ روزبری کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔

شاہنامۂ فردوسی کے طرز پر ایک ایرانی شاعر "نوبخت" نے پہلوی نامہ کے نام سے ایک نیا شاہنامہ لکھا ہے جس میں زوال ساسانیان سے لیکر رضا شاہ پہلوی تک کل حالات منظوم ہیں۔ یہ منظوم تاریخ بارہ سال کی محنت میں ۱۹۳۲ء میں مکمل ہوئی۔ "فردوسی اول" نے تیس برس کے عرصہ میں صرف ساٹھ ہزار اشعار کہے تھے مگر "فردوسی ثانی" نے بارہ برس کی مدت میں ایک لاکھ شعر کہڈالے۔ پوری کتاب تین جلدوں میں تمام ہوئی ہے مگر ابھی صرف پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔

خط و کتابت

حضرت غالب دہلوی کے قدر شناسوں کی خدمت میں

جناب من، تسلیم، یہ امر موجب مسرت ہو کہ غالب کے اُردو خطبات اور رقعوں کی اشاعت بہت کافی ہوئی اور ہو رہی ہے، چنانچہ "اُردوے معلیٰ" اور "عود ہندی" کے مختلف ایڈیشن دہلی، لاہور، آگرے، لکھنؤ، الہ آباد وغیرہ سے شائع ہوئے۔ مگر اسکے ساتھ ہی کمال افسوس کی بات ہو کہ ان دونوں کتابوں میں سے ایک کا بھی کوئی ایڈیشن ایسا نہیں کہ اسقام و اغلاط سے پُر نہ ہو۔

کتابت کی غلطیوں اور چھاپے کی خرابیوں سے قطع نظر کبھی کوئی کوشش اس بات کی بھی نہیں کی گئی کہ یہ جواہر پارے تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کئے جائیں اور انکے متعلق ایسا تاریخی مواد کیا جائے جس سے اس مایہ ناز شاعر اور نثار کی صحیح تصویر نظر کے سامنے آ جائے۔ اگر اب بھی اس طرف توجہ نہ کی گئی تو دس بیس برس بعد ضروری تاریخی مواد کا فراہم ہونا محال ہو جائیگا۔ اس خیال نے مجھے اس کام پر آمادہ کیا اور میں نے باوجود اپنی بے بضاعتی کے عملی کوشش شروع کر دی۔ خدا کا شکر ہو کہ دو تین برس کے کام کا نتیجہ بہت ہمت افزا رہا:۔

۱۔ غالب کی کچھ تحریریں ایسی جمع ہو گئیں جو اَب تک کہیں نہیں چھپی ہیں۔ ان میں بعض اصل رقعے غالب ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔

۲۔ جو رقعے وغیرہ ملک کے مختلف رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں وہ بھی یکجا ہو گئے ہیں۔

۳۔ اردوے معلیٰ اور "عود ہندی" کے مختلف مطبوعہ نسخوں کا مقابلہ اور تنقیح کرکے متن کی تصحیح کر لی گئی ہے، گو کہ ابھی تک ان کے اصل رقعے دستیاب نہیں ہوئے۔

۴۔ جو رقعے "اُردوئے معلیٰ" اور "عود ہندی" یا مختلف رسالوں میں آ گئے ہیں اُن کے علاوہ بھی ملک میں غالب کی بہت سی تحریریں مختلف خاندانوں میں یقیناً محفوظ ہیں جنمیں سے صرف بعض کا پتا چلا ہے۔ انھیں کے حاصل کرنیمیں آپ حضرات سے میں مدد چاہتا ہوں، تاکہ جہاں تک ایسی تحریریں مل سکیں، غالب کے اُردو رقعات کی مجوزہ اشاعت میں شامل کر لی جائیں۔

اب غالب کے قدر شناسوں اور اپنے ہمدردوں سے میری درخواست ہو کہ وہ:۔

(الف) غالب کا کوئی خط، رقعہ یا اور کسی قسم کی کوئی تحریر (اور اگر اصل کا ہاتھ آنا ممکن نہ ہو تو اُسکی صحیح نقل) بہم پہنچائیں۔ یا کم سے کم اُس کا ٹھیک پتا بتلائیں۔

(ب) جو تحریریں "اُردوے معلیٰ" یا "عود ہندی" وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں اُن کے اصل جہاں کہیں محفوظ ہوں

اُس سے اطلاع بخشیں۔

(ج) غالب کے موسومۂ ذیل مکتوب الیہم میں سے جس کسی کے جو کچھ حالات معلوم ہوسکیں اُنھیں (مع اپنے ماخذ کے حوالے کے) مجھ تک پہونچانے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔

غالب کے اصل رقعے اگر زیادہ تعداد میں مل گئے تو اُن کے عکس ایک الگ کتاب کی صورت میں شائع کئے جائیں گے: اگر کم تعداد میں ہاتھ آئے تو اُن کے عکس اسی مجموعے میں شامل کر دئیے جائیں گے۔ جن حضرات سے مجھے کسی قسم کی مدد ملے گی اُن کا شکریہ کتاب کے دیباچے میں عرض کیا جائیگا۔

ہندو یونیورسٹی، بنارس
۱۹- اکتوبر ۳۳ء

خاکسار
مہیش پرشاد (مولوی فاضل)
استاد عربی و فارسی و اردو

غالب کے مکتوب الیہ، جن کے حالات دریافت طلب ہیں:-

۱- منشی غلام بسم اللہ
۲- مولوی احمد حسن خاں، میاں مرزا پوری
۳- حکیم سید احمد حسن مودودی
۴- میر احمد حسن، میکش
۵- منشی ہرگوبند سہائے
۶- سید بدر الدین، فقیر
۷- لالہ کیول رام، ہشیار
۸- مولوی کرامت علی
۹- میر بندہ علی، عرف میرزا میر
۱۰- میر افضل علی، عرف میرن صاحب
۱۱- مرزا یوسف علی خاں، عزیز
۱۲- مولوی عزیز الدین
۱۳- نواب میر ابراہیم علی خاں، وفا
۱۴- منشی حبیب اللہ ذکا (حیدرآبادی)
۱۵- منشی ہیرا سنگھ۔

ضروری اطلاع

جن صاحبوں کی خریداری ماہ جنوری سے شروع ہوتی ہے انکا حساب آئندہ نمبر کے ساتھ ختم ہوکر آئندہ سال کی قیمت واجب الادا ہو جائیگی۔ لہذا گزارش ہے کہ ایسے صاحبان ۵ جنوری ۳۴ء تک زمانہ کا سالانہ چندہ مبلغ پانچروپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں ورنہ جنوری ۳۴ء کا رسالہ سالانہ قیمت کے لئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (V.P.P.) ارسال ہوگا۔

منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب کوپن پر، اپنا پورا نام و پتہ (اور جہاں تک ممکن ہو، اپنا نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں تاکہ رجسٹر میں رقم مرسلہ کا صحیح اندراج ہو سکے۔

جن صاحبوں کو آئندہ خریداری رکھنا منظور نہ ہو وہ براہ کرم دسمبر نمبر پہونچنے کے بعد فوراً ہی اطلاع دیدیں تاکہ اُن کی خدمت میں جنوری کا رسالہ نہ بھیجا جائے۔

سانس ذریعہ فائدہ پہونچانے والی
پیپس کی ٹکیوں سے
سانس لینے والی نلیوں کی شدید بیماریاں
مکمل طور پر اچھی ہو جاتی ہیں
برانکائٹز کا مرض سینہ کو اس قدر کمزور کر دیتا ہے کہ بیمار ہر وقت سانس لینے کی تکلیف اور سخت کھانسی کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور بیماری کے ہر نئے درد کے ساتھ سانس کا لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے
پیپس سانس لینے والی نلیوں اور پھیپھڑوں کا سب سے سیدھا اور مکمل علاج ہے۔ جب آپ سانس کے ساتھ فائدہ پہونچانے والی ان ٹکیوں کو استعمال کرتے ہیں تو حلق اور سانس لینے والی نلیوں کی سوزش اور ورم ماسس بہت جلد رفع ہو جاتی ہے اور کھانسی بالکل اچھی ہو جاتی ہے۔ پیپس سے سینہ کو آرام پہونچتا ہے اور حلق کے اندر تمام نازک جھلیوں کی تکلیف دور ہو جاتی ہے۔ گلے میں پھنسنے والا بلغم بھی اکھڑ جاتا ہے اور تمام تنفس کی تمام تکالیف بالکل رفع ہو جاتی ہے
پیپس گلے، سینہ اور پھیپھڑوں کو طاقت پہونچاتی ہے۔ اور کھانسی۔ زکام۔ گلے کی سوزش لارنگلٹز۔ کنٹھ مالا۔ دمہ اور نزلہ وغیرہ کے لئے بہت مفید ہے۔
سب انگریزی دوا فروش پیپس ایک روپیہ فی شیشی کے حساب سے فروخت کرتے ہیں۔
ایجنٹ:۔ مسرز اسمتھ اسٹین اسٹریٹ اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ اٹالی۔ کلکتہ
پیپس کی ہر ٹکیہ پر نقرئی ورق چڑھا ہوتا ہے
پیپس

زمبک
Zam Buk
اکزیما پھوڑے پھنسی اور زخموں کیلئے
جڑی بوٹیوں کا حیرت انگیز مرہم
زمبک زخم یا دیگر جلدی امراض کو جادو کی طرح شفا بخشتا ہے۔
یہ حیرت انگیز مرہم کیمیاوی طور پر بیش قیمت اور نایاب جڑی بوٹیوں کے تیل اور جوہروں
سے تیار کیا جاتا ہے۔ زمبک میں جراثیم کش تریاق صفت خاصیتیں موجود ہیں۔ یہ جراثیم
کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ خون میں سمیت نہیں ہونے دیتا۔ ورم کو تحلیل کرتا ہے اور تمام مادہ
فاسدہ کو خارج کر دیتا ہے۔ نئی اور عمدہ جلد پیدا کرتا ہے۔
زمبک سب انگریزی دوا فروشوں کے یہاں دستیاب ہوتا ہے
ایجنٹ:۔ مسرز اسمتھ اسٹینس اسٹریٹ اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ انٹالی۔ کلکتہ
جانوروں کی چربی سے پاک ہے
قیمت فی ڈبیہ ایک روپیہ یا دو روپیہ چار آنہ
CONTAINS NO ANIMAL FAT
IS PURELY HERBAL
Zam-Buk
"RUB IT IN"
FOR
CUTS · BURNS · BRUISES · ECZEMA
SCALDS · PILES · BAD LEGS
ITCH · DELHI SORES · RINGWORM
PRICKLY HEAT · ULCERS · CHRONIC SORES
BOILS · ABSCESSES · RHEUMATISM
BITES & STINGS · SPRAINS

دس منٹ میں شاعر

مولانا خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی کی معرکۃ الآرا تصنیف شاعری کی مکمل سٹ کر جس سے تقریباً اس ہزار شاعر مستفیض ہو چکے ہیں اسکا زبردست ثبوت یہ ہے کہ ان کے کتب خانے سے اتنی کتابیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکی ہیں جسمیں تعلیم کرنیکا آسان قاعدہ علم عروض علم قافیہ محاسن و معائب شاعری تا بگیگوئی کے قواعد صنائع و بدائع کا بیان اصلاح دینے کے اصول اور ابتدائی مشق کے آسان قاعدے بالتفصیل مذکور ہیں ابتک اس سے بڑھکر آسان کتاب جس کو پڑھکر مبتدی بآسانی سمجھ سکتے نہ تھی اگر آپکو اردو زبان دانی و شاعری کا شوق ہے تو پہلے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے اور مشق کی ترکیب پر عمل کیجئے۔ ایک سال میں آپ شاعر بن جائیں گے حال میں کچھ مفید اضافہ کرکے کتاب کو اور بڑھا دیا گیا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے مکمل سٹ کی قیمت دو روپیہ ۶/

ملنے کا پتہ

منیجر عشرت بک ڈپو احاطہ خانساماں
کیننگ اسٹریٹ۔ لکھنؤ

جدید اردو شاعری

تصنیف جناب عبد القادر صاحب سروری عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن) قیمت مجلد تین روپیہ ۳/

پریم چند کی تازہ تصنیف

بیوہ

اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات لکھے گئے ہیں اور ان کی ترغیبات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتی ہیں اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ بیواؤں کے لئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے۔

ملنے کا پتہ

منیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور

بذریعہ استعمال سناٹوجن

پھر وہی بے برداشت بھوک

بذریعہ استعمال سناٹوجن معدہ میں تعجب انگیز تقویت حاصل ہو جانے کے باعث بھوک کی کمی رفع ہو جاتی ہے اور دیگر تکالیف بھی اسکے ساتھ جاتے رہتے ہیں آپ پھر بھی ہر طرح کی غذاؤں کی لذت اٹھانے کے قابل ہو جائیں گے اور تمام جسم میں اسکے تقویت دینے والے اثر رسائی کی بدولت آناً فاناً میں بہ نسبت قبل اور بھی صحت مند اور طاقتور ہو جائیں گے۔

سلطنت بھوپال سے محمود علی خانصاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"سناٹوجن کا استعمال کرکے میں ہمیشہ کارگر اور خوش مزاجی کے ساتھ رہتا ہوں اور علاوہ اسکے قریب قریب دوگنی خوراک ہضم کر سکتا ہوں۔"

جبکہ بذریعہ استعمال سناٹوجن جملہ تکالیف جسمانی رفع ہو جاتے ہیں تو آپ کیوں معدہ کی گڑبڑی کی تکلیف کو برداشت کر رہے ہیں۔ آج ہی اس تعجب انگیز مقوی غذا کا استعمال شروع کر دیں۔

SANATOGEN

ہر ایک دواخانہ اور بازار میں ملتا ہے

سناٹوجن تیار کرنے کے وقت سے پیک کرنے تک ہاتھوں سے نہیں چھوا جاتا ہے

ڈابر (ڈاکٹر ایس کے برمن) لمیٹڈ
پچاس برس سے مشہور لاثانی دیسی پیٹنٹ دواؤں کا وسیع کارخانہ
STAR TRADE MARK REGD
کیا آپ دمہ سے تکلیف اُٹھا رہے ہیں
دب دمہ REGD
دمہ کی دوا
ایک ہی خوراک میں دمہ کو دبا کر آرام ہو جاتی ہے
دمہ ریاحی مرض ہے "دب دمہ" بگڑتے ہوئے ریاح کو بند ہار تی ہے۔ دمہ خواہ کتنے ہی زور کا اُٹھا ہو ایک یا دو خوراک پیتے ہی دب جاتا ہے۔ جبتک دوا پی جاتی ہے دمہ زور نہیں کرتا کچھ دنوں لگاتار اس دوا کے پینے سے دمہ جڑ سے چلا جاتا ہے
دوسری دواؤں کے استعمال سے جو نا اُمید ہو گئے ہوں اس دوا کی ضرور آزمائش کریں کیونکہ یہ پچاس برس سے ہزاروں مریضوں کو آرام کر چکی ہیں۔
قیمت فی شیشی ایک روپیہ چھ آنہ
ڈاک محصول تین شیشیوں تک
REGD
ڈابر دواؤں کے نمونہ کا بکس
کم قیمت میں (ہمارے یہاں کی) زود اثر دواؤں کی آزمائش ہو سکے اس لئے ہم نے مندرجہ ذیل چنندہ بارہ اقسام کی دواؤں کا بکس تیار کیا ہے۔
۱ کافو (عرق کافور)
۲ پودن ہرا (عرق پودینہ)
۳ جلابن (جلاب کی گولیاں)
۴ دب دمہ (دمہ کی دوا)
۵ لال شربت (لال شربت)
۶ کوالاریا (کوالاٹا کمپ)
۷ نیتشینا (مقوی باہ کی گولیاں)
۸ سرابتیا (درد سر یا ریاحی درد کی گولیاں)
۹ زنگ رنگ (داد کا مرہم)
۱۰ ہیلک (کٹے جلے وغیرہ کا مرہم)
۱۱ دردِ دانت (دانت کے درد کی دوا)
۱۲ درد کان (کان درد کی دوا)
قیمت فی بکس دو روپیہ ۶، ڈاک محصول ۱۰
پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

شائع ہوگئی   شائع ہوگئی

قوم کی آواز

مہاتما گاندھی کی نئی کتاب

یعنی

ان تقریروں کا مجموعہ جو گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں کیں اور سفر لندن کے حالات ہندوستانیوں کے حقیقی جذبات و خیالات کا آئینہ۔ انگلستان کے مختلف طبقے اور مختلف خیالات کے لوگوں سے مہاتماجی کی ملاقات کا ذکر۔ اس کتاب کے مطالعہ سے آپ کو ہندوستان اور انگلستان کے آئندہ سیاسی اور معاشری تعلقات کی رفتار کا اندازہ ہوگا۔

ضخامت تقریباً چار سو صفحات شروع میں

مہاتماجی کا ایک نیا فوٹو قیمت عمر

تلاش حق

یعنی مہاتماجی کی آپ بیتی۔ بچپن سے لیکر تحریک ترک موالات تک تمام حالات قیمتی تجربات اور وہ سب مراحل جو حق کی تلاش میں انھیں پیش آئے۔ سادہ و دلکش زبان۔ ضخامت سات سو صفحات سے زیادہ۔ متعدد تصاویر۔ قیمت قسم اول (دونوں حصے) دو روپے

قسم دوم (دونوں حصے) ایک روپیہ

مکتبۂ جامعہ دہلی

زمانہ

مرتبہ: دیانرائن نگم بی۔اے

جلد ۶۱ | دسمبر ۱۹۳۳ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

تصاویر: مسٹر پٹیل مرحوم۔ نادر شاہ مقتول

زمانہ پریس کانپور

زمانہ

جلد ۶۱ — دسمبر ۱۹۳۳ء — نمبر ۶

کایستھوں میں اصلاح تمدن کا مسئلہ[لہ]

سوشل ریفارم اور اصلاح تمدن کی تحریک کو ہندوستان میں جاری ہوئے تقریباً دو پشتیں ہو چکیں۔ یوں تو ہندوؤں میں تقریباً ہر قرن اور ہر زمانے میں بڑے بڑے ریفارمر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن برطانوی سلطنت کے قائم ہونے اور انگریزی تعلیم جاری ہونے کے بعد ملک کے سیاسی و تمدنی حالات و ضروریات میں جو کی بدولت رونما ہوا اور اس کی بدولت جو مسائل اہل ملک کے لئے پیدا ہو گئے اُن کے حل کرنے کے لئے راجہ رام موہن رائے، سوامی دیانند، جسٹس رانا ڈے وغیرہ نے اپنے اپنے وقت میں جو کوششیں کیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس انقلاب حکومت کے ساتھ مشرق و مغرب کی تہذیبوں میں جو تصادم ہوا اُس کی ٹکر نے اتنی مدت کے بعد ابھی تک ہم کو سکون و قرار نصیب نہیں ہو سکا ہے۔ یہاں پر یہ یاد دلانا بیجا نہ ہوگا کہ کسی قوم کو جب تک اس کی قوتِ عمل میں کافی انحطاط اور کمی اور اُس کے عام اخلاق و معاشرت میں افسوسناک تنزل نہیں ہوتا محکوم بننے یا پست حالت میں رہنے کی لعنت نصیب نہیں ہوتی۔ اور ہندو تو اپنے عروج کے زمانے میں بھی دنیوی ترقی کے بنیادی اصولوں سے بہت کافی غفلت برت چکے ہیں مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ حالات تبدیل ہونے پر وہ اپنی ہستی قائم رکھنے کی ضروری فکر ہمیشہ کرتے رہے ہیں لیکن اتحاد باہمی

لہ یہ مضمون کایستھ ڈسٹرکٹ کانفرنس فتحپور کی صدارتی تقریر کا جزو ہے جو ۱۴، ۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء کو مقام [illegible] فتحپور میں ایڈیٹر زمانہ کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی

یا قومی تنظیم یا سیاسی دانشمندی کے اصولوں پر کاربند ہونے میں انھوں نے ہمیشہ لاپرواہی برتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ متواتر بیرونی حملوں اور غیر ملکی تہذیب و تمدن کی مسلسل یورشوں کے باوجود اس عظیم الشان ملک میں ابھی تک ہندوؤں کی تعداد غالب ہے۔ اور بقول شاعر ؎

کچھ بات ہو کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری

لیکن موجودہ زمانہ میں محض تعداد کا غلبہ کوئی چیز نہیں ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ یورپ میں انگلستان اور ایشیا میں جاپان جغرافیائی حیثیت سے کتنے چھوٹے ملک ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے مقابلے میں اُن کی وسعت، اُن کا رقبہ، اُن کی آبادی کس قدر کم ہے، لیکن اپنے افراد کی اُولوالعزمی، اپنے فرزندوں کی مستعدی اور اپنی آبادی کی قوتِ عمل کے باعث آج تمام دنیا پر اِن دونوں سلطنتوں کا کتنا زبردست اثر ہے۔ غرض موجودہ زمانے میں تعداد کی جگہ قابلیت یا Efficiency نے لے لی ہے اور اس وقت کسی قوم کی عظمت کا معیار یہ ہے کہ انفرادی حیثیت سے اس کے باشندوں میں کتنی قوتِ عمل اور مجموعی لحاظ سے اس کی آبادی میں کتنی قوت تنظیم ہے۔

آپ اس کو فلک کجرفتار کی شرارت سمجھیے یا گردشِ روزگار کا کرشمہ کہیے اب وہ وقت باقی نہیں رہا جب محض شکوہ و شکایت یا مرثیہ خوانی سے کام چل جاتا تھا۔ آج دنیا جس تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اس میں گلہ یا شکوہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اسوقت دنیا میں بخت نارسا کی شکایتوں کا کوئی سننے والا نہیں رہا، اب یہ بیکاروں کا شغل رہ گیا ہے۔ اگر آپ کو اپنی ہستی قائم رکھنا ہے تو یاد رکھیے آپ کی ہستی ترقی کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اور اسکے لئے آپکو اتفاق و یکجہتی کے ساتھ اپنے تئیں موجودہ حالات کے مطابق بنانا ہوگا، اور میدان عمل میں باقاعدہ قدم آگے بڑھانا پڑیگا۔ خوب سمجھ لیجئے کہ گذشتہ پندرہ سال کے اندر دنیا کی حالت بالکل بدل چکی ہے لیکن آپ ابھی تک پچاس ساٹھ سال پہلے کے مقرر کردہ راستوں پر چل رہے ہیں اور پرانے ریزولیوشنوں کو دُہرا رہے ہیں، حالانکہ کیفیت یہ ہے:۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

تیس چالیس سال پہلے آپ کو مشکل سے ایک جگہ کی خبر دوسری جگہ معلوم ہوتی تھی، آج آپ ہزارہا میل دُور لندن اور پیرس کی تقریریں اپنے گھر بیٹھے سُن لیجئے۔ لندن اور شملہ و کلکتہ کے

درمیان جو مسافت پہلے ہفتوں اور مہینوں میں ہوتے تھے وہ آج ٹیلیفون کے سلسلوں کے قائم ہو جانے سے منٹوں میں طے ہوتے ہیں۔ سائینس انسانی قوت عمل کا ایک نیا معیار پیش کر رہی ہے جو ہمارے بزرگوں کے خواب وخیال کیا وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ دنیا کے دور دراز ملکوں کا فاصلہ معدوم ہو گیا ہے، جنگ وجدل کے طریقے قطعی بدل گئے ہیں، کمزوروں کو مٹانیکی نئی نئی ترکیبیں نکل آئی ہیں، دوسروں سے جا و بیجا فائدہ اٹھانے کے نئے نئے راستے پیدا ہو گئے، چنانچہ ایک دوسرے سے برتری حاصل کرنے کی تگ و دو میں ہر کمزور قوم اور ہر غیر ترقی یافتہ فرقہ کی ہستی خطرے میں ہے۔ ایسی صورت میں ہمارا آپ کا کیا فرض ہے؟ کیا ہم کو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا چاہیئے یا اپنے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی تدبیریں سوچنا اور صرف سوچنا ہی نہیں بلکہ ہمت واستقلال، مستعدی اور اُلوالعزمی کے ساتھ ان پر عمل کرنیکا تہیہ کرنا چاہیئے۔

ہماری ملک کی وسعت اور ہماری آبادی کی کثرت۔ ہمارے اندرونی اختلافات۔ اور مذہب معاشرت اور رسم ورواج کی نیرنگیاں ہماری قومی اور ملکی زندگی کی کمزوری کا باعث ہو رہی ہیں ہمارے پولیٹیکل آئیڈلسٹ کچھ ہی کیوں نہ کہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ تفریق ذات نے ہندوؤں کی ترقی کے مسئلہ کو نہایت ہی دشوار بنا دیا ہے، اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہندو ریفارمروں کی مسلسل کوششوں کے باوجود ابھی تک یہ تفریق ملک کے بیشتر حصے میں اپنی جگہ پر بجنسہ قائم ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انگریزی تعلیم نے باہمی خورونوش کی پابندیوں کو نوجوان تعلیم یافتہ طبقے میں بہت کچھ دور کر دیا ہے اور بعض مذہبی تحریکوں نے ازدواج باہمی کا رواج بھی قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے تاہم عوام ملک کے لئے ابھی تک قیود ذات سے مفر نہیں ہے دوسری سب سے بڑی مشکل ہماری ترقی کے راستے میں یہ حائل ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں تغیر وتبدل کا دور جاری ہے، اور اس دور (Transition Period) کے تمام نقائص اور مشکلات اس وقت بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ نئی مغربی تہذیب نے مشرقی تہذیب کی پرانی عمارت کو بالکل منہدم کر دیا ہے ہمارے جسد قومی (Body Politic) کے اعضا اور جوارح بالکل منتشر ہو چکے ہیں، ہمارا خاندانی نظام معاشرت ایک لاشۂ بیجان ہو گیا ہے اور جدید تمدن اصلاح وترقی کے تمام دعوؤں کے باوجود ابھی تک اس کی جگہ کوئی دیرپا یا مستقل تعمیر قائم نہیں کر سکا ہے۔ مثال کے طور پر کایستھوں ہی.... کی حالت پر غور کیجئے تو آپ کو اس بیان کی حقیقت واضح ہو جائیگی۔ پرانی بستیوں میں اب بھی کایستھوں کے خاص خاص محلوں اور قصبوں کے نام د

نشان باقی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں عموماً ایک خاص رقبہ میں زیادہ تر ایک ہی برادری کے لوگ آباد ہوا کرتے تھے ۔ برادری کے کسی خاص بزرگ کے یہاں مکتب خانہ ہوتا تھا جہاں سبھی خاندانوں کے لڑکے ایک ساتھ تعلیم پایا کرتے تھے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد عموماً ایک ہی دفتر میں سرکاری ملازمت کے مختلف درجوں پر فائز ہوجاتے تھے اس طرح برادری بھر کا ایک مشترک معیار تھا۔ ایک عام تہذیب رائج تھی، لوگ ایک دوسرے کے شریک حال رہتے تھے اور محض رسمی حیثیت سے نہیں بلکہ لفظ کے صحیح معنوں میں برادری قائم تھی۔ لیکن اب حالات بالکل بدل گئے ہیں، نہ تعلیم ہی کا کوئی ایک معیار ہے اور نہ کسی پیشہ ہی پر کسی کا کوئی اجارہ باقی ہے۔ انگریزی حکومت نے ایک حد تک اندر ترقی کے دروازے سبھی پر یکساں کھول دیے ہیں، مگر جہاں پہلے عزت کی جگہوں پر آپ کا بلامقابلہ داخلہ ہوجاتا تھا وہاں اب کڑے مقابلے کے بعد بار ملتا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ہم کو تبدیلی حالات کی شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور شکایت سے کچھ نفع بھی نہ ہوگا۔ اس لئے اس وقت ہمارا فرض یہ ہے کہ موجودہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے اور جس طرح ممکن ہو ناموافق حالات میں بھی اپنا سر اونچا رکھنے کا تہیہ کرلیا جائے۔

اس وقت بھی کایستھ ذہنی اور تعلیمی ترقی کے میدان میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ تعلیم کے لحاظ سے صوبے میں انکا نمبر اول ہے، دوسرے فرقوں کے مقابلے میں کایستھوں میں تعلیم نسواں کی حالت بھی اچھی ہے۔ آج بھی ملک وصوبے کی اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات مقابلہ میں پاس ہونے والے طالبعلموں میں ان کی خاصی تعداد ہوتی ہے۔ آج بھی ہمارے غریب بھائی جس طرح سے ہوسکتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے تمام ذرائع سے جو ملک میں میسر ہیں فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اور گو بعض محکموں میں ہمارے ساتھ خاص تعصب برتا جاتا ہے لیکن جہاں کہیں کھلے مقابلے کا موقعہ ملتا ہے ہمارے نوجوان روزافزوں افلاس کے باوجود بھی اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیتے ہیں۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے اپنے مستحق اور ذہین نوجوانوں کے راستے میں سہولت پیدا کرنے کا کوئی خاص انتظام نہیں کیا ہے۔ بزرگ قوم منشی کالی پرشاد کل بھاسکر نے کایستھ پاٹ شالہ قایم کرکے قوم پر ایک احسان عظیم کیا تھا، اس وقت بھی ان کے فیض کا سلسلہ روزافزوں ترقی کے ساتھ جاری ہے سیتاپور ٹرسٹ کے بانی ٹھاکر بشیشر بخش سنگھ صاحب نے بھی ہزارہا روپیہ کے وظیفے جاری کرکے سیکڑوں نوجوانوں کو تکمیل تعلیم کا موقعہ دے رکھا ہے، اور بھی کئی مقامات میں کایستھ اسکول قائم ہیں۔ دو ہی سال ہوئے کہ کانپور میں ایک بزرگ منشی ہرسہائے

صاحب کی فیاضی کی بدولت ایک اسکول قائم ہوگیا ہے جو عنقریب ہی ہائی اسکول ہو جائے گا۔ بعض دیگر مقامات میں بھی کایستھ اسکول اور مدرسے قائم ہیں، لیکن موجودہ ضروریات اس بات کی مقتضی ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کو ملک کے نظم و نسق میں اعلیٰ ترین مراتب تک پہونچنے کے قابل بننے کا موقع دیا جائے۔ بی۔اے اور ایم۔اے تک تو ہمارے طالب علم مر کھپ کر کسی نہ کسی طرح پہونچ ہی جاتے ہیں، لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس کے آگے ترقی کرنے کی کیا سہولتیں موجود ہیں؟ احاطۂ بمبئی و دکن میں ایک ہندو ایجوکیشن فنڈ موجود ہے جس نے سیکڑوں ذہین مگر غریب طالب علموں کو بیش قرار وظائف دیکر انگلستان و ممالک غیر میں جاکر تکمیل تعلیم کا موقعہ دیا ہے۔ لطف یہ کہ اس فنڈ کو زیادہ تر معمولی حیثیت کے محبان قوم نے جاری کیا ہے۔ عموماً ۲ ۲ دو دو سو اور پانچ پانچ سو روپیہ کے معمولی عطیات سے اس فنڈ کا سرمایہ قائم ہوا ہے۔ یہ ٹرسٹ مستحق طلبا کو ممالک غیر میں جاکر تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لئے ۴ چار فیصدی سود پر قرض حسنہ دیتا ہے۔ آپ یہ سنکر خوش ہوں گے کہ ابتک اس کی امداد سے ۹۳ ترانوے طالب علم غیر ممالک میں تکمیل تعلیم کا موقع پا چکے ہیں ان میں سے ۳۲ بتیس نوجوان انڈین سول سروس میں داخل ہو چکے ہیں۔ کیا اس قسم کا فنڈ ہمارے صوبہ میں بھی غریب مگر ہونہار طالبعلموں کی امداد کیلئے قائم ہو سکتا ہے؟ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد ابتک اصلی کام کی بہ نسبت نمایش کے زیادہ عادی ہیں اور لاکھوں روپیہ عمارتوں پر خرچ کرنا اور ایک ہی قسم کے دوسرے اسکول اور کالج کھولنے میں اپنی تمامتر قوت صرف کر دینا پسند کرتے ہیں، لیکن ترقی کے نئے راستے پیدا کرنے کی کوئی فکر نہیں کیجاتی۔ اعلیٰ یونیورسٹی تعلیم حاصل کرنے کا ہمارے صوبہ میں کافی انتظام ہے اس لئے کیا اچھا ہو اگر کایستھ پاٹ شالا کالج کو مدرسوں اور اسکول ماسٹروں کے لئے ٹریننگ کالج بنانے کی کوشش کی جائے، اس کے لئے گورنمنٹ ضروری امداد بھی دے سکتی ہے۔

سرکاری ملازمت کے علاوہ دیگر پیشوں کے لئے خاص تربیت حاصل کرنے کے ذرائع معدوم نہیں تو محدود ضرور ہیں۔ حالانکہ جس طرح سرکاری دفتروں میں کایستھوں کا اب کوئی اجارہ نہیں رہا اُسی طرح دوسرے پیشوں کے دروازے بھی اب کسی پر بند نہیں رہے۔ پھر کیوں نہ ہمارے فیاض طبع اور ہمدرد بزرگ نوجوانان قوم کو کسب معاش کے دوسرے ذرائع سے فائدہ اُٹھانے کی عملی ترغیب دیں؟ میں دیکھتا ہوں کہ گورنمنٹ نے مختلف صنعت و حرفت کے جو اسکول صوبے میں قائم کئے ہیں اُن سے ہمارے نوجوان برابر فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ لیکن یہ ذرائع کسی طرح کافی نہیں کہے

جا سکتے ۔ ایسی صورت میں ہماری قومی تعلیم گاہوں کے منتظمین کو جلد سے جلد مختلف پیشوں کے لئے ٹریننگ کلاسز کھولنے کا انتظام کرنا چاہئیے ۔

میں احباب کے سامنے کوئی تنگدلی کا معیار پیش کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اس وقت ملک کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم سب فرداً فرداً اپنی اپنی جگہ پر خود کو مادر وطن کا فرزند، اس عظیم الشان ملک ہندوستان کا باشندہ، اور ایک مشترکہ تہذیب و تمدن کا وارث سمجھیں۔ اور فرقہ وارانہ جذبات کو اپنے دل و دماغ پر حاوی نہ ہونے دیں۔ لیکن ترقی اور تنظیم کے لئے ہر حالت میں ہندو جیسی کثیر التعداد قوم کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کرنا ہوگا، اور چونکہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ہمارے ملک میں تقسیم ذات کا سلسلہ ہنوز باقی ہے اس لئے کیوں نہ اس تقسیم سے ہم اپنی مجموعی اور انفرادی تنظیم میں ایسا کام لیں جو حسب حال زمانہ ہو۔ اگر سب قومیں اور فرقے اپنی اپنی حالت کی اصلاح و درستی کی فکر کر لیں تو مجموعی حیثیت سے ملک کے لئے اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے؟

اصلاح تمدن (سوشل ریفارم) کے میدان میں تو فرقہ وارانہ جد و جہد کے بغیر آپ مروجہ برائیوں کو دور ہی نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہر فرقے میں چند خاص نقائص داخل ہو گئے ہیں جن کی قرار واقعی اصلاح کسی عام تحریک کے ذریعہ آسان نہیں ہے، اس کے لئے آپ کو مجبوراً فرقہ وارانہ تحریکوں کا سہارا لینا ہوگا، جس طرح آپ کو خاص خاص بیماریوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ اسپتال قائم کرنا پڑتے ہیں اسی طرح مختلف فرقوں کے خاص خاص عیوب دفع کرنے کے لئے آپ کو علٰحدہ علٰحدہ کوششیں کرنا پڑیں گی۔ قرار دادہی کی رسم کو لے لیجئے، ہر ذات میں اس کی خاص صورت ہے، چنانچہ خود کائستھوں کے بارہ فرقوں میں کئی فرقے ایسے ہیں جہاں اس سلسلے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ مثلاً ماتھر صاحبان اور بھٹناگر صاحبان میں اس کے متعلق کوئی قابل ذکر مجبوری نہیں ہے، لیکن سکسینہ صاحبان و سریواستو صاحبان کی حالت بہت دردناک ہے، ان کے یہاں اس میں بہت کچھ افراط تفریط برتی جانے لگی ہے۔ نگم صاحبان میں بھی کچھ دقت ہے لیکن سریواستو اور سکسینہ صاحبان کے یہاں تو نقد کی صورت میں رقم کثیر کا مطالبہ ایک معمولی بات ہے۔ اور یہ عیب اس حد تک ترقی کر گیا ہے کہ حیا و شرم کو بھی اب اس میں کوئی دخل باقی نہیں رہا، ایک رسم سی پڑ گئی ہے جو سوسائٹی میں شرم یا اعتراض کی بات نہیں سمجھی جاتی۔ اس کے متعلق بیسیوں کانفرنسیں ہو چکی ہیں، صد ہا ریزولیوشن پاس ہو چکے ہیں لیکن ہنوز روز اول ہے۔ آخر اس کی کیا

وجہ ہے کہ ہم اب تک اِس عیب کو دُور نہیں کر سکے؛ اور گو سبھی حضرات اس کے مظالم سے واقف ہیں لیکن رائے عامہ نے ابھی تک اس رسم کو زندہ رہنے دیا ہے، اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ غور کرنے کے لئے سب سے پہلے آپ کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ کالستھوں کی کیا افتادِ طبیعت ہے اور اُن کا فطری رجحان کس طرف ہے؛

کسی قوم کے رہنما اپنی اصلاحی تدبیروں میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ اُس کی ذہنی خصوصیات کو بخوبی سمجھ لیں۔ جہاں تک کالستھوں کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ درباری زندگی لبسر کرنے کی بدولت بیجا نمود و نمائش کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہماری برادری میں کبھی پنچایت کا طریقہ رائج نہیں رہا جس سے ہم کو دوسروں کے تعمیل حکم کی عادت پڑ جاتی۔ اسلئے کانفرنسوں کے پاس شدہ دستور العمل کی پابندی کالستھوں کو شاق ہوتی ہے وہ اپنی خودرائی کے زعم میں کسی ضابطہ کی پابندی اپنے خلاف شان سمجھتے ہیں، روز افزوں افلاس کی وجہ سے ہم کو فوری فوائد سے دست بردار ہونے میں بھی پس و پیش رہتا ہے۔ اور شادی کے موقعوں پر خرچ کرنے کی قابلیت نہ ہونے پر بھی لوگ اپنے اپنے خاندانی وقار کو قائم رکھنے کے لئے اپنی حیثیت سے زیادہ روپیہ صرف کرنے کے عادی ہیں۔ ایسی صورت میں جس قدر رقم بھی والی دختر سے مل سکے اس کے حاصل کرنے میں کیا تکلف ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جلسوں میں بیٹھکر اس پر کچھ ہی کیوں نہ کہا جائے لیکن جو صاحب اپنی جگہ پر اس رسم کی مخالفت میں عملی حیثیت سے کوئی نمایاں طریقہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی نیک نفسی کی عام طور پر تعریف ہونے کے بجائے درپردہ اُن پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں ہوتی ہیں اور اکثر فرضی الزامات لگانے میں بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ میری ذاتی رائے اور میرا ذاتی عمل اس مد میں یہ ہے کہ والیِ طفل کی حیثیت سے کسی قرارداد کا طے کرنا میرے نزدیک نہ صرف خودداری کے خلاف بلکہ انتہائی ذلت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر شریف آدمی کے لئے دوسروں کے سامنے دست سوال بڑھانے سے زیادہ ذلیل اور کوئی بات نہیں ہو سکتی ــ والیِ دختر کی حیثیت سے قرارداد کی ذلت کے بعد تکمیلِ معاہدہ کے علاوہ کسی مزید خدمت کا مجھ میں حوصلہ باقی نہیں رہ سکتا ہے۔ قرارداد کی عدم موجودگی میں ہر ممکن خدمت کے لئے حاضر رہنا فرض ہوتا ہے۔ غرض اس بارے میں میں کسی پیمانہ کے مقرر کرنے کے خلاف ہوں۔ آپ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اب تک بیسیوں دفعہ کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں تعین رسمیات کی کوشش ہو چکی ہے اور شادی بیاہ کے بہت سے دستور العمل بنکر پاس ہو چکے۔ لیکن ابھی تک اِن مقدس تجویزوں کی کماحقہ تعمیل کبھی نہیں کی گئی۔ درحقیقت میری رائے

میں جب تک اولاد کی شادی کا فرض والدین کے ذمّے رہیگا اُس وقت تک والیٔ طفل اور والیٔ دختر دونوں اِن تقریبات کے موقعوں پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہماری ناکامیابی کا یہی اصلی باعث ہے لیکن ابھی ایک عرصۂ دراز تک اس کی امید رکھنا فضول ہے کہ ہمارے لڑکے لڑکیاں اپنی شادیاں خود کریں۔ تاہم ---- کایستھوں میں اب صغرسنی کی شادی کا رواج باقی نہیں رہا ہے اس لئے ہمارے نوجوان اس بارے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے نوجوانوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں، اس لئے اگر ہمارے نوجوان بھی ذرا توجہ کریں تو یہ رسم بد بڑی آسانی سے بند ہو سکتی ہے۔ کیا کایستھ نوجوانوں سے عموماً اور سریواستو نوجوانوں سے خصوصاً میں اپیل کر سکتا ہوں کہ وہ اس رسم کے خلاف جہاد برپا کرکے اس کو قطعی مسدود کرنے کا تہیہ کر لیں؟ میں نے سُنا ہے کہ فتحپور میں بعض بزرگوں نے برادری کے غیر شادی شدہ نوجوانوں سے اس قسم کا عہد لینے کی کوشش شروع کر دی ہے میں اِس اخلاقی جرأت پر ان عزیزین کو مبارکباد دیتا ہوں اور نوجوانانِ قوم سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے والدین کو کم سے کم اتنا ضرور مجبور کر دیں کہ ان کا بیاہ طے کرتے وقت کوئی قرارداد طے نہ کیا جائے۔ اگر لڑکے اپنے والدین سے صاف کہدیں کہ قرارداد کا مطالبہ ہونے کی صورت میں وہ شادی کرنے پر رضامند نہ ہونگے، تو مجھے یقین ہے کہ یہ مذموم رسم خودبخود بند ہو جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی چڑھاوے کی رسم کو بھی نمود و نمائش سے معرّا کرنا پڑیگا کیونکہ درحقیقت اِن دونوں رسموں میں تعلق باہمی ہے۔ اگر ایک طرف قرارداد پر زور دیا جاتا ہے تو دوسری طرف سے چڑھاوے میں نمود و نمائش کا مطالبہ ہوتا ہے۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میں خود تعین رسمیات کا قائل نہیں ہوں لیکن اگر احباب کوئی خاص پیمانہ قائم کرکے اس پر عملدرآمد کرا سکیں تو اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک قرارداد کی رسم کا سب سے زبون پہلو والیٔ دختر کی زیرباری کے علاوہ یہ بھی ہے کہ اس کی موجودگی میں ہم لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر اتنا خرچ نہیں کر سکتے ہیں جتنا ہم لڑکوں پر خرچ کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ماتھر صاحبان کے یہاں جہاں یہ مذموم رسم رائج نہیں ہے لڑکیوں کی تعلیم پر لڑکوں کے برابر خرچ کیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج اُن کے یہاں عورتوں کی حالت کایستھوں کے تمام دیگر فرقوں سے بہتر ہے۔ اور اُس کا اثر اُن کی اولاد پر نمایاں طور پر ظاہر ہو رہا ہے۔

تعلیم نسواں کا مسئلہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے، آنیوالے دور میں کوئی قوم جو عورتوں کے لئے

[illegible]

تعلیم و ترقی کے پورے ذرائع ہم نہیں پہونچائے گی ترقی کے میدان میں نظر نہیں آئے گی۔اس بارے میں ہم کو اپنی معاشرت میں اہم تبدیلی کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔آپ کو معلوم ہے کہ نئے آئین میں عورتوں کو بھی مردوں کے برابر ہی حقوق ملنے والے ہیں۔ہندوستان کی موجودہ تنزلی کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ملک کی نصف آبادی ہمارے مشاغل و ضروریات میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹا سکتی ہے۔گذشتہ جنگ عظیم کے بعد انگلستان اور تمام دیگر ممالک یورپ میں زندگی کی کوئی شاہراہ ایسی باقی نہیں بچی جس میں عورتیں مردوں کے پہلو بہ پہلو مصروف کار نہ ہوں۔ تمام مغرب میں کوئی شعبہ نہیں ہے جس میں عورتوں نے کارہائے نمایاں انجام نہ دیے ہوں۔ ہندوستان میں بھی آیندہ وہی قومیں ترقی کریں گی جن کی عورتیں تعلیم سے بہرہ ور ہونگی۔اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عورتیں کاروبار خانگی سے بے نیاز ہو جائیں۔لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ پکانے اور رینددھنے کے سوائے ہماری خاتونیں دنیا کا اور کوئی کام ہی نہ کر سکیں۔میرے خیال میں لڑکا ہو یا لڑکی محنت کی عظمت دونوں کے ذہن نشین ہونا چاہیئے۔اس کے بغیر جسمانی تندرستی بھی قائم نہیں رہ سکتی ہے۔اور تندرستی کے بغیر دنیا کا کوئی کام انجام نہیں پا سکتا ہے۔تعلیم اور تندرستی دونوں کی خاطر ہم کو مروجہ رسم پردہ کی بیخکنی کرنا پڑے گی۔آپ دیکھیں کہ افغانستان جیسے پس ماندہ ملک میں اس بارے میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی ہے، اور ایران، مصر اور ترکی میں تو عورتیں ہر حیثیت سے مردوں کے برابر ہو گئی ہیں۔بہر حال روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہونے کی حیثیت سے کایستھوں کو افراط تفریط سے بچتے ہوئے اس بارے میں ضروری پیش قدمی کرکے ملک کے سامنے ایک قابل تقلید نمونہ پیش کرنا چاہیئے۔مروجہ پردہ میں جس قدر اصلاح یا کمی ہو سکے اس کا نتیجہ ہمارے حق میں اچھا ہی ہوگا۔اس کی بدولت ہماری لڑکیوں کا معیار قابلیت اور ہماری عام معاشرت میں ترقی ہونا لازمی ہے۔اور بالآخر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ قرار داد کی رسم بھی اس سے خود بخود مٹ جائیگی۔انسداد قرارداد کے لئے ایک مؤثر کوشش یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ لوگ ایسی شادیوں کی شرکت سے جن میں قرارداد ہوا ہے انکار کر دیں۔

آپ کو اپنے نوجوانوں کی صحت و تندرستی کی بھی خاص نگرانی رکھنا چاہیئے۔اپنے اپنے حلقۂ اثر میں ہم کو نوجوانان قوم کو جسمانی ورزش کرنے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ہر جگہ اکھاڑے اور ورزش خانے (Gymnasium.) قائم کیجئے۔بچوں کو مردانہ کھیل کود کی طرف راغب کیجئے تاکہ دماغی ترقی کے ساتھ جسمانی حیثیت سے بھی وہ کارزار زندگی میں مردانہ وار حصہ لے سکیں۔علمی ڈگریوں کے

ساتھ فنونِ لطیفہ کے وسیع و دلکشا میدان میں بھی ہمارے نوجوانوں کو اپنی قابلیت کا سکہ بٹھانا چاہیئے۔ غرض جس طرح ممکن ہو ہمکو زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبہ میں اپنی اہلیت اور لیاقت بڑھانا چاہیئے۔ تاکہ ہم اپنی ذہانتِ طبع اور قوتِ عمل سے نہ صرف اپنے طبقے بلکہ تمام ملک کے لئے باعثِ فخر ہوں۔ اور جس طرح سے کایستھ اگلے زمانے میں معزز و ممتاز رہے ہیں آیندہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ ہر فن اور ہر شعبہ میں داخل ہوکر ہم کو نام و نمود حاصل کرنا چاہیئے۔ مراسمِ قبیحہ کی بیخکنی کرکے ہم کو ضروریاتِ زمانہ کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا چاہیئے۔ شمشیر ہو یا قلم، دستکاری ہو یا صنعت و حرفت، تجارت ہو یا ادبی خدمت ہر میدان میں امتیاز و خصوصیت حاصل کئے بغیر ہم نہ اپنے ملک ہی کے لئے مفید ہوسکتے ہیں اور نہ اپنے واسطے ہی نیک نامی کا باعث۔

محض کانفرنسیں منعقد کرنے اور ردّ و کد و غور و فکر کے بعد چند رزولیوشن پاس کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ یہ کانفرنسیں کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہوں، ریزولیوشن کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں جبتک ہم لوگ فرداً فرداً اپنی ذاتی ذمہ داریاں محسوس نہ کریں گے، جبتک ہم میں ہر شخص قومی فلاح و بہبودی کی خاطر کچھ نہ کچھ قربانی پر تیار نہ ہوگا، جبتک ہر رکنِ قوم باہمی صلاح و مشورہ کی وقعت قائم رکھنے کا تہیہ نہ کریگا، جبتک ہر شخص قومی رہنماؤں اور قومی جلسوں کا احترام کرنے کا پختہ ارادہ نہ کریگا جبتک ہر ممبر مقتضائے وقت کے بموجب ذاتی حیثیت سے اصلاح کے کام کو آگے بڑھانے پر مستعد نہ ہو جائیگا، اُس وقت تک ہرگز ہرگز بھی خواہانِ ملک اور خیر خواہانِ قوم کا اصل مقصد و مدعا حاصل نہ ہوگا۔

(از جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا)

میر غلام حسن متخلص بہ حسن میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد ہرات کے رہنے والے تھے۔ میر امامی ہروی آپ کے جدِ اعلیٰ تھے انقلابِ زمانہ کی وجہ سے اپنا اصلی وطن چھوڑ کر پرانی دہلی میں سکونت اختیار کی۔ چنانچہ میر ضاحک بھی دہلی میں پیدا ہوئے اور میر حسن بھی اسی خاکِ پاک سے اٹھے۔

آپ خوش مزاج اور شیریں زبان تھے۔ تمام تذکرہ نویسوں نے آپ کی تعریف و توصیف کی ہے اور کسی قسم کا کوئی الزام آپ پر عاید نہیں کیا۔ آپ کو لڑکپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ آپکی فارسی قابلیت مسلم ہے، کیونکہ آپ کا تذکرۃ الشعراء اور آپ کے فارسی اشعار اس پر شاہد عادل ہیں۔ پہلے خواجہ میر درد اور اپنے والد سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ بعد ازاں میر ضیاء الدین ضیا سے اصلاح لینے لگے۔ اور مرزا سودا سے بھی بعض غزلوں پر اصلاح لی۔ اس بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں۔ "اصلاحِ سخن از میر ضیا سلمہٗ گرفتم لیکن طرز و شاں از من کما حقہٗ سرانجام نیافت برقدم دیگر بزرگاں مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر تقی پیروی نمودم" اگرچہ آپ نے مشاہیر اساتذہ سے اصلاح لی لیکن درحقیقت میر حسن کی استادی کا فخر میر ضیا کو حاصل ہے۔ مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ "میر ضیاء الدین ضیا استاد میر حسن شاگرد میر تقی میر ...... میر حسن بسیار ثناخواں و معتقد او بود" آپ کی تصانیف میں سے دیوانِ حسن جو جملہ اقسام سخن پر مشتمل ہے اور مثنوی بدر منیر اور تذکرۂ شعرائے ریختہ مشہور اور موجود ہیں۔ اگرچہ ہمکو دیوان کا انتخاب جو حسرت موہانی نے کیا ہے اور اپنے مطبع میں چھاپا ہے فی الحال دستیاب ہو سکا۔ اس منتخبہ دیوان میں تقریباً گیارہ سو اشعار صرف غزل کے ہیں۔ مثنوی بدر منیر اور گلزار ارم دونوں عمدہ چھپی ہوئیں ہمارے پاس موجود ہیں کہتے ہیں کہ آپ نے گیارہ مثنویاں تحریر فرمائی ہیں لیکن وہ سب کی سب ہماری نظر سے نہیں گذریں۔

آپ سنہ ۱۱۴۰ ہجری میں پرانی دلی کے محلہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے اور عقب باغ نواب قاسم علی خاں واقع محلہ مفتی گنج لکھنؤ میں وفات پائی۔ بقول مصحفی آپ نے ۶۰ سال کی عمر میں سنہ ۱۲۰۱ھ میں اس دارِ فانی سے رحلت کی چنانچہ حسب ذیل تاریخ بھی کہی ہے۔

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں ۔۔۔۔۔ رو ازیں گلزار رنگ و بو بتافت

بسکہ شیریں بود نطق ش مصحفی "شاعر شیریں زباں" تاریخ یافت

یہ کہنا بھی یہاں نامناسب نہ ہوگا کہ میر حسن دلی چھوڑ کر فیض آباد گئے اور بعد ازاں لکھنؤ میں مقیم ہو گئے جہاں انہوں نے بڑی شہرت پائی اور نواب سالار جنگ نیر ان کے بیٹے نواب مرزا نوازش علی خاں صفدر جنگ کی مصاحبت میں عزت کیساتھ زندگی بسر کی۔ آپ کے تین بیٹے تھے۔ میر مستحسن خلیق، میر احسن خلق، اور میر محسن محسن، اور آپ کے پوتے میر انیس کو کون نہیں جانتا جنہوں نے صنفِ مرثیہ کو کمال کے درجہ پر پہونچایا

کلام پر تبصرہ

حسن کی غزلیں اپنی سادگی بیان کے لحاظ سے ضرور قابلِ تعریف ہیں لیکن آپ کے یہاں بلند خیالی بالکل نہیں پائی جاتی۔ وہی معمولی وصل و ہجر کے مضامین ہیں۔ انمیں بھی کوئی جدت نہیں البتہ طرز ادا خوب ہے مثنوی گوئی میں تو یقیناً آپ بے نظیر ہیں اور اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ لیکن جہاں تک غزل کا تعلق ہے ہم حسن کو دوسرے درجہ کے شعرا میں شمار کرنے پر مجبور ہیں۔ اور چونکہ آپ مثنوی گوئی میں بڑے بڑے استادوں سے بھی گوئے سبقت لیگئے ہیں اس لئے بلحاظ شاعری آپ کو اوّل درجہ کے شعرا میں داخل کرنا لازمی ہے۔

آپ کی نسبت جو رائے بعض تذکرہ نویسوں نے ظاہر کی ہے اسکو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :-

میرزا علی لطف اپنے تذکرہ گلشنِ ہند میں لکھتے ہیں۔ "اقسامِ علم سے تو جمیع علوم میں انہیں اقرار ہیچدانی ہے، ہاں مگر اشعار ہیں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے قریب آٹھ ہزار بیت کے انواع نظم میں دیوان انکا ہے۔"

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ گلشنِ بیخار میں تحریر فرماتے ہیں۔ "سالم فکرت سلیم فطرت است و بر اصناف سخن فی الجملہ قدرتے داشتہ لاسیما مثنوی نیکو میگفتہ مثنوی سحر البیان کہ مشہور بہ بدر منیر است شہرت تمام دارد قطع نظر از پالغز پائے شاعری بمحاورۂ عوام نگفتہ بلکہ داد بلاغت دادہ"

آبِ حیات میں آزاد کہتے ہیں کہ "ان کے اشعار غزل کے اصول میں گلاب کے پھول ہیں اور محاورات کی خوش بیانی مضامین عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوتی ہے۔"

خود حسرت موہانی کا ارشاد ہے کہ "حسن کا طرزِ کلام زیادہ تر میر اور کمتر سودا کے انداز شاعری سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ بعض قدیم متروکات کی سادگی اور شیرینی حسن کے دیوان میں بھی وہی کیفیت پیدا کرتی ہے جس کی بہار میر کے کلام کی جان ہے۔ فارسی ترکیبوں کے ترجمے ان کی غزلوں میں بھی اسی شان میں نمودار پائے جاتے ہیں جس کا جلوہ سودا اور قائم کی سحر طرازیوں کیساتھ مخصوص ہے۔ اصنافِ سخن

میں سے میر حسن قصیدے کے مرد میدان نہ تھے البتہ غزل سرائی میں اُن کا صاحب امتیاز اور مثنوی گوئی میں یکتائے زمانہ ہونا قطعی طور پر ثابت ہے۔"

ہمارے نزدیک حسن میں نہ میر جیسا عمق ہے اور نہ سودا جیسی بلند آہنگی۔ درد کے تصوف اور تغزل کا بھی آپ کے یہاں پتہ نہیں۔ اگر آپ کو بلحاظ سادگی اور صفائی بیان کسی شاعر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے تو وہ میر اثر برادر خواجہ میر درد ہیں۔ یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ میر سوز کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے ہیں جو معمولی خیالات اور روزمرہ کی باتیں اثر اور سوز کے یہاں ہیں وہی حالت میر حسن کی ہے۔ آپ کا پایۂ غزل گوئی بھی ہرگز اثر اور سوز سے بڑھکر نہیں ہے۔ آپ جو لکھتے ہیں وہ عاشقانہ رنگ میں لکھتے ہیں اور عوام کے خیالات ظاہر کرتے ہیں البتہ اس کو اس طرح لکھتے ہیں کہ وہ معمولی باتیں اجیرن ہونے کی بجائے دلچسپ معلوم ہوتی ہیں اور اصل پوچھو تو یہی خوبی میر حسن کی خاص ہے۔ حسن بیان ہی کا نام شاعری ہے اور یہ بات آپ میں موجود ہے۔

آپ کے کلام میں متروکات کی کافی تعداد ہے اور یہ بات زمانہ کے لحاظ سے ہونی بھی چاہئے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں۔

انہوں کا بجائے اُن کا۔ کوئی کو کُئی لکھا ہے ع

یوں ہی تڑپ تڑپ کر کوئی دم میں مر رہے گا

دوانے بجائے دیوانے۔ جاگہہ بجائے جگہ۔ ٹک بجائے ذرا سے۔ تاسحر بجائے سحر تک، میں بجائے میں نے۔ نہیں رونے کا بجائے نہیں روؤں گا۔ میاں قطعی متروک ہے ع

تم نے ملنا بھی اب اس دل سے میاں چھوڑ دیا

پرکھیا بجائے خیال۔ زور بمعنی بہت۔ جنھوں کے جن کے۔ ہم پاس بجائے ہمارے پاس۔ آپی بجائے آپ ہی ع

بیچارہ اپنی جان سے آپ ہی گذر چلا

سمجیو بجائے سمجھیو ع

آساں نہ سمجھیو تم نخوت سے پاک ہونا۔

ایدھر بجائے ادھر۔ ماٹی بجائے مٹی۔ ہوجیو بجائے ہونا ع

ہوجیو کاش ایک بار وداع

پوچھیو بجائے پہنچیو۔ جی کرتا ہے بجائے جی چاہتا ہے۔ نت بجائے ہمیشہ۔ شب ہجراں کے نون کا اعلان اب کوئی نہیں باندھتا۔ شعر ؎

محشر کا بھی دن کم نہیں آفت سے ولیکن کرتی ہے قیامت شبِ ہجران بہت کچھ

بھر نظر بجائے نظر بھر ع

میں نے تو بھر نظر تجھے دیکھا نہیں ابھی

آپ نے بعض الفاظ غلط یا بیجا طور پر استعمال کئے ہیں مثلاً

تظلم کے معنی فریاد ہیں لیکن آپ نے بجائے ظلم باندھا ہے، شعر

قیامت مجھ پہ شب اس کا تظلم اور ترحم تھا کبھی تھیں گالیاں منہ پر کبھی لب پر تبسم تھا

ہوئی کو ہُئی باندھا ہے، شعر

اسکے کوچہ میں بھی رقت کم نہ ہوئی تیری حسن روتے روتے تو واں سے ایلچ یہاں رونے لگا

طَرَف کو طُرَف باندھا ہے، مصرعہ

اندنوں کیوں تو نے کم اس طرف کا جانا کیا

اغیاروں بجائے اغیار لکھا ہے، اس قسم کی جمع الجمع سے پرہیز ہی لازم ہے۔ ع

ہماری اور اس کی بات اغیاروں سے مت پوچھو

یکجہتی بجائے یک جہتی باندھا ہے، ع

کیونکہ یکجہتی سے اس بندہ کی مشہور ہے تو

آپ کے یہاں بعض فارسی ترکیب بھی بدنما معلوم ہوتی ہے، مثلاً

گرچہ یہ سچ ہے کہ حسینوں میں بہ از حور ہے تو

آپ کے یہاں بعض فارسی جمع مثل بتاں و رفتگان بغیر اضافت آئی ہیں۔ اگر اس قسم کی جمع اضافت کیسا تھ استعمال کی جائے تو آج کل بھی پسندیدہ ہے ورنہ متروک ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض فارسی الفاظ اور تراکیب خوب استعمال کی ہیں مثلاً گوش آشنا، شعر

بارے حسن کے نام کو وہ سنکے سوچ سوچ بولا کہ ہاں یہ نام تو ہے گوش آشنا

واشد بمعنی کھلنا، نہایت بمعنی انتہا،

ہر ایک بدایت کی نہایت ہے ولیکن اس عشق کے آغاز کا انجام نہ پایا

کم نگاہی، سعی بیجا، سرگرمِ ناز، تغافل شعار، دلِ خوں شدہ، گفت وشنید، شعر

کون کہتا ہے کون سنتا ہے اپنی گفت وشنید کر لیجے

محرومیِ طالع، گردِ کلفت وغیرہ وغیرہ۔ بعض اشعار آپ کے یہاں بھی رنگین ہیں، مثلاً

جب ہم ملے تھے اس سے تو کیسا تھا کیلا حرّافی اب تو اپنی جتانے لگا ہے کچھ

ذیل میں آپ کے بہتر منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں :-

گر کیجئے رقم کچھ تری وحدت کے بیاں کا تو چاہیئے خامہ بھی اُسے ایک زباں کا

وہ دن گئے کہ گلشن تھا بود و باش اپنا اب تو قفس میں بھولے نقشہ بھی گلستاں کا

تیرا حسن یہ رونا یوں ہی اگر رہے گا ظالم تو پھر کسی کا کاہے کو گھر رہے گا

جب سے جدا ہوا ہے وہ شوخ تب سے مجھکو شب آہ آہ کرنا اور زار زار رونا

محوِ خیال ہیں جو اس شوخِ کم نما کے درد و الم میں انکا ہے ننگ و عار رونا

خدا جانے کہ آخر رفتہ رفتہ حال کیا گذرے ہوا ہے بیطرح آنکھوں کو اب آزار رونے کا

یہ سب اپنے خیال خام تھے تم تھے پرے سب سے جو کچھ سمجھے تھے ہم تم کو سو وہ اپنا تو تم تھا

صبا کے ہاتھ خط اُس گلعذار کا پہنچا خزاں رسیدوں کو مژدہ بہار کا پہنچا

کسی نے بات کہی اور رو دیا اُس نے یہ حال اب دلِ زار و نزار کا پہنچا

یار بنوائے جو اپنا کوئی کاشانہ جدا کعبہ ویران ہو برباد ہو بتخانہ جدا

آغازِ محبت میں دیکھا تو یہ کچھ دیکھا کیا جانئے کیا ہوگا انجام مرے دل کا

مزا ہے استقامت سے مثالِ شمع مرجانا جہاں ثابت قدم رکھنا وہاں سر سے گذر جانا

کوئی دن کے ہیں مہماں اس چمن میں ایکدن آخر مثالِ نکہتِ گل شام جانا یا سحر جانا

دل کو صنم لیکے جدا ہو گیا اے مرے اللہ یہ کیا ہو گیا

ظاہر میں گو لکھا نہ لکھا خط تو کیا ہوا ہوتے ہیں کوئی دل سے فراموش آشنا

اظہار خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد ظاہر کا یہ پردا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

جاتا تھا اس کے کھوج میں میں بے خبر چلا بارے اُسی نے ٹوک کے پوچھا کدھر چلا

آشنا بیوفا نہیں ہوتا بیوفا آشنا نہیں ہوتا

ایسی ہی آہ باتیں اُس بیوفا نے چھیڑیں روتے ہی روتے جس میں روزِ وصال گذرا

حجاب عشق گر حائل نہ ہوتا تو ملنا یار کا مشکل نہ ہوتا

گل نام خدا اس کا رنگ ایسا جھمکتا تھا خورشید بھی دیکھ اُسکو آنکھ اپنی جھپکتا تھا

دامنِ صحرا سے اٹھنے کو حسن کا جی نہیں پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھکر

کیا مغرور اس کو آپ اپنا حال کہہ کہہ کر مجھے آتا ہے غصہ اپنی نادانی پہ رہ رہ کر

قسمت نے ایسا دور ہی پھینکا ہمیں کہ ہم
پھر جیتے جی پہنچ نہ سکے اپنے یار تک

کیسا وصال کس کا فراق اور کہاں کا عشق
تھی عالم جوانی کی بس یہ بھی اک ترنگ

مانند حباب اس جہاں میں
کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

آن کر غمکدۂ دہر میں جو بیٹھے ہم
شمع ساں اپنے تئیں آپ سے کھو بیٹھے ہم

صیاد کی مرضی ہے کہ اب گل کی ہوس میں
نالے نہ کرے مرغ گرفتار قفس میں

اک دم بھی ملا نہ ہم کو قرار
اس دل بیقرار کے ہاتھوں

ہر چند حال اپنا رو رو اسے سنایا
پر اس نے سن کے باتیں سب ٹالدیں ہنسی میں

صیاد ہم کو لے تو گیا لالہ زار میں
پر وہ قفس کا پر نہ اٹھایا بہار میں

دروازہ گو کھلا ہے اجابت کا پر حسن
ہم کس کس آرزو کو خدا سے طلب کریں

اسکی جب بزم سے ہم ہو کے تنگ آتے ہیں
اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

روٹھا کرے وہ کیوں نہ کسی اور سے حسن
یہ سب بگاڑ چاہ کا ہے اور کچھ نہیں

دل کو کھویا ہے کل جہاں جا کر
جی میں ہے آج جی بھی کھو آؤں

ہم کو باور ہی نہ آتا تھا کہ مغرور ہے تو
اب جو دیکھا تجھے اللہ بہت دور ہے تو

قلق نہ جائے ہے دل کا نہ جی کی بیتابی
یہ کچھ بھلے نہیں آثار دیکھئے کیا ہو

کہا اک شخص نے اس سے کہ عاشق تیرا مرتا ہے
لگا کہنے کروں کیا میں گر اس کی یونہی آئی ہو

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو
کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو

تیرے ہمنام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں
جی دھڑک جاتا ہے میرا کہیں تو ہی نہ ہو

تھا دل میں جب تلک اس کا تصور تو خیر تھی
اب تو قدم وہ آگے بڑھانے لگا ہے کچھ

ہمدم نہ پوچھ مجھ سے غرض اک بلا ہے وہ
جور و برو ہے اسکے سو جانے کہ کیا ہے وہ

بیگانہ وار بھی نہ ملا ہم سے وہ کبھی
ہم سادہ دل یہ جانتے تھے آشنا ہے وہ

مجھ سے اب وہ نہ رہی اس بت عیار کی آنکھ
پھر گئی آہ زمانے کی طرح یار کی آنکھ

تھے ابھی تو پاس ہی اپنے قرار و ہوش و صبر
تیرے آنے سے بجانے وہ کدھر کو اٹھ گئے

شب ہجراں میں دل مت چشم کو دے رخصت گریہ
کہ اس آتش کی خاصیت ہے پانی سے دہکنے کی

ہم سے تو کسی چیز کی بنیاد نہ ہووے
جب تک کہ ادھر ہی سے کچھ امداد نہ ہووے

رہیے جس میں خطرہ صدا نیستی کا
بس اے زندگی ایسی ہستی سے گزرے

آتے تو ہم نے دیکھا شب وصل کو پھر آہ — معلوم بھی ہوا نہ کہ وہ رات کیا ہوئی

جو دوست ہیں تمہارے جانو ہو اُن کو دشمن — دیکھی سمجھ تمہاری بس ہم نے واہ اُلٹی

ہمیشہ ہنستے ہی تھے بولتے ہی تھے واللہ — وہ ایسی بات کہی کیا جو ناگوار ہوئی

کہتے تھے یار آوے تو کچھ دل کی کہئے بات — آیا وہ اس گھڑی کہ زباں جب اُلٹ گئی

کیا جانے کون آن کے گلشن سے پھر گیا — کچھ پھول پھول کر جو کلی پھر سمٹ گئی

اتنا نہیں کوئی کہ پکڑ آستیں مری — اُس سے کہے کہ تجھ پہ یہ مائل عزیز ہے

ہوتا اگر تو عہد میں یوسف کے اے عزیز — کرتا نہ منہ ادھر کو خریدار ایک بھی

نیکی بدی کا کوئی کسی کے نہیں شریک — جو اپنا اپنا نامۂ اعمال ہے سو ہے

صورت نہ ہم نے دیکھی حرم کی نہ دیر کی — بیٹھے ہی بیٹھے دل میں دو عالم کی سیر کی

مرنا مجھے قبول ہے اس کے فراق میں — ملنا نہیں قبول وساطت سے غیر کی

بیگانہ ہو سب سے پھر وہ آخر — جو کوئی کہ آشنا ہو تجھ سے

ہو کیوں نہ جہاں سے اسکا دل سرد — جس کا کہ جگر جلا ہو تجھ سے

مزے نہ دیکھے گئے ہم سے زندگانی کے — یوں ہی گذر گئے افسوس دن جوانی کے

سُنا نہ ایک بھی شب اس نے حالِ دل میرا — نصیب جاگے نہ افسوس اس کہانی کے

در در ہمیں پھرایا گھر گھر ہمیں جھکایا — بس تیری خوبی ہم نے اے روزگار دیکھی

ادنیٰ سے بھی پہنچتی ہے اعلیٰ کو منفعت — لاتے ہیں شہد و مشک کو اکثر پہاڑ سے

دی تھی یہ دعا کس نے مرے دل کو الٰہی — اجڑے یہ گھر ایسا کہ پھر آباد نہ ہووے

پھر پھر آئینے کو وہ دیکھنے لگتا ہے حسن — ایک دم آپ میں وہ شوخ جو پاتا ہے مجھے

شبِ وصلِ صنم ہے آج اے ہمدم کسی ڈھب سے — گریبانِ سحر کو ٹانک کھنا دامنِ شب سے

لگاتے ہی لب لب سے بس جی دیا — حسن اور لینے کے دینے پڑے

کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گذرتی — پر ایک جان تو ہے جس بن نہیں گذرتی

ساتھ دیکھوں ہوں کسی کے جو کسی دلبر کو — میں بھی جی رکھتا ہوں مجھکو بھی ہوس آتی ہے

آجا کہیں شتاب کہ مانند نقشِ پا — تکتے ہیں راہ تیری سرِ راہ میں پڑے

لا کے بچپن کیا ہمکو ترے عشق نے پال — ورنہ کس لطف سے ہم سوئے عدم رہتے تھے

پگوڈا

لفظ پگوڈا کے اشتقاق کی نسبت مختلف رائیں ہیں، بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ بت کدہ سے بگڑا ہوا ہے، بعض لفظ بھگوت کو اس کا مخرج سمجھتے ہیں، اگر لفظ پگوڈا کو پلٹ دیں تو "ڈگوبا" بن جاتا ہے۔ لنکا میں ڈگوبا مندر کو کہتے ہیں جس میں بدھ بھگوان کی مورتی ہو۔

جب پرتگیز جنوبی ہند میں وارد ہوئے تو انھوں نے پگوڈا نام ایک سکہ رائج پایا۔ یہ سکہ طلائی اور نقرئی دونوں ہوتا تھا۔ سونے کے سکے کو وراہا بھی کہتے تھے اور ہون بھی۔ وراہا اس لئے کہا جاتا تھا کہ وشنوجی کے سور کے اوتار کے مانند اس کے ایک جانب نقش ہوتا تھا۔ ہونا اس طرح سے بنا کہ سونا کے س کو ہ سے بدلا گیا۔ اس طرح سے اُردو کا محاورۂ "ہن برسنا" وجود میں آیا۔ صوبہ مدراس میں حسابوں میں تین سکے دکھلائے جاتے ہیں، کاس۔ فنام۔ پگوڈا۔ ان کا تناسب یہ تھا:

۸ کاس = ۱ فنام

۴۲ فنام = پگوڈا

واضح ہو کہ ۱۸۱۸ء تک یہ سکے جاری رہے اس کے بعد پرتگیزوں نے روپیہ کا سکہ جاری کر دیا۔ مدراس کی ٹکسال سے نکلے ہوئے پگوڈوں پر ایک طرف مندر کی شکل ہوا کرتی تھی اور اکبری ٹکسال کے سکے بھی اسی پگوڈا کے نمونے کے تھے، ان دنوں پگوڈا ساڑھے تین روپیہ کے برابر سمجھا جاتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی تک یہ پگوڈا جاری رہا حتیٰ کہ یہ محاورہ ہو گیا کہ جہاں سے روپیہ بکثرت مل سکے اسے "پگوڈا ٹری" یعنی پگوڈا کا درخت کہتے تھے، معنی یہ ہوئے کہ جب درخت کو ہلاؤ پگوڈے گرنے شروع ہو جائیں گے۔ یہی مراد "ہن برسنے" سے ہے۔ یہ محاورہ اس وقت بھی جاری ہے۔

۲۹۔ مارچ ۱۹۳۳ء کے اخبار اسٹیٹسمین (.Statesman) میں "پگوڈا ٹری" کے عنوان سے ایک نہایت دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت میں

ملازمان کمپنی کی تنخواہیں بہت قلیل ہوتی تھیں، اور ڈاکٹروں کی فیس بہت ہوتی تھی، علاج بھی ناممکن ہوتے تھے چنانچہ راقم مضمون لکھتا ہے کہ جان شور ۱۷۷۰ء میں جو بعد میں لارڈ ٹیجن ماؤتھ ہوئے معمولی کلرک کی حیثیت سے آٹھ پگوڈا ماہوار پر ہندوستان آئے تھے۔ نہ معلوم یہ رئیس زادہ نازونعم کا پلا ہوا اس قلیل مشاہرہ پر کیونکر اوقات بسر کرتا ہوگا۔

۱۷۸۰ء میں سر طامس منرو (Sir T. Munro) کیڈٹ (Cadet) کے عہدہ پر پانچ پگوڈا کی تنخواہ پر آیا تھا۔ پانچ پگوڈا ساڑھے سترہ روپیہ کے برابر ہوتے تھے۔ اِن دنوں پگوڈا آٹھ شلنگ کے برابر ہوتا تھا، البتہ مکان اس کو بلا کرایہ ملتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ دھوبی، نائی، نوکر کو تنخواہ دیکر اس کے پاس کپڑے اور کھانے کے لئے صرف ایک پگوڈا رہ جاتا تھا۔

سلک جواہر

درحقیقت نیک کردار وہی شخص ہے جو مصائب میں صابر رہے۔ اور خطا سے درگزر کرے۔

جو قوت بازو سے رزق طیب پیدا کرے، خدا اُسے دوست رکھتا ہے۔

اگر تمھیں اپنے پروردگار سے محبت ہے تو اپنے ہمجنسوں سے محبت رکھو۔

خیرات دافع بلیات ہے۔

مصیبت کے وقت اپنے بھائی کی مدد کرو، اور اگر وہ گم کردہ راہ ہے تو اُسے راہ راست پر لاؤ۔

بھوکے کو کھانا کھلاؤ۔ بیمار کی عیادت کو جاؤ اور قیدی کو رہائی دلواؤ اگر وہ بلا قصور قید ہے

دوسروں سے ان کی قابلیت کے مطابق گفتگو کرو۔

اعمال کی جزا و سزا نیت کے مطابق ہوگی۔

کوئی شخص حقیقی معنی میں سچا کہلانے کا مستحق نہیں جبتک کہ اسکے الفاظ۔ حرکات اور خیالات تینوں سچائی پر مبنی نہ ہوں۔

وہ حقیقی معنوں میں صادق ہے جو اپنے بھائی کی موجودگی اور غیر موجودگی میں یکساں حفاظت کرے۔

بچپن سے لیکر لب گور تک حصول علم میں مشغول رہو۔

مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پیشتر اس کی مزدوری ادا کردو۔

اُمراؤ جان ادا

(از مسٹر مدھو بہاری لال ایم۔اے)

مرزا رسوا کے اور کارناموں کے مقابلے میں امراؤ جان ادا کو ادب اُردو میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں مرزا صاحب نے "لکھنؤ کی ایک خواندہ طوائف کی دلچسپ سوانحعمری" اُسی کی زبانی بیان کرائی ہے۔ ناول کے شروع میں مرزا صاحب نے قصہ کی شان نزول کا ایک باب شامل کیا ہے اور اختتام پر چند صفحات بطور ریویو لکھے ہیں جس سے اِس کتاب کے محاسن پر کماحقہ روشنی پڑتی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس پر بحث کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امراؤ جان کا کردار لکھ دیا جائے۔

امیرن فیض آباد کے ایک شریف خاندان کی لڑکی تھی، کھلتی ہوئی چمپئی رنگت ناک نقشہ درست اور آنکھیں بڑی بڑی رکھتی تھی، اس کے ابا بہو بیگم صاحبہ کے مقبرے پر نوکر تھے۔ دلاور خاں نامی ایک کینہ پرور پڑوسی کو اُس کے والد سے رنجش تھی چنانچہ انتقام کی نیت سے ایک شام کو اس شخص نے امیرن کو بہانے سے اپنے پاس بلا لیا اور اپنے ایک ساتھی پیر بخش کے ہمراہ لکھنؤ جا کر اُسے خانم جان ایک طوائف کے ہاتھ سوا سو روپیہ کے عوض بیچ ڈالا۔ خانم نے امیرن کے بجائے اس کا نام امراؤ رکھ دیا، تھوڑے ہی عرصے میں امراؤ کے دل سے ماں باپ کی مفارقت کا خیال محو ہو گیا اور وہ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ خوشی سے زندگی بسر کرنے لگی۔ اس کے دل کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنے مقابلے میں دوسروں کی سرافرازی گوارا نہ کر سکتی تھی بلکہ خود ہر فن میں کامل اور ہر ہنر میں طاق ہونا چاہتی تھی چنانچہ ایک اور سہیلی خورشید جان نامی کی دیکھا دیکھی یہ بھی تھرکتی۔ یہ دیکھکر خانم نے ایک استاد اس کی تعلیم کے لئے مقرر کر دیا۔ چونکہ موسیقی سے اس کی طبیعت کو غیر معمولی نسبت تھی، اس لئے تھوڑے ہی عرصے میں اس فن کی ماہر ہو گئی۔ خصوصاً اُس کی سوز خوانی ایسی مشہور ہوئی کہ لکھنؤ کے بڑے بڑے رئیس سننے کے آرزو مند رہتے۔ اس نے فارسی کی کتابیں بھی پڑھیں، کریما، مامقیماں، محمود نامہ، آمدنامہ کے علاوہ گلستاں بھی دیکھی جس کے اکثر فقرے اور بیشتر اشعار نوک زبان تھے۔ غالباً ابتدائی تعلیم کے بعد ہی

اسے شعروشاعری کا شوق ہوا۔ موزونیٔ طبع کی بدولت عاشقانہ اشعار خوب کہہ لیتی تھی جن کی روانی، اور بامحاورہ ترکیب دلفریب ہوتی ہیں۔

اُمراؤ جان آزاد منش تھی، کسی قسم کی پابندی سے۔ اس کو خوشی حاصل نہ ہوتی تھی اسی لئے اس نے کسی کی ہوکے رہنا پسند نہ کیا۔ ایک رئیس نواب محمد علی نامی نے ایک مرتبہ اُسے اپنا پابند بنانا چاہا لیکن اُس نے صاف انکار کردیا اسی جوشِ آزادی نے اسے افلاس کی زندگی لبسر کرنے پر مجبور کیا۔ خانم کے احکام کی پابندیاں اس کے لئے بلائے جان تھیں لہٰذا وہ کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھی جس سے اُسے آزادی حاصل ہو۔ اُس نے دیکھا کہ خانم فیض علی کے سلسلے میں اس پر بے وفائی کا دھبّہ لگانا چاہتی ہے جو اس کے خلقی رجحانات کے خلاف تھا لہٰذا ایک رات خانم کے مکان کو خیرباد کہہ کے فیض علی کے ہمراہ روانہ ہوگئی

اس نے کبھی کسی کے احسانات فراموش نہیں کئے چنانچہ بوا حسینی کی وہ ہمیشہ احسانمند رہی نوابوں اور رئیسوں نے جو جو سلوک اس کے ساتھ کئے اُن کو بھی اس نے ہمیشہ یاد رکھا اور اپنے ملنے والوں سے کبھی بے اعتنائی سے پیش نہیں آئی، بلاشبہ شرافت کا برتاؤ کرتی رہی اور کبھی کسی کو یہ موقع نہ دیا کہ وہ اُسے ایک بازاری خودغرض یا حیلہ ساز عورت سمجھتا

بازاری عورتوں کے برعکس امراؤ جان آدا طبعًا ایک خوددار عورت تھی، وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا گدائی سے کم نہ سمجھتی تھی۔ اُسے ہمیشہ یہ خیال رہتا کہ اگر کسی سے سوال کیا اور اُس نے انکار کردیا تو بڑی شرمندگی اُٹھانی ہوگی، وہ ہر کس وناکس سے جلد بے تکلف بھی نہ ہوجاتی تھی، اس کا زیادہ وقت اس بات کے جاننے میں صرف ہوتا تھا کہ فلاں شخص کس قماش کا ہے، اس میں ذاتی لیاقت کتنی ہے۔ حسن اخلاق کیسا ہے اور اس کے خیالات واطوار کس قسم کے ہیں۔

اُمراؤ جان کی وضعداری میں شک نہیں۔ گوہر مرزا نامی ایک صاحب ایک ڈومنی کے بطن سے اور نہایت کمینی طبیعت رکھتے تھے مگر چونکہ آدا کو سب سے پہلے انھیں سے محبت ہوئی تھی اس لئے اس نے حتی الوسع زندگی بھر دوستی کا حق ادا کیا۔ چنانچہ اُن کے والد کے انتقال کے بعد وہ اونھیں روپیے پیسے سے بھی مدد دیتی رہی مگر اس کم ظرف شخص نے امراؤ جان کا ایک گرانمایہ اندوختہ بھی ہضم کرلیا مگر امراؤ کی شرافت دیکھئے کہ جب رسوا اُس سے پوچھتے ہیں کہ تمہاری کمائی کا ذخیرہ کیا ہوا تو وہ گوہر مرزا کا نام بھی اپنی زبان پر نہیں لاتی۔ فیض آباد میں اپنے بھائی اور ماں سے ملاقات ہونے کے بعد وہ اپنا قیام ٹھیک نہیں سمجھتی کیونکہ وہاں اس کی موجودگی اس کے خاندان کے لئے باعثِ شرم تھی

وہ اپنے کو ننگ خاندان سمجھتی تھی اِسی لئے اُس نے اپنا نام تک ظاہر نہ کیا۔

شومیِ تقدیر سے اِس سمجھدار عورت کو ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنا پڑی جو ہرگز اس کے شایانِ شان نہ تھا، تاہم وہ اپنے دل پر قابو، حسیاتِ نفس پر پوری قدرت اور اپنے خیالات پر پورا اختیار رکھتی تھی پیشہ کے اعتبار سے وہ زنِ بازاری تھی پھر بھی اس کے دل میں جذباتِ عالیہ کا دریا رواں تھا، اُسے اپنی ذلت کا بخوبی احساس تھا، گھر کی بی بیوں کا وہ ہمیشہ احترام کرتی تھی، آخر میں اُس نے لوگوں سے ملنا اور کمرے میں سر راہ بیٹھنا ترک کردیا اور چوک کی طرف نکاس کا راستہ بالکل بند کردیا، دوسری جانب کے دروازے سے خادم آیا جایا کرتے، عذاب و ثواب کے خیالات بھی مدنظر رہنے لگے اور وہ مذہبی اصول پر چلنے کی کوشاں ہوئی۔

اس ناول میں بالخصوص تین مقامات نہایت ہی لطیف ہیں۔ اول بسم اللہ جان کے عاشق زار مولوی صاحب کا قصہ، ان مولانا صاحب کا سن شریف ستر سے کچھ ہی کم ہوگا، نورانی چہرہ، سفید داڑھی، سر منڈا ہوا اس پر عمامہ، عبائے شریف، عصائے مبارک۔ ان کی صورت کو دیکھکر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ ایک چھٹی ہوئی شوخ، نوجوان رنڈی پر عاشق ہیں۔" اِس وضع قطع کے ساتھ آپ کے ہاتھ میں زیتون کی تسبیح رہتی اور اپنے بتِ طناز کے سامنے دوزانو مؤدب بیٹھکر حسن پرستی میں مشغول رہتے تھے۔ وفاشعار ایسے کہ دل وجان سے نثار رہتے، فرماں بردار ایسے کہ ایک روز لطف اندوز ہونے کے لئے بسم اللہ جان نے نیم پر چڑھنے کا نادری حکم صادر فرمایا، مولوی صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں تھر تھر کانپنے لگے" مگر حفظ مراتب اور پاسِ وفا مدنظر رکھکر مجبوراً درخت پر چڑھے اور پھننگ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ ادھر رحم طلب نگاہوں سے نیچے دیکھتے ہوئے اوپر چڑھتے جاتے تھے اور ادھر تماشائیوں کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے

دوسرے اُن مولوی صاحب کا قصہ ہے جن سے اُمراؤ کا پنور کی مسجد میں ملی، آپ جوان آدمی تھے، صورت بھی کچھ ایسی بُری نہ تھی، سانولی رنگت تھی، چہرے پر ہوتق پن سا تھا، سر پر لمبے لمبے بال تھے منہ پر داڑھی تھی مگر کچھ بے تکے پن کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی، مونچھوں کا بالکل صفایا تھا، تہمت بھی اونچی بندھی ہوئی تھی سر پر چھینٹ کی بڑی سی ٹوپی تھی جو سر کی پوری چوحدی کو ڈھانپے ہوئے تھی، بات کرنے کا عجب انداز تھا، منہ چلانے سے کھلتا تھا پھر بند ہوجاتا تھا۔ نیچے کا ہونٹ کچھ عجب انداز سے اوپر کو چڑھ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ نکہ دار داڑھی بھی عجب انداز سے ہل جاتی تھی اور ناک سے کچھ ہونہ سا نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کھا رہے ہیں اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ احتیاطاً منہ جلدی سے بند کرلیتے تھے کہ ایسا نہ ہو کچھ نکل پڑے" امراؤ مسجد میں جاکر صحن کے کنارے چپکے سے بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب قریب جاکر پوچھتے ہیں:-

"کیوں بی صاحب آپ کا یہاں کیا کام ہے؟"

امراؤ: "مسافر ہوں خدا کا گھر سمجھ کے . . . . تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئی ہوں، اگر آپ کو ناگوار ہو تو چلی جاؤں"

مولوی صاحب اگرچہ بہت بے تکلے تھے مگر میری لگاوٹ اور دلفریب تقریر نے جادو کا اثر کیا، بھلا جواب کیا منہ سے نکلتا ہکا بکا ادھر اُدھر دیکھنے لگے میں سمجھ گئی کہ دام فریب میں آگئے۔

مولوی صاحب۔ (تھوڑی دیر کے بعد بہت سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟

میں۔ جی کہیں سے آنا ہوا مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔"

مولوی۔ (بہت گھبرا کے) مسجد میں؟

میں۔ جی نہیں بلکہ آپ کے حجرے میں

مولوی۔ لاحول ولا قوۃ۔

میں۔ اہی مولوی صاحب مجھے تو سوا آپ کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔

مولوی۔ جی ہاں تو میں اکیلا تو رہتا ہوں، اسی سے تو میں نے کہا مسجد میں آپ کا کیا کام ہے؟

میں۔ یہ کیا . . . خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہتے ہیں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا، مسجد میں ہمارا کام نہیں یہ خوب کہی، آپ کا کیا کام ہے؟

مولوی۔ میں تو لڑکے پڑھاتا ہوں۔

میں۔ میں آپ کو سبق دونگی۔

مولوی۔ لاحول ولا قوۃ۔

میں۔ لاحول ولا قوۃ، یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیا پڑھتے ہیں، یہ کیا آپ کے پیچھے شیطان پھرتا ہے۔

مولوی۔ شیطان آدمی کا دشمن ہے اس سے ہر وقت ڈرنا چاہیئے۔

میں۔ خدا سے ڈرنا چاہیئے، موئے شیطان سے کیا ڈرنا، اور یہ کیا آپ نے کہا آدمی ہیں۔

مولوی۔ (ذرا بگڑ کے) جی ہاں اور کون ہوں۔

میں۔ مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں، اکیلے اس مسجد میں رہتے ہیں آپ کا جی نہیں گھبراتا۔

مولوی۔ پھر کیا کریں، ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے۔

میں۔ اسی سے تو آپ کے چہرے پر وحشت برستی ہے، وہ آپ نے نہیں سنا عمع تنہانشین کہ نیم دیوانگی است

مولوی۔ ابھی وہ کچھ نہیں جس حال میں ہم ہیں خوش ہیں، آپ اپنا مطلب کہئے۔

مَیں۔ مطلب تو کتاب دیکھنے سے حل ہوگا، بالفعل زبانی مباحثہ ہے۔

مولوی۔ چہ خوش،

مَیں۔ چرا نہ باشد۔ "

طوالت کے خوف سے مکالمہ کا بقیہ حصہ درج نہیں کیا جاتا مگر مندرجہ بالا اقتباس سے مکالمہ، ظرافت نیز مرزا صاحب کی طرزِ تحریر کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہاں پر دیکھنے کی خاص بات یہ ہے کہ امراؤ مولوی صاحب پر ایسے فقرے بھی کستی جاتی ہے جن سے وہ برافروختہ ہوں مگر فوراً ہی سنبھال بھی لیتی ہے۔ مرزا صاحب نے اس موقع کو خوب نباہا ہے۔ ایک بے تکلّفے ہو تق آدمی سے اس قسم کی نوک جھونک کی گفتگو بھی کراتے ہیں اور بے لطفی پیدا ہونے کا موقع بھی نہیں دیتے۔

تیسرا موقع نواب چھبن صاحب کے درد انگیز واقعہ کا ہے، مرزا صاحب نے اس موقع پر بھی ایک پر درد ڈرامیٹک واقعہ بیان کر کے جذبات کے اُکسانے کی کوشش کی ہے۔

مرزا رُسوا نے جس زمانے اور جس سوسائٹی کا نقشہ کھینچا ہے اُس کی سچی اور فطری تصویریں پیش کردی ہیں اور اپنے حسنِ بیان سے اُسے کافی دلکش بنا دیا ہے۔ مکالمہ کی برجستگی، بے تکلف طرزِ ادا تجربات کی فراوانی، صنفِ نازک کے حقوق، گھر کی بی بیوں کو بازاری عورتوں پر ترجیح اور عورتوں کے فطری جذبات کا من و عن اظہار اس ناول کی خصوصیات ہیں۔ مگر اس قصہ کے پڑھنے سے اس کے بعض معائب بھی ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً امراؤ جان آدا اپنی سوانح عمری منشی احمد حسین اور مرزا رسوا کے اصرار سے بیان کرتی ہے اور یہ دونوں حضرات سنتے ہیں، مگر تعجب خیز بات یہ ہے کہ مرزا رسوا تو کبھی کبھی کچھ پوچھ لیتے ہیں اور مذاق بھی کرتے ہیں مگر منشی صاحب بت بنے بیٹھے ہیں۔ نہ تو اُنھیں کسی بات پر ہنسی آتی ہے اور نہ کسی دردناک موقع پر کوئی حرفِ تاسف ہی منہ سے نکلتا ہے۔ ناول میں ایسے شخص کے لانے کی کیا ضرورت تھی جس کی ہستی معدوم ہو جائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے دن کے بعد امراؤ نے اپنی سوانح عمری صرف مرزا صاحب ہی سے کہی تو اس کی توضیح ہو جانا چاہیئے تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ آدا اور منشی صاحب سے بے تکلفی نہ تھی اس لئے وہ خاموش رہے۔ لیکن غم انگیز موقع پر کچھ بولنا بے تکلفی پر منحصر نہیں۔ اگر وہ سوانح عمری سننے کا سوال کر سکتے تھے تو موقع بموقع ہنس بول کر لطفِ صحبت بھی دوبالا کر سکتے تھے۔ مگر مرزا رسوا قصہ کے شروع ہی سے اُنھیں رخصت کر دیتے ہیں اور ہم صرف امراؤ اور رسوا کی گفتگو سنتے ہیں۔

امراؤ جان کی منگنی اس کی پھوپھی کے لڑکے سے نو سال کی عمر ہی میں ہو چکی تھی، اُس کے والد جہیز کا سامان مہیا کر چکے تھے اور رجب کے مہینے میں شادی ہونے والی تھی کہ یکایک ایک روز وہ دلاور خاں کے پھندے میں آ کر فریب کا منہ دیکھتی ہے اور لکھنؤ میں فروخت کی جاتی ہے۔ خانم کی خادمہ حسینی سوال کرتی ہے:-

حسینی۔ بچی تو کہاں سے آئی ہے؟

میں۔ (رو کے) بنگلے سے

حسینی۔ (خانم سے) بنگلہ کہاں ہے

خانم۔ اے ہے کیا ننھی ہو؟ فیض آباد کو بنگلہ کہتے ہیں۔

حسینی۔ تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟

میں۔ جمعدار

خانم۔ تم بھی غضب کرتی ہو، بھلا وہ نام کیا جانے، ابھی بچہ ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ جس لڑکی کو اپنے شہر کا نام معلوم ہو اور جس کی عمر نو برس سے زیادہ ہو اور عنقریب جس کی شادی ہونے والی ہو اس کو اپنے والد کا نام نہ معلوم ہو۔ یہاں پر مرزا صاحب نے امراؤ جان کو ایک بالکل کم سن۔ یعنی دو چار سال کی بچی بنا کر پیش کیا ہے جس سے خیالات میں تناقض پیدا ہوتا ہے اور جو ایک فنی غلطی ہے۔ یہاں پر یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ امراؤ کے والد کا یہی نام ہے کیونکہ یہ شبہ حسب ذیل سطور کے پڑھنے سے دُور ہو جاتا ہے۔

میں۔ اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے۔

نواب۔ اکثر مر گئے، نئے نئے نوکر ہیں اب وہ کارخانہ ہی نہ رہا، بالکل نیا انتظام ہے۔

میں۔ اگلے نوکروں میں ایک بڑے جمعدار تھے۔

نواب۔ ہاں تھے، تم انھیں کیا جانو۔

میں۔ غدر سے پہلے میں ایک مرتبہ محرم میں فیض آباد آئی تھی، مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی، اُنھوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب۔ وہی جمعدار نا جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی۔

میں۔ مجھے کیا معلوم (دل میں) ہائے افسانہ ابتک مشہور ہے۔

نواب۔ یوں تو کئی جمعدار تھے اور اب بھی ہیں مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے

ناول کے شروع میں امراؤجان خود ہی کہتی ہے "میرے ابّا بہو بیگم کے مقبرے پر نوکر تھے معلوم نہیں کس مہینے میں اسم تھا کیا تنخواہ تھی، اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔"

امراؤجان کو خانم کے یہاں رہتے ہوئے ایک عرصہ گذرچکا تھا سن تمیز کو بھی پہونچ چکی تھی کیونکہ وہ خود کہتی ہے کہ ایک دن گوہر مرزا نے اسے ایک روپیہ دیا جسے اُس نے ٹھکرا رکھا تھا وجہ یہ تھی کہ ایک تو صرف کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی دوسرے "اگر تھی بھی تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ صرف کرتی ہوں تو لوگ پوچھیں گے کہاں سے ملا تو کیا بتاؤں گی۔ رازداری کی سمجھ مجھ میں آگئی تھی، اور یہ سمجھ بغیر سن تمیز کو پہونچے نہیں آتی۔ بیشک میں سن تمیز کو پہونچ چکی تھی۔" اس اقتباس سے اکیس سطر اوپر مرزا صاحب اور امراؤجان کی گفتگو ملاحظہ ہو:۔

رسوا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کو آپ کی طرف توجہ نہ ہو۔ نگاہیں ضرور پڑتی ہونگی مگر بات یہ تھی کہ آپ کی متی نہیں ہوئی تھی، خانم سے لوگ ڈرتے تھے اس لئے آپ سے کوئی نہ بولتا ہوگا۔"

امراؤ۔ شاید یہی ہو مگر مجھے اتنی تمیز کہاں تھی، میری تو وہ مثل تھی "بید ولتی لپنے تیہے میں آپ کھولتی"۔ اپنی ہجولیوں کو دیکھ دیکھ کے جھنکی جاتی تھی کھانا پینا حرام تھا، راتوں کو نیند اُڑ گئی تھی

اول تو یہ کہ بائیس؟ سطور کے فرق میں اس قسم کے متضاد خیالات کا بیان کسی ناول کے لئے ایک قابل گرفت خامی ہے۔

نواب چھبن صاحب کا تعلق بسم اللہ جان سے تھا، اُن کے چچا کربلائے معلی سے واپس آئے تو انھوں نے چھبن صاحب پر شادی کرنے کا دباؤ ڈالا، انھوں نے صاف انکار کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے چچا نے بطور تنبیہ انھیں گھر سے نکال دیا۔ چھبن کی ماں نے خانم سے کہلا بھیجا کہ انھیں کسی طرح پر شادی کرنے پر راضی کردیں۔ خانم نے تمہیداً ایک روز چھبن صاحب سے ایک دوشالے کی فرمائش کی اور پھر اس قسم کی گفتگو کی جو ان کے دل پر نشتر کا کام کرتی تھی، بیچارے مفلس ہوگئے تھے سر جھکائے سنتے رہے اور آخر کار اُٹھکر چلدیے اور دوسرے دن دریا میں کود پڑے۔

بسم اللہ۔ سنا ہے بیچاری (چھبن کی ماں) دیوانی ہوگئی ہیں۔

میں۔ جو ہو کم ہے، یہی تو ایک اللہ آمین کا لڑکا تھا، ایک تو بیچاری رانڈ بیوہ دوسرے یہ آفت اُن کے سر پر ٹوٹی، سچ پوچھو تو ان کا گھر ہی تباہ ہوگیا۔

رسوا۔ تو نواب چھبن صاحب کو آپ نے ڈبو ہی دیا۔ اچھا اس موقع پر مجھے ایک بات اور پوچھ لینے دیجئے۔

اُمراؤ۔ پوچھیئے۔

رسوا۔ نواب صاحب پیرنا جانتے تھے یا نہیں؟

اُمراؤ۔ کیا معلوم، یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا۔ اس لئے کہ میر مچھلی صاحب نے مجھے ایک نکتہ بتا دیا تھا کہ جو شخص پیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا۔

ظاہر ہے کہ ایک شخص جو پہلے نواب کی حیثیت رکھتا تھا اور جس نے بسم اللہ جان کے ساتھ سیکڑوں روپیہ کا سلوک کیا وہ مفلسی میں اپنی معشوقہ کے دروازے سے بھی بے غرتی کے ساتھ واپس ہوکر اپنے کو اس قابل نہ سمجھ سکتا تھا کہ دنیا میں اپنا منہ دکھلائے اور ذلیل ہو۔ مرزا صاحب نے اس موقع کو پر درد بنانے کی کوشش کی ہے مگر یہاں بھی ان سے ایسی غلطی صادر ہوئی جو ایک ناول نگار کے لئے قطعی ناموزوں ہے ان کے تکمیل فن و معلومات پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس کے پڑھنے سے کئی اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ایسے دردناک موقعہ پر اظہار تاسف کے بجائے مرزا صاحب بلا وجہ مذاق کر بیٹھتے ہیں اور مذاق بھی کیسا نہایت پست، اس قسم کی فقرہ بازی بالکل غیر فطری ہے۔ اس کے بعد جب ناظرین اختتام پر پہونچکر امراؤ جان کا ریویو پڑھتے ہیں کہ "اثنائے سوانح عمری میں ان کا بقیہ ذکر فروگذاشت ہوگیا تھا" تو فوراً آنکھ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شاید یہ عمداً کیا گیا ورنہ جتنے حالات معلوم تھے اس نے ان کے بتانے سے کیوں گریز کیا۔ درحقیقت چھبن صاحب کا واقعہ امراؤ کو معلوم تھا لیکن اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ اس نے ان کا حال چھپانے کی کیوں کوشش کی۔ ہاں شاید یہ مرزا صاحب نے قاری کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے کیا ہو۔ مگر فنی خامی کی وجہ سے اسے نباہ نہ سکے اور اگر یہ وجہ ہے کہ ریویو میں مساعدت تقدیر اور دن پھرنے کی مثال کے لئے یہ فروگذاشت سامنے لائے تو یہ کوئی خوبی نہیں بلکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے مقتضائے وقت کا خیال بالائے طاق کردیا جو ایک ناولسٹ کیلئے کسی طرح مناسب نہیں۔

اِس قسم کی بعض اور بھی لغزشیں اس ناول میں موجود ہیں جنکی وجہ سے ہم اس کو معیار سے گرا ہوا پاتے ہیں، بہرحال اس قسم کی خامیوں کی وجہ سے یہ ایک اعلیٰ درجہ کا ناول نہیں قرار دیا جاسکتا بلکہ نخلِ ارتقا کی شاخ کا ایک ناکمل شگوفہ کہا جاسکتا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اسمیں مرزا صاحب نے پرانی طرز تحریر، قافیہ پیمائی اور بڑے بڑے جملوں سے احتراز کیا اور صاف، رواں اور بیساختہ عبارت کی مثال پیش کی۔ بہر نوع انھوں نے [illegible] وہ ہمارے لئے قابل توجہ ضرور ہے۔

شبری بھیلنی

(از شریمتی شیوکماری دیوی دختر حضرت جگر بریلوی)

ہندوؤں میں بہت سی عورتیں ایشور بھگت ہوئی ہیں۔ اِن میں سب سے زیادہ مشہور میرا بائی ہے میرا بائی پریم کی متوالی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ پایہ کی شاعرہ بھی تھی۔ جس نے اُس کی شہرت کو چار چاند لگا دیے شبری بھیلنی اگرچہ اس قدر مشہور نہیں لیکن جہاں تک عشقِ حقیقی کی کامیابی کا تعلق ہے اُس کا مرتبہ میرا بائی سے کسی طرح کم نہیں جس کو بھگوان رامچندر پیکر جسمانی میں درشن دیں اُس کے نصیب کا کیا کہنا۔

شبری ایک مصیبت زدہ بیوہ تھی، اُس کے کوئی اولاد بھی نہیں تھی جو اُس کے دردِ زندگی کے لئے سامانِ راحت ہوتی۔ اُس کے لئے یہی مناسب تھا کہ وہ ریاضت و عبادت میں اپنی زندگی وقف کردے اور اُس نے ایسا ہی کیا۔ وہ ایک جنگل میں کٹی بنائے ہوئے ایشور بھجن میں مشغول رہتی تھی۔ اِسی جنگل میں ایک بہت بڑے عارف کامل رشی متنگ کا آشرم تھا۔ شبری نے اُن کے درشن کئے اور سوچا کہ اگر میں رشیوں کی خدمت کروں تو ممکن ہے میرا دلی مقصد حاصل ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ میری خدمت کون قبول کرے گا میں تو ایک نیچ اور ناپاک مخلوق ہوں، اس لئے اُس نے مخفی طور پر اُن کی خدمت کرنے کا تہیہ کیا۔ رشیوں کے آشرموں سے تھوڑے فاصلہ پر اپنے لئے ایک چھوٹی سی کٹی بنالی اور جنگل کے پھل پھلاری کھا کر بسر کرنے لگی۔ روز علی الصباح اُٹھتی رشیوں کے آشرم کے راستوں کو جھاڑو دیکر صاف کرتی، جنگل سے لکڑیاں توڑ کر لاتی اور آشرموں کے دروازوں پر رکھ جاتی اپنے دروازوں پر لکڑیاں جمع دیکھکر اور راستوں کو صاف ستھرا پاکر رشیوں کو تعجب ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے چیلوں کو اس بات کا پتہ لگانے کے لئے ہدایت کی۔ فرمانبردار چیلے رات بھر جاگتے رہے۔ شبری صبح صبح حسب معمول لکڑیاں لارہی تھی کہ چیلوں نے اُسے پکڑ لیا اور متنگ رشی کے پاس لے گئے اور عرض کیا "مہراج روز راستہ صاف کرنیوالا لکڑیاں جمع کرنیوالا چور حاضر ہے"

رشی نے شبری سے پوچھا "تو کون ہے، ہمارے راستے کیوں صاف کرتی ہے اور کیوں ہمارے دروازوں

پرلکڑیاں رکھ جاتی ہے۔" سہمی ہوئی شبری نے کانپتی ہوئی آواز سے جواب دیا" مہراج میں ایک بھیلنی ہوں میرا جنم نیچ کل میں ہوا ہے اس لئے آپ کی کوئی خدمت نہیں کرسکتی، یہ ایسا کام ہے جس سے آپ مہاتماؤں کا کچھ بگاڑ نہ ہوگا اور میرا جنم سپھل ہوجائیگا، اگر کوئی اپرادھ ہو تو چھما کیجئے"

رشی کو شبری پر رحم آیا انھوں نے اپنے چیلوں سے کہا" یہ عورت بڑی نیک بخت ہے اسے آشرم کے پاس کٹیا میں رہنے دو اور اس کے کھانے پینے کا انتظام کردو"

رشی کو مہربان دیکھکر شبری نے کہا" مہراج میرے لئے تو جنگل کے پھل پھلاری ہی کافی ہیں" مجھے نہ تو دنیا سے محبت ہے نہ دھن دولت دودھ پوت کی چاہ، مجھ پر تو آپ ایسی کرپا کریں کہ میری مکتی ہوجائے"

رشی نے کہا" تو یہاں بے کھٹکے رہ اور ایشور بھجن کر"

اُس دن سے شبری وہاں سادھونی بنکر رہنے لگی، دوسرے رشیوں کو یہ بہت ناگوار ہوا انھوں نے متنگ رشی سے صاف صاف کہہ دیا کہ "آپ نے ایک نیچ عورت کو اپنے آشرم میں جگہ دی ہے، ہم لوگ آپ کے ساتھ بھوجن کرنا درکنار بات چیت کرنا بھی نہیں چاہتے"

حقیقت آگاہ رشی نے ان باتوں پر کچھ دھیان نہ دیا، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ سب جہالت کا نتیجہ ہے، شبری کوئی معمولی عورت نہیں جب اُس کے دل میں ایشور کی بھگتی کا بیج اُگ آیا تو وہ اُس سے کیسے نفرت کرسکتے تھے۔ وہ اپنے پند و نصائح سے شبری کی بھگتی بڑھاتے رہے۔

کچھ دنوں بعد رشی نے کہا" اب ہم اپنا چولا چھوڑنا چاہتے ہیں" یہ سُنکر شبری کو بڑا دکھ ہوا اُس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا" مہراج آپ ہی دین و دنیا میں میرا سہارا ہیں، میں اب جی کے کیا کرونگی مجھ دکھیا کو بھی اپنے ساتھ لیتے چلیئے" رشی نے اُسے تسلی دی اور کہا اس وقت بھگوان رامچندر چترکوٹ میں ہیں وہ یہاں آئیں گے اُن کے درشن سے تیرا کلیان ہوگا، تب تک تو یہاں رہ اور ایشور بھجن کئے جا"

یہ کہہ کر متنگ رشی نے عالم جاودانی کی راہ لی، شبری بھی اس دن سے رامچندرجی کے آنے کی راہ دیکھنے لگی۔ وہ جنگل کے سارے راستے دن بھر میں چار چار بار صاف کرتی اس خیال سے کہ اُس کے رام کو تکلیف نہ ہو۔ اچھے اچھے اور میٹھے میٹھے پھل جنگل سے لاتی، کُٹی کے باہر راستوں پر آنکھیں بچھائے بیٹھی رہتی، ذرا سے کھٹکے سے آگے بڑھکر دیکھتی ہر پیڑ اور پتے سے پوچھتی میرے رام کتنی دور ہیں کب تک آئیں گے۔ روز اپنا گھر مٹی سے لیپتی، اسی طرح کئی روز گزر گئے، ایک دن کچھ رشی بالکوں نے کہا۔

"شبری، تیرے رام آرہے ہیں!" پھر کیا تھا شبری خوشی میں اپنے آپ کو بھول گئی اور دوڑتی ہوئی تالاب سے پانی لینے گئی۔ اُدھر سے ایک رشی نہا کر آرہے تھے اُن سے اُس کا جسم چھو گیا، رشی نے ڈپٹ کر کہا "کیسی ڈھنٹ ہے جان بوجھکر میرا اپمان کرتی ہے۔" یہ کہکر وہ دوبارہ نہانے گئے، شبری اپنی دھن میں تھی اُس نے کچھ سُنا بھی نہیں، تالاب پر پہونچکر جیسے ہی رشی اُس میں اُترے اُس کا پانی خون کی طرح لال ہو گیا اور اُس میں کیڑے بلبلانے لگے۔ اس پر بھی وہ نہ سمجھ سکے کہ یہ شبری سے نفرت کرنے کا نتیجہ ہے۔ شبری پانی لیکر پلٹی، اسی اثنا میں رامچندر جی بھی شبری کا پتہ پوچھتے ہوئے اُس کی کٹی میں آگئے۔ دوسرے رشیوں کو تو یہ یقین تھا کہ رامچندر جی ہمارے یہاں آئیں گے لیکن اُنھیں شبری کے یہاں جاتے دیکھکر رشیوں کو بڑا تعجب ہوا۔ شبری رامچندر جی کو دیکھکر تالی بجا بجا کر ناچنے لگی۔ اُسے اپنا کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ اُس کو ایسا مگن دیکھکر لچھمن جی نے کہا "شبری کیا تو ناچتی ہی رہے گی، دیکھ تو کتنی دیر سے بھگوان تیرے دروازے پر کھڑے ہیں، کیا تو انھیں بٹھلائیگی بھی نہیں۔" یہ سُنکر شبری کو ہوش آیا اُس نے اُن کو ہاتھ جوڑکر پرنام کیا اور بٹھاکر پوجا کی۔

رامچندر جی نے شبری سے کہا "شبری تیری بھگتی قبول ہوئی، تیرا مقصد قبول ہو گیا، بول اب کیا چاہتی ہے؟" شبری نے کہا "مہراج آپ کے درشنوں سے میرا جیون سپھل ہو گیا، میری گرو پوجا بھی سپھل ہوئی۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی، اُس کا دل جوش مسرت سے اُمنڈ آیا اور آواز بھر آگئی، کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اُس نے ہاتھ جوڑکر کہا "مہراج! میں ایک نیچ ذات کی عورت ہوں کس طرح آپ کی سیوا کروں، اور میں سیوا کرنا جانتی بھی نہیں، کس طرح میرا کلیان ہوگا۔"

رامچندر جی نے کہا "سادھونی، جو کوئی میرے روپ کو پہچان لیتا ہے اور مجھ سے محبت کرتا ہے وہ میرا ہے اور میں اُس کا ہوں۔ اِس میں ذات پات، امیری غریبی کو دخل نہیں، اگر کوئی اونچی ذات کا ہے، امیر ہے، اور اُس نے میرے روپ کو نہیں پہچانا اور نہ سچی بھگتی کو سمجھا وہ مغرور ہے اور کسی طرح میرا نہیں ہو سکتا، میری محبت کا دروازہ سب کے لئے یکساں طور پر کھلا ہوا ہے۔"

تب شبری نے کہا "اب آپ کچھ پھل کھائیں، یہی میری اچھا ہے" یہ کہکر اُس نے جمع کئے ہوئے کچھ بیر لاکے مہراج رامچندر کے سامنے رکھدیے اور چکھ چکھ کر میٹھے میٹھے بیر کھلانے لگی۔ بھگوان رامچندر اِن پریم کے پھلوں کو بڑے سواد سے کھاتے تھے اور بڑی تعریفوں کے ساتھ لچھمن جی کو بھی دیتے جاتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد رامچندر جی کے آنے کا حال سُنکر سب رشی شبری کی کٹی میں درشنوں کے لئے آئے رشیوں کو دیکھکر دونوں بھائی تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے اور ہاتھ جوڑکر پرنام کیا۔

رشیوں نے کہا "مہراج ذات پات کے زعم میں آکر ہم لوگوں نے شبری کو ذلیل سمجھ رکھا تھا، اب آپ ہمارا

اپرادھ چھما کریں۔" لچھمن جی بولے "آپ لوگ رشی ہیں، اپنا سب سکھ تیاگ کر جنگل میں رہتے ہیں، آپ کے پربھاؤ سے دُنیا جگمگا رہی ہے۔" یہ سُن کر رشیوں کو اطمینان ہوا، اُنھوں نے پوچھا "مہراج کیا بات ہے کہ یہاں کے تالاب کا پانی خون کی طرح لال ہو گیا ہے، اور اس میں کیڑے پڑ گئے ہیں؟"

رامچندر جی نے کہا "یہ شبری کو ذلیل کرنے کا پھل ہے، اگر شبری اُس میں نہائے تو اُس کا پانی پھر صاف ہو سکتا ہے۔" رامچندر جی کے حکم سے شبری اُس تالاب میں نہائی اور اُس کا پانی پھر صاف و شفاف ہو گیا۔

رامچندر جی نے شبری سے پوچھا "اب تو کیا چاہتی ہے؟"

اُس نے کہا "مہراج نیچ کل میں جنم لینے سے بھی مَیں آپ کے درشن کر رہی ہوں اس سے بڑھکر میں کیا مانگ سکتی ہوں، یہی چاہتی ہوں کہ میری بھگتی اٹل رہے اور مَیں آپ کو کبھی نہ بھولوں۔" رامچندر جی نے کہا اچھا ایسا ہی ہوگا۔"

اس کے بعد شبری نے رامچندر جی سے اجازت لے کے اپنا شریر چھوڑ دیا اور مکتی حاصل کر لی تلسی داس نے سچ کہا ہے:-

ذات پات پوچھے نہیں کوئے
ہر کا بھجے سو ہر کا ہوئے

محبِّ وطن کا گیت

اے میری مادرِ وطن میں تیرے ہی لئے اپنا بند بند کٹواتا ہوں اور میں اپنی زندگی بھی تیری نذر کرتا ہوں۔ قبول کر...

یہ تیری ہی ناکردہ خطائیں ہیں جو میری آنکھوں سے بے ساختہ اشک رواں کرتی ہیں، یہ تیرا ہی دردبھرا گیت ہے جس کو میری بانسری ہر وقت بجایا کرتی ہے۔

اے میرے جان سے زیادہ عزیز وطن

تو جانتا ہے کہ میرے بازو کمزور اور پتلے ہیں۔

مگر وہ ضرور اپنی مہم میں کامیاب ہونگے۔

اگرچہ میری آبدار تلوار غلامی سے زنگ آلود ہو چکی ہے

مگر وہ تجھ کو آزاد کرا کے چھوڑے گی۔

اگرچہ میری بانسری کے راگ میں کوئی کشش نہیں ہے جو بجھے ہوئے دلوں کو گرما سکے مگر اس پر بھی میں جو تیرا ہی ایک سپوت ہوں ہمیشہ آزادی کا راگ الاپتا رہونگا۔

(۱ ر۔ کاظم)

بیگم

دو ہزار پونڈ کے ٹکٹ

قصہ

(از مسٹر سلیم حامد رضوی صاحب بھوپالی)

جس وقت ڈک بیٹمین پارک میں چہل قدمی کر رہا تھا، اس کا چہرہ اس قدر شگفتہ تھا کہ سبھی آنے جانے والے اُسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک حسین لڑکی سامنے سے آئی، مگر ڈک نے اسے اُس وقت تک نہیں دیکھا جب تک کہ اُس کی آواز کانوں میں نہ پہونچی۔ "کیوں ڈک!" اُس نے اپنی شیریں آواز میں اُسے مخاطب کیا "آج تم اس قدر مسرور کیوں نظر آرہے ہو؟"

ڈک نے گرمجوشی کے ساتھ جین کا استقبال کیا "میں تمہارا منتظر تھا، چلو ہوٹل میں چائے پی آئیں مجھے تم سے ایک خاص بات بھی کہنی ہے۔"

"لیکن میں صرف دس منٹ دے سکتی ہوں" جین نے جواب دیا اور وہ دونوں پارک کے دروازے کے پاس والے ہوٹل میں داخل ہوگئے۔ "دیکھو ڈک آج میں بہت ہی عدیم الفرصت ہوں"

جب دونوں ہوٹل کے ایک جانب آرام سے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ڈک نے کہا "جین، تم جانتی ہو کہ میرا ایک چچا فرڈینینڈ آسٹریلیا میں رہتا تھا؟"

جین نے کہا "نہیں مجھے نہیں معلوم ہے۔"

"میں خود بھی اُس کو جانتا نہ تھا، میری مُراد یہ ہے کہ میں نے اُسے کبھی دیکھا نہیں ہے، بہرحال دو ماہ کے قریب ہوئے کہ اُس کا انتقال ہوگیا ہے۔"

"افسوس کی بات ہے، خیر صبر کرو۔"

"بیشک صبر ہی کرنا پڑے گا، لیکن تمہیں معلوم ہے اُس نے میرے لئے کیا چھوڑا ہے؟"

لڑکی نے لاپروائی سے کہا کہ "جو کچھ چھوڑا ہو، اس وقت اِس قصے کو چھوڑو۔"

"تم کبھی خیال بھی نہیں کرسکتیں کہ اُس نے........"

"تم اطمینان رکھو میں اندازہ کرنے کی کوشش بھی نہ کرونگی۔"

ڈک نے کہا "خدا اُس کو جنت نصیب کرے، بیچارہ کوئی مالدار آدمی تو تھا نہیں.....“

جین چائے کی پیالی لاپروائی سے ہونٹوں تک لیجاکر بولی "لوگوں کے خاندانی قصوں سے مجھے چنداں دلچسپی نہیں ہے۔"

مگر ڈک نے اس عدم دلچسپی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا کہ "لیکن اُسے تمام زندگی پُرانے ٹکٹوں کو جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔"

لڑکی نے گہری سانس لیکر کہا کہ "ڈک اگر تم کو کوئی مطلب کی بات کہنا ہے تو جلدی کہو ورنہ خواہ مخواہ میرا وقت ضائع نہ کرو......“

"لیکن سنو تو" ڈک نے کہا "میں تبلاتا ہوں کہ میرے چچا فرڈینینڈ نے:"

لیکن لڑکی نے پھر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"اچھا سنو" ڈک نے جلدی سے کہنا شروع کیا "چچا جان اپنے سب ٹکٹ مجھے دے گئے ہیں" اور آج صبح یہ سب ٹکٹ مجھے مل بھی گئے ہیں۔"

ڈک نے جیب سے ایک چرمی کیس نکال کر جین کی طرف بڑھا کر کہا کہ "دیکھو سب ٹکٹ اسی میں رکھے ہیں۔"

لڑکی نے کسی قدر ترشرو ہو کر کہا "بس یہی بات تھی، چلو اچھا ہوا اب تم کو اپنے دوستوں کے خطوط کا جواب دینے میں آسانی ہو گی۔"

ڈک نے آہستہ سے پوچھا "جین تم جانتی ہو اِن ٹکٹوں کی کیا قیمت ہے؟"

"میں اس کے جاننے کی ضرورت نہیں سمجھتی" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"سنو۔ دو ہزار پونڈ"

لڑکی نے حیرت سے آنکھیں کھولدیں، اور اب اسکو کچھ دلچسپی سی پیدا ہو گئی۔

"کیا واقعی!"

"ہاں ہاں، چچا مرحوم کے وکیل نے بھی لکھا ہے کہ یہ بہت قیمتی ہیں، اور میں نے بھی واٹ نیم کی کمپنی میں دریافت کیا تھا، اور وہ دو ہزار پونڈ دینے کو تیار ہیں۔"

"مبارک ہو" جین نے کہا "مبارک ہو۔ کاش فرڈینینڈ جیسا میرا چچا ہوتا۔ خیر اب یہ بتاؤ کہ تم اس رقم کو کیا کرو گے۔ میرا خیال ہے کہ تم ان ٹکٹوں کو ضرور فروخت کر ڈالو گے"

"ضرور، مجھے ان سے کوئی اور دلچسپی نہیں ہے" اُس نے کسی قدر رُک کر کہا "مگر یہ تو بتاؤ کہ تم

ان کی کچھ ضرورت تو نہیں ہے..... میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم مجھ کو اجازت دو تو میں تمھیں اس رقم کو بطور قرض دے سکتا ہوں"

یہ الفاظ سنکر جین کا چہرہ سرخ ہو گیا، وہ بولی کہ" ڈک مجھے امید ہے کہ آئندہ تم ایسی گفتگو کی جرأت نہ کروگے۔ ــــ اس وقت تو میں تمہاری مہربانی کا شکریہ ادا کئے دیتی ہوں"

معاف کرنا جین، میں شرمندہ ہوں، خیر اگر تم اس رقم کو لینا نہیں چاہتی تو میں بنک میں جمع کردوں گا"

"یہ بہت مناسب ہوگا" جین نے شرارت آمیز لہجہ میں کہا "ڈک لیکن میں یہ جانتی ہوں کہ اسی مہینہ کے اندر اندر تم اس کو واپس لیکر اڑا بھی دوگے"

"معاف کیجئے" ڈک نے فخریہ انداز سے کہا "میں اس کی ایک پائی بھی خرچ نہ کرونگا، کیونکہ میں اس کو ایک خاص غرض سے بچانا چاہتا ہوں"

"وہ کیا؟"

"جین تم جانتی ہو کہ ابھی مجھے شادی کرنا ہے ــــ"

لڑکی نے ہنسکر کہا "خدا مبارک کرے"

"لیکن جین کیا تم نہیں سمجھتیں کہ میں...... تم سے......"

جین نے قطع کلام کرکے کہا "خبردار! آئندہ ایسی درخواست نہ کرنا"

ڈک پژمردہ سا ہو گیا، جین کی نظریں اس پر بدستور جمی رہیں اور کچھ دیر تک وہ سوچکر بولی "اگر تم تین مہینہ تک اس رقم کو اسی حالت میں محفوظ کر سکو تو...... مگر میں کسی بات کا وعدہ نہیں کر رہی ہوں، میرا مطلب صرف یہ ہے کہ پھر تم مجھ سے درخواست کرسکتے ہو۔

"منظور، منظور، بدل منظور" ڈک نے خوشی سے چلا کر کہا۔

"میں رقم کے معاملے میں ایک بچہ پر بھروسہ کر سکتی ہوں لیکن تم پر نہیں...." کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمھارے پاس ایک پائی بھی ہوگی تو تم اسے جلد سے جلد صرف کرنے کی کوشش کروگے"

ڈک نے پرجوش الفاظ میں کہا کہ "میں یہ ٹکٹ تمہارے پاس رکھے دیتا ہوں، تین ماہ تک تم انھیں اپنی حفاظت میں رکھو اور اگر میں مانگوں تو بھی تم انھیں واپس نہ دینا"

جین چونک اٹھی۔

"میری مراد یہ ہے" اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "تم کو میری طرف سے اطمینان

ہو جائے، سمجھیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے چرمی کیس دوبارہ جیب سے نکال کر جین کی طرف بڑھایا "لیجئے اسے رکھیئے"

جین نے اُسے خاموشی سے لے لیا، اور کچھ دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔

"اچھی بات ہے" اُس نے تھوڑی دیر میں کہا "مجھے منظور ہے، لیکن یاد رکھو میں تین ماہ سے پہلے ہرگز تم کو نہ دونگی خواہ تم کتنی خوشامد کیوں نہ کرو اور فاقہ کشی ہی میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ سمجھے!"

"میں سمجھ گیا، آج سے تین ماہ" وہ خاموش ہو گیا، جیسے کچھ سُن رہا ہو "میں ابھی سے اُنھیں سُن رہا ہوں، جین!"

"کیا سُن رہے ہو؟" جین نے چرمی کیس کو نہایت حفاظت سے اپنے بٹوے میں رکھتے ہوئے پوچھا

ڈک:۔"شادی کی گھنٹیاں"!

"ہشت" جین نے جھینپ کر کہا "دیکھو میں نے کسی بات کا وعدہ نہیں کیا ہے"

ڈک ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"اچھا خدا حافظ، ڈک!" جین نے چلتے ہوئے کہا "دیکھو دو تین دن تک میں عدیم الفرصت ہوں تم سے مل نہ سکوں گی"

ڈک کچھ دیر تک کھڑا ہوا اُس کے حسن کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا اور جب وہ نظروں سے پوشیدہ ہو گئی تو واپسی کے لئے پلٹا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈک طبیعت کا نہایت آزاد اور فضول خرچ واقع ہوا تھا، اگرچہ اُس کی آمدنی کافی تھی لیکن اُس کے پاس کبھی ایک پیسہ بھی باقی نہ بچتا تھا، کچھ یہ بات نہیں ہے کہ وہ سارا روپیہ اپنے ہی اوپر صرف کر دیتا تھا، واقعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً بہت فیاض واقع ہوا تھا۔

جین مالی معاملات میں کافی ہوشیار تھی اور کم سے کم ڈک کے مقابلے میں اُسے روپیہ کی قیمت اور اسکے مصرف کا زیادہ اندازہ تھا، اور لطف یہ کہ سمجھداری کے ساتھ وہ حسین بھی تھی۔ ایک ٹوپیوں کی دوکان میں اس کا آدھا حصہ تھا جس سے اُس کا ضروری خرچ نکل آتا تھا۔ وہ ڈک کی درخواست کے متعلق اُس وقت تک کوئی وعدہ نہ کرنا چاہتی تھی جب تک وہ اس پر پوری طرح غور نہ کر لے۔

ڈک زیادہ دُور نہ گیا تھا کہ ایک دوسرے نوجوان نے اُس کو پیچھے سے پکڑ لیا "کیوں ڈک، کیا بات ہے؟"

اُس نے ہنستے ہوئے کہا "کہاں جا رہے ہو، اگر میں نہ پکڑ لیتا تو شاید تم گلاب کے کانٹوں میں اُلجھ جاتے۔"

"شکریہ" ڈک نے خیالات سے بیدار ہو کر کہا "کیا تمہاری ٹرین چھوٹ گئی؟"

"ہاں" میں بھی یہی سمجھا تھا، کیونکہ آخر تم اول نمبر کے گدھے ہو"
آرتھر، جو جین کا بھائی تھا" نالائق کہیں کا، کیا اس شخص سے اسی طرح گفتگو کیجاتی ہے جس کی بہن سے
شادی کرنے والے ہو دوسری ٹرین جانے میں آدھ گھنٹہ کی دیر ہے، چلو اتنی دیر میں کچھ پی آئیں"
"ہشت" ڈک نے آہستہ سے ایک چپت مار کر کہا" میں تمہاری طرح فضول پیسہ برباد نہیں کرتا"
آرتھر ڈک کا بے تکلف دوست تھا اس لئے اُس نے بھی اُس کے ایک ہلکی سی چپت دی، غرض اس
ح تھوڑی دیر تک دونوں ہنستے ہنساتے رہے۔ اس کے بعد آرتھر نے پوچھا" کہو جین سے ملاقات بھی ہوئی؟"
"ہاں ابھی اُسی کے پاس سے آرہا ہوں"
"میرا خیال ہے اُس نے دوکان کے متعلق اپنی مالی مشکلات کا تم سے ضرور ذکر کیا ہوگا؟"
"مشکلات کا ذکر، کیسی مشکلات؟" ڈک نے حیرت سے پوچھا۔
"اچھا، تو اُس نے تم کو کچھ نہیں بتلایا؟ تو پھر مجھے بھی نہ کہنا چاہیئے"
ڈک نے ایک گہرا سانس لیکر کہا" تم کو بتلانا ہوگا ورنہ میں تمہارا بھیجا نکال دونگا"
"بات یہ ہے کہ دوکان میں اس سال سخت نقصان ہوا ہے اور اگر ایک ہفتہ کے اندر پانچ سو ڈالر کا
نظام نہ ہوا تو ساری دوکان نیلام ہو جائیگی، اس وقت بڑی مشکل یہ ہے کہ مدد کا کوئی ذریعہ نہیں،
س وقت اس کی حصہ دار بیرل بھی مالی پریشانیوں میں مبتلا ہے"
"مجھے یہ حال بالکل معلوم نہ تھا۔ واقعی بڑی مشکل ہے" ڈک نے پریشان ہو کر کہا۔
آرتھر: جین نیویارک جانے والی ہے کیونکہ وہاں اُسے اچھی ملازمت مل جانے کی امید ہے"
"واقعی؟" ڈک پر ان جملوں نے ایک بجلی سی گرا دی۔
"اچھا ڈک اب میں جاؤنگا خدا حافظ" ڈک اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا کہ اُس کو آرتھر کے
نے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔
آخرکار وہ ایک بنچ پر بیٹھکر سوچنے لگا کہ جین نیویارک جانے سے اُسی وقت رُک سکتی ہے جبکہ مطلوبہ
م کا انتظام ہو جائے۔ مگر وہ ایک غیور لڑکی ہے، ڈک سے امداد لینا پسند نہ کریگی۔ لیکن جین کا نیویارک
نا، ڈک کے لئے قیامت کے بمنزلہ تھا۔
ڈک نے سگریٹ جلایا اور اسی مسئلہ کو حل کرنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ جین اُس کی امداد قبول کرنے
راضی بھی ہو تو روپیہ کی سبیل کرنا بھی کوئی آسان بات نہ تھی، ہاں اگر وہ اپنے ٹکٹ کسی طرح واپس لے سکے
... آخرکار اس کے ذہن میں یہ تدبیر آئی کہ روپیہ اکٹھا کر کے بیرل کو دیدیا جائے، وہ باہمی مفاد کا خیال کر کے

یہ پیشکش ضرور قبول کر لیگی، لیکن ٹکٹوں کا حاصل کرنا بھی کوئی معمولی کام نہ تھا، اس کی نسبت وہ دیر تک سوچتا رہا۔ بعدہ وہ پارک سے پھر جین کے مکان پر پہونچا۔

"ہیں ڈک، میں نے کہہ دیا تھا کہ اب دو تین روز تک میں تم سے نہ مل سکونگی"۔

"اصل بات یہ ہے" ڈک نے کہنا شروع کیا "مجھے ابھی خیال آیا کہ .... یعنی .... دیکھئے وہ ......"

"کیا تم ٹکٹ واپس لینے آئے ہو؟" جین نے چلا کر کہا۔

"در حقیقت میں مقروض ہوں اور اگر میں نے پانچ سو ڈالر فوراً ادا نہ کر دئیے تو جیل ....."

"جین پہلے تو کچھ سوچتی رہی پھر مسکرا کر بولی کہ "میں خوش ہوں کہ تم اپنا قرض ادا کرنا چاہتے ہو" ڈک نے اطمینان کی سانس کی۔

"لیکن اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ پانچ سو ڈالر ان ٹکٹوں کے ذریعہ سے حاصل کر وگے تو اس پر ذرا غور کرلو، تین مہینہ میں ابھی صرف دو گھنٹے گذرے ہیں"۔

"لیکن ...... معاملہ بہت اہم ہے"۔

"ہاں یہ سچ ہے" جین نے لاپروائی سے کہا۔

"اگر میں اس وقت روپیہ نہ دے سکا تو جیل جانا پڑیگا"۔

"تو وہاں کوئی زیادہ تکلیف نہ ہوگی"۔

ڈک نے اس بے وقت کے مذاق سے چڑھکر کہا "کیا تم سزا یافتہ شخص سے شادی کرنا پسند کرو گی؟"

"ہرگز نہیں"۔

"اچھی بات ہے" ڈک نے رنجیدہ ہو کر کہا "تو پھر میں ......"

"دیکھو ڈک فضول باتوں سے کوئی فائدہ نہیں" جین نے دروازے کا قفل کھول کر کچھ رکھتے ہوئے کہا "ابھی تین مہینے باقی ہیں اس لئے ڈک تم اب یہاں سے چلتے بنو، اور وقت سے پہلے اپنی امانت مانگنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ"۔

ڈک بہت افسردہ ہوگیا اور دراز میں کیس حفاظت سے رکھا ہوا دیکھکر جانے لگا، جین نے دراز بند کر دی، مگر ڈک نے مکان سے باہر آنے سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا کہ رات کو وہ اپنا کیس چرا لیجاؤنگا اس خیال سے اسے ضرور پریشانی ہوئی تھی کہ جین کو جب اس چوری کا حال معلوم ہوگا تو وہ بہت پریشان

ہو گی لیکن اُس نے اپنے دل کو یہ کہکر سمجھا لیا کہ آخر یہ ساری کارروائی وہ اسی کے خاطر کر رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اُسے جین کا نیویارک جانا کسی طرح پسند نہ تھا۔

اس رات ڈک نے اپنی تجویز کے مطابق عمل کیا، اور تھوڑی سی تلاش کے بعد اُسے دراز کی کنجی مل گئی، کیس اپنی جیب میں رکھکر مسکراتا ہوا اپنے کمرہ میں داخل ہو گیا۔

دوسرے روز علی الصبح وہ بیرل کے پاس پہونچا۔

"ہلو بیرل!" اُس نے کہا "میں تم سے تنہا ملنا چاہتا تھا، کیونکہ میں جین کے آنے سے پہلے تم سے ایک ضروری بات چیت کرنا چاہتا ہوں"۔

"کہو ڈک" ابھی اس کے آنے میں ذرا دیر ہے"۔

"ذرا توجہ سے سنو تو کہوں"۔

"کہو نا کیا کہتے ہو"۔

ڈک نے کہنا شروع کیا "میں نے سُنا ہے کہ تم دونوں کو پانچ سو ڈالر کی ضرورت ہے"۔

"فرض کرو ضرورت ہے، پھر کیا؟"

"میرے پاس یہ رقم موجود ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اسے قبول کر لو رقم تمہارے پاس ایک گھنٹے کے اندر اندر پہونچ جائیگی"۔

بیرل نے ڈک کو حیرت سے دیکھا "مجھے لکھ پتیوں سے بات کرنے کا عرصے سے اشتیاق ہے شکر ہے کہ آج مجھے یہ موقع مل گیا۔ یہ تو بتایئے کہ آپ نے جین سے اس کا کیوں ذکر نہیں کیا"۔

ڈک: جین میری اس درخواست کو کبھی قبول نہیں کریگی، اس کی طبیعت حد درجہ غیور واقع ہوئی ہے"

بیرل نے طنزاً کہا "تو تمہارے خیال میں میں ایسی نہیں ہوں"۔

"نہیں، نہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔" ڈک نے گھبرا کر کہا "تم بھی کیسی عجیب لڑکی ہو، میرا مطلب صرف یہ تھا کہ تم ذرا سمجھدار اور کاروباری ضروریات سے واقف ہو، تم جین کو بطریق مناسب سمجھا سکتی ہو"۔

"ڈک! واقعی تم بڑے نیک ہو، مگر سنو اب روپیہ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی، کل ہمارا بہت سامان فروخت ہو گیا جس میں اچھا منافع ملا، اور پچھلے نقصان کی تلافی ہو گئی، اب کیا ہے اب تو ہم دونوں شادی رچانے والے ہیں"۔

ڈک چونک پڑا۔

"کیا، کیا جین کی بھی شادی طے ہو گئی ہے؟"

اتنے میں دروازہ کھلا اور جین رینالڈز داخل ہوئی۔

"آہ جین" بیریل نے کہا" مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم آرہی ہو، کیا تم نے ہماری بات چیت سن لی؟"

"ایک ایک لفظ" جین نے کہا" اچھا بیریل ذرا یہاں سے چلتی ہو، میں بھی اس لکھ پتی احمق سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں"

"اچھی بات ہے" بیریل نے شوخی سے کہا" مگر اس لکھ پتی سے سختی کے ساتھ پیش نہ آنا، یہ ہمارا بڑا ہمدرد ہے"

"اچھا تمہاری سفارش بہ دل قبول ومنظور" اُس نے یہ کہہ کر یکایک ڈک کے گلے میں اپنی باہیں ڈالکر اُس کا ایک بوسہ لے لیا۔

"کیوں نہ میں ناسمجھ ہوں اور بیریل سمجھدار؟"

ڈک نے مسکرا کر کہا" میں نے محض خوشامدانہ یہ الفاظ کہے تھے، لیکن یہ بتاؤ" ڈک نے نہایت اضطراب کے ساتھ پوچھا" بیریل کہہ رہی تھی کہ تم اور وہ........"

"کچھ پروا نہیں بیریل کچھ بھی کیوں نہ کہتی ہو" جین نے قطع کلام کرکے کہا" یہ بتاؤ کہ تم یہ ٹکٹ کس طرح اُڑا لائے؟"

"میں تمہارے کمرے سے انھیں چُرا لایا ہوں"

"تم اس میں بھی مشاق معلوم ہوتی ہو!"

"میں نے سب کچھ تمہاری خاطر کیا جس طرح سے بھی ممکن ہو میں تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا"

"ہاں ہاں میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم کو پانچسو کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ میں جانتی تھی کہ اسی بیوقوف آرتھر نے تم سے سب حال کہہ دیا ہوگا لیکن آؤ بتاؤ کہ اب وہ ٹکٹ کہاں ہیں"

ڈک نے جیب سے کیس نکالکر دکھایا" یہ دیکھو"

"ارے بیوقوف میں ٹکٹوں کا حال پوچھتی ہوں، کیس کا نہیں"

"اچھی بات ہے، یہ لو ٹکٹ بھی موجود ہیں" یہ کہکر اُس نے کیس کھولا اور چونک پڑا، گویا اُس پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا" یا خدا!" اُس نے گھبرائی ہوئی آواز سے کہا" ٹکٹ تو غائب ہیں، لیکن وہ میرے پاس سے گم نہیں ہو سکتے، میں نے تو ابتک کیس کھولکر بھی نہیں دیکھا"

اُس نے جین کے چہرہ کو غور سے دیکھکر کہا" جین تم کو ٹکٹوں کا حال ضرور معلوم ہے"

"ہاں"، اُس نے ہنسی کو بمشکل ضبط کر کے کہا "تم بہت سیدھے سادے جوان ہو"

"لیکن؟"

"میں تو انہیں فوراً ہی بنک میں رکھ آئی تھی۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ایسی قیمتی چیز کو میں اپنی میز کی دراز میں رکھونگی"

"بیشک" ڈک نے کہا "تم بڑی ہوشیار ہو"

"شکریہ" جین نے سنجیدگی سے کہا "میں اس کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ تم میری مدد کرنا چاہتے تھے، ڈک میں تمہاری محبت کی قائل ہو گئی ہوں"

ابتک ڈک خاموش تھا مگر ایک لمحہ بعد اُس نے پوچھا "ہیرلی نے مجھ سے کہا ہے کہ تم شادی کرنے والی ہو......"

جین نے اُس کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر نیچی نظریں کر کے کہا "ہاں ہم شادی کرنیوالے ہیں ...... تین ماہ بعد، کیوں کیا تمہاری رائے میں مجھے شادی نہیں کرنا چاہیئے؟"

(ترجمہ)

سلکِ مروارید

دولت اُن لوگوں کے پاس نہیں جاتی جو مسرف اور فضول خرچ ہیں۔

سچائی کی فتح ہوتی ہے اس لئے ہمیشہ سچ ہی بولنا چاہیئے

بڑا شخص ہونے کے باوجود اس قابل نہیں ہوتا کہ اس سے تعلق رکھا جائے۔ بن والے سانپ کا کیا خوف نہیں ہوتا

دنیا کی بہتری کے لئے اپنے سکھوں پر لات مارنے والے ہی ایک دن سب کے لئے قابل احترام بنتے ہیں۔

فراخ دل انسان تمام دنیا کو اپنا خاندان سمجھتا ہے۔

کتابوں کا مجموعہ دنیا بھر کی دولت سے بڑھ چڑھ کر ہے

زبردستی کسی سے کسی کی محبت کبھی نہیں ہوسکتی، محبت انسان کے دل میں خود بخود پیدا ہوتی ہے۔

لالچی [illegible] کے ساتھ نیکی نہیں کرسکتا وہ دوسروں پر اتنا ظلم نہیں کرتا جتنا خود اپنے اوپر

دولت کے لالچی ہمیشہ وہمی اور حالت غریبی میں رہتے ہیں۔

آنریبل مسٹر وی۔ جے پٹیل مرحوم سابق پریسیڈنٹ لجلیٹو اسمبلی

ہز میجسٹی نادر شاہ مقتول شاہ افغانستان

یادِ رفتگاں

وٹھل بھائی پٹیل مرحوم

فدائے وطن مسٹر ویت پٹیل کی وفات حسرت آیات سے جو بمقام جنیوا (سوئزرلینڈ) ۲۲- اکتوبر کو واقع ہوئی تمام ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ مادرِ ہند کے اس سو ہیر محب وطن کی وفات پر اگر آسمان خون کے آنسو روئے اور زمین پر رنگین آنسوؤں کی ندیاں بہہ جائیں تب بھی کم ہے، کیونکہ اس بزرگ قوم کے خمیر میں تین چیزیں خاص طور پر نمایاں تھیں (۱) تمنائے آزادی (۲) حب وطن اور (۳) استقلال و پامردی۔

مسٹر پٹیل کی وفات نے ہندوستان کو ایک عظیم المرتبت تجربہ کار جرنیل، ایک جہاندیدہ مدبر اور ایک جانباز لیڈر سے محروم کر دیا ہے۔ ہند جدید کے موجودہ دور میں مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، برادران پٹیل اور پنڈت جواہر لال نہرو ہی ایسے اصحاب ہیں جن کا نقش عرصہ دراز تک ملک کی سیاسی تاریخ میں باقی رہیگا۔

مرحوم کا پورا نام وٹھل بھائی جھفر بھائی پٹیل تھا۔ آپ گذشتہ صدی کے وسط میں موضع کرانند ضلع کھیڑا ملک گجرات میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے بزرگوار گجرات کے پٹی دار تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے بمبئی یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۰۶ء میں انگلستان تشریف لے گئے جہاں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ۱۹۰۸ء میں واپس ہوئے اور بمبئی میں پریکٹس کرنے لگے۔ چونکہ آپ میں فہم و فراست اور عقل و ذہانت، ودیعت قدرت تھی، اس لئے آپ کا کام بہت جلد چلنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں آپ ایک مشہور بیرسٹر ہو گئے۔

۱۹۱۳ء میں آپ نے بیرسٹری ترک کر کے ملک کے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا، چنانچہ چھ سال تک آپ بمبئی کی قانونی کونسل کے ممبر رہے۔ ۱۹۱۸ء میں بمبئی کونسل کی طرف سے آپ امپیریل کونسل کے لئے نامزد کئے گئے جہاں آپ نے آئرلینڈ کے لیڈر مسٹر پارنل کی حکمت عملی پر چلنے کی کوشش کی

یعنی جہاں آپ کو فتح پانا دشوار معلوم ہوتا تھا وہاں آپ گورنمنٹ کے کام میں کوئی نہ کوئی سخت رکاوٹ پیدا کر دیتے تھے۔ اس پالیسی میں آپ کو کامیابی بھی ہوئی اور ملک میں نام بھی ہوگیا، چنانچہ آپ ملک کی بیسیوں کانفرنسوں کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے، مثلاً لوکل سلف گورنمنٹ کانفرنس، کاٹھیاوار پولٹیکل کانفرنس، بڑودہ پرجا کانفرنس، گجرات پولیٹیکل کانفرنس، بمبئی پریسیڈنسی پولیٹیکل کانفرنس بیجاپور، ستارہ ڈسٹرکٹ کانفرنس، وغیرہ سب آپ ہی کی صدارت میں ہوئیں۔ بمبئی کی اسپشل کانگریس منعقدہ ۱۹۱۸ء کی استقبالیہ کمیٹی کے بھی آپ ہی صدر تھے۔ اس کے علاوہ تین سال تک آپ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے جنرل سکرٹری رہے۔ بمبئی کارپوریشن کے چیرمین بھی آپ منتخب ہوئے۔

اگرچہ مسٹر پٹیل مرحوم مہاتماجی کے عزیز ترین دوستوں میں تھے لیکن بعض امور میں اُن کو مہاتماجی سے سخت اختلاف تھا، اس پر بھی وہ گاندھی جی کی ہمیشہ بے انتہا عزت و احترام کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جب ۱۹۳۰ء میں مہاتماجی نے تحریک عدم تعاون کا جھنڈا بلند کیا تو مسٹر پٹیل فوراً اسمبلی کی صدارت سے مستعفی ہو کر گاندھی جی کے جھنڈے تلے آ کھڑے ہوئے اور پوری سرگرمی سے مصروف کار ہوگئے۔ بارڈولی کانفرنس میں جب سول نافرمانی کا ریزولیوشن پہلے پہل پاس ہوا تھا تو آپ ہی اس کے صدر تھے، اس وقت تمام تحریک کے آپ ہی انچارج تھے، اور جب واقعہ چوراچوری کے بعد مہاتماجی نے سول نافرمانی کے التوا کا حکم دیا تو مرحوم ہی نے ان کے فیصلہ پر سب سے پہلے اعتراض کیا۔ اس کے بعد سول نافرمانی کے متعلق ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی جس کے ایک ممبر مرحوم بھی تھے۔ اسی کمیٹی کی تحقیقات کے بعد سوراج پارٹی قائم ہوئی۔

گیا کانگریس میں جب دیش بندھو سی۔ آر۔ داس کی زیر صدارت سوراج پارٹی کی طرف سے کونسلوں اور اسمبلی پر قبضہ کرنے کا پروگرام پاس ہوا تو پٹیل مرحوم بھی سوراج پارٹی میں شامل ہوگئے اور حلقۂ بمبئی کی طرف سے آپ کو دو مرتبہ اسمبلی کا ممبر منتخب کیا گیا۔

۱۹۲۵ء میں گورنمنٹ کے نامزد کردہ پریسیڈنٹ اسمبلی سر فریڈرک وائٹ ریٹائر ہوگئے اور گورنمنٹ نے پہلی مرتبہ ممبران اسمبلی کو اپنا پریسیڈنٹ منتخب کرنے کا حق دیا تو آپ گورنمنٹ اور اپنے مقابل کی سخت مخالفت کے باوجود اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے۔

اسمبلی کی کرسی صدارت پر متمکن ہوتے ہی آپ نے اعلان کر دیا کہ پریسیڈنٹ اسمبلی کی حیثیت سے آئندہ وہ کسی پارٹی سے وابستہ نہ سمجھے جائیں۔ اس اعلان پر سوراج پارٹی نے بھی آپ کو ممبری کے فرائض سے آزاد کر دیا۔ غرض آپ نے اسمبلی کی صدارت کے فرائض قطعی غیر جانبداری اور اس

خوش اسلوبی سے انجام دینے شروع کئے جس سے پارلیمنٹ کی بہترین روایات کے مطابق کام ہوتا گیا۔

جن لوگوں نے پٹیل مرحوم کو اسمبلی کی صدارت کرتے دیکھا ہے وہ اُن کی وجیہ اور رُعب دار وضع قطع، اُن کی زبردست مقناطیسی شخصیت، اور اُن کی گرجنے والی شاندار آواز کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے، آہ وہ ان کا ڈھیلا ڈھالا گاؤن، وہ اُن کی بھورے گھونگریالے بالوں والی صدارتی ٹوپی (Wig) اور وہ اُن کی سفید لمبی داڑھی کس قدر خوشنما اور پُر دبدبہ معلوم ہوتی تھی۔ مرحوم کی بے پناہ قوت استدلال اور طلاقت لسانی کے آگے بڑے بڑے تجربہ کار ممبران گورنمنٹ کا ناطقہ سربگریباں ہو جاتا تھا۔

نومبر ۱۹۲۶ء میں آپ دوبارہ اسمبلی کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے، اس دفعہ کسی نے مقابلہ نہیں کیا بلکہ آپ اتفاق رائے سے صدر منتخب ہوئے۔ اس وقت کے ہوم ممبر سر الگزینڈر موڈیمن مرحوم نے بھی نہایت شاندار اور پاکیزہ الفاظ میں آپ کی تعریف کی تھی اور اس میں شک نہیں کہ مسٹر پٹیل کی صدارت ملک کی سیاسی جد وجہد اور آئینی ترقی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگی۔ آئینی حدود کے اندر صدر اسمبلی کے حقوق و اختیارات میں جو توسیع ممکن تھی آپ نے اُسے ملک کی خاطر حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ آپ کو اس کے لئے اُولوالعزمی کے ساتھ انتہائی اخلاقی جرأت سے بھی کام لینا پڑا۔ پارلیمنٹری طریقوں سے بھی آپ کو غیر معمولی واقفیت حاصل کرنا پڑی، جس آزادی، بلند ہمتی اور دلاوری کے ساتھ آپ کو اپنے آئینی حقوق اور منصبی اختیارات کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں سے برسرپیکار ہونا پڑا اُس نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ آپ آئینی جنگوں میں ہمیشہ قانون کے اندر اور حق بجانب ہوتے تھے اس لئے ہمیشہ آپ ہی کو فتح حاصل ہوتی تھی۔ آپ کی وجہ سے اُس وقت کے ہوم ممبر سر کریرار کو بعض اوقات سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ اسمبلی میں فوجی مصارف پر بحث ہو رہی تھی کہ اُسی دَوران میں ہز اکسلنسی کمانڈر ان چیف اُٹھ کر باہر چلے گئے، ممبران اسمبلی نے اس حرکت کو بجا طور پر اپنی توہین سمجھا۔ چنانچہ مسٹر پٹیل نے کمانڈر انچیف کو بہت کچھ فہمایش کی۔ ایک بار ایک انگریزی اخبار نے آپ کے خلاف زہر اُگلنا شروع کیا تھا مگر آپ نے اُس کے ایڈیٹر کو اسمبلی میں سر اجلاس معافی مانگنے پر مجبور کیا۔ بہرحال آپ نے اسمبلی کی صدارت اِس شان کے ساتھ کی تھی کہ تمام دنیا ہندوستان کی عزت کرنے لگی تھی اور خود گورنمنٹ کو اُن کی قابلیت اور اُولوالعزمی کا لوہا ماننا پڑا۔ اصل یہ ہے کہ پریسیڈنٹ اسمبلی کی حیثیت سے اُنھوں نے دُنیا میں ہندوستان کی سب سے بڑی قانون ساز مجلس اور اُس کے صدر کا پورا وقار قائم کر دیا اور گورنمنٹ حکام کو اُن کی قابلیت اور لیاقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا تھا۔

پٹیل ہی کی صدارت کا زمانہ تھا کہ لوگوں کو گاندھی ٹوپی پہننے کا بہت شوق ہو گیا اور حکومت نے اُن کا

استعمال ناگوار ہوا، پٹیل نے اس بارے میں اہل ملک کے حقوق کی حفاظت کا یہ طریقہ نکالا کہ اپنی مخصوص صدارتی ٹوپی کے بجائے آپ بھی گاندھی ٹوپی پہنکر اسمبلی کی صدارت کرنے لگے جس کے آگے یاران طریقت کو سر جھکانے کے سوائے کوئی چارہ کار نہ رہا۔ اس کے بعد جب ۱۹۲۶ء میں آپ انگلستان تشریف لیگئے اور ہز مجسٹی ملک معظم سے شرف ملاقات حاصل کیا تو اس وقت بھی آپ کے سر پر کھدر کی گاندھی ٹوپی تھی۔

اسی سیر و سیاحت کے سلسلے میں آپ نے دار العوام کے اجلاسوں میں شریک ہوکر پارلیمنٹری طور و طریق کا مطالعہ کرنا شروع کیا، چنانچہ انگلستان کے اسپیکر پارلیمنٹ سے بھی اکثر تبادلۂ خیالات کیا۔ اس زمانہ میں لارڈ برکنہیڈ وزیر ہند تھے، آپ ان سے بھی ملے اور تبادلۂ خیالات کیا۔ ایک طرف پٹیل مرحوم اور دوسری طرف سر تیج بہادر سپرو نے اس بات کی کوشش کی کہ لارڈ اروِن، مہاتما گاندھی، اور پنڈت موتی لال نہرو مرحوم میں ملاقات کرا کے مصالحت کرا دی جائے۔ چنانچہ ۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کو لارڈ اروِن وائسرائے ہند سے مہاتما جی کی ملاقات اور بات چیت ہوکر مصالحت کی بنیاد پڑ گئی۔

انگلستان کے بعد آپ آئرلینڈ بھی تشریف لے گئے، جہاں آپ نے شمالی اور جنوبی دونوں پارلیمنٹوں کی کارروائیاں دیکھیں، اور مشہور محب ملک ڈی ویلرا سے بھی ملاقات کی۔ بہر حال آپ نے اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ جانے دیا، کبھی انگلستان پہونچے اور مخالفین ہند کی مجلسوں میں حریت پرورانہ دھواں دھار تقریریں کیں، کبھی آئرلینڈ گئے اور ڈی ویلرا کو ہندوستان کا دوست بنایا، اور کبھی امریکہ تشریف لے گئے اور وہاں بین الاقوامی رائے کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔

جون ۱۹۲۸ء میں جب آپ کے برادر عزیز سردار ولبھ بھائی پٹیل نے تعلقہ بردولی میں عدم ادائے مالیہ کی تحریک شروع کی تو آپ نے تحریک مذکور کی حمایت میں ایک خط لکھا اور اپنی تنخواہ میں سے ایک ہزار روپیہ ماہوار کی رقم اس تحریک کی امداد میں بھیجی، لیکن اسی کے ساتھ آپ نے لارڈ اروِن اور سر جان سائمن سے بھی اپنے تعلقات خوشگوار رکھے۔ سر جان سائمن اپنے کمیشن کے ساتھ ہندوستان آئے تھے لیکن دہلی پہونچکر کسی وجہ سے آپ صدر اسمبلی سے رسمی ملاقات نہ کر سکے، مسٹر پٹیل نے اپنے عہدے کی شان برقرار رکھنے کے لئے اس کوتاہی کا اس وقت نوٹس لیا جب سر جان سائمن نے اسمبلی کے اجلاس کی کارروائی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ صاحب موصوف کو آپ کے در دولت تک آنا پڑا جس کے بعد مسٹر پٹیل نے آپ کو چائے کی دعوت دی اور اسمبلی میں معزز مہمان کی حیثیت سے مدعو فرمایا۔

اپریل ۱۹۲۹ء میں آپ اسمبلی کی صدارت فرما رہے تھے کہ عین اجلاس میں دو بم پھینکے گئے۔ آپ

اس خون آشامانہ فعل کی سخت مذمت کی لیکن مقدمہ سازش میرٹھ کی سماعت کے دوران میں جب گورنمنٹ نے مسودۂ قانون حفاظت پیش کیا تو آپ نے اس کی پیشی مقدمہ سازش کے فیصلہ تک خلاف قاعدہ قرار دی۔

اس کے بعد جب سوراج پارٹی کے ممبر اسمبلی سے اٹھ کر چلے گئے تو انھوں نے مرحوم پر اسمبلی کی صدارت سے مستعفی ہو جانے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ مگر آپ نے ان کی درخواست کو اس بنا پر قبول نہ کیا کہ آپ کا کسی خاص پارٹی سے کوئی تعلق باقی نہ تھا اب یہ معلوم ہوا کہ بعض موقعوں پر جب مسٹر پٹیل نے اسمبلی کی صدارت سے مستعفی ہو جانے کا قصد کیا تو ہر دفعہ لارڈ اروین نے اپنے اثر سے آپ کو مستعفی نہیں ہونے دیا مگر جنوری ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ سے پھر بحث چھڑ گئی، بات یہ تھی کہ اسمبلی میں بم پھینکے جانے کے بعد گورنمنٹ نے وزیٹروں کی دیکھ بھال میں سختی سے کام لینا چاہا اور ایک خاص حفاظتی پولیس بھی تعینات کر دی لیکن آپ نے اس پر سخت اعتراض کیا اور پریسیڈنٹ اسمبلی کی منظوری حاصل کیے بغیر تمام حفاظتی تدابیر کو خلاف قاعدہ قرار دیا۔ آخر میں گورنمنٹ کو ان ہی کی بات ماننا پڑی۔

اپریل ۱۹۳۰ء میں جب سول نافرمانی کے سلسلہ میں ہزارہا آدمیوں کی گرفتاری عمل میں آئی تو مسٹر پٹیل کی حب الوطنی جوش میں آئی اور آپ نے مئی ۱۹۳۰ء میں اسمبلی کی صدارت سے استعفا دیدیا۔ اس کے بعد آپ نے سانحہ پشاور کی تحقیقاتی کمیٹی کی صدارت کی مگر آپ کی مرتبہ رپورٹ کو گورنمنٹ نے ضبط کر لیا۔ آپ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے، چنانچہ ڈاکٹر انصاری، پنڈت مالوی وغیرہ کے ساتھ آپ کو بھی چھ ماہ قید کی سزا کا حکم ہوا آپ انبالہ جیل میں تھے جب آپ نے قیدی ہونے کی وجہ سے انسپکٹر جنرل جیلخانجات پنجاب سے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا تھا۔ انبالہ سے آپ کو خرابی صحت کی وجہ سے جلد رہا کر دیا گیا۔

۱۹۳۲ء میں مسٹر گاندھی کی گرفتاری کے بعد کانگریس کی رہنمائی کا فرض آپ نے اپنے ذمے لے لیا جس پر آپ بھی گرفتار ہوئے اور دو سال قید کی سزا کا حکم سنایا گیا لیکن آپ کی صحت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ گورنمنٹ نے آپ کو اس شرط پر رہا کر دیا کہ آپ ہندوستان چھوڑ کر بیرون ملک رہیں۔ چنانچہ رہائی کے بعد معالجہ و تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے آپ یورپ کو روانہ ہو گئے۔ کیا معلوم تھا کہ اب ابنائے وطن کو دوبارہ اپنے مخدوم وجان نثار محب کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہو گی۔

یورپ میں آپ نے بہت کچھ علاج کیا لیکن افاقہ نہ ہوا اور حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ بالآخر ۲۲۔ اکتوبر کو بروز اتوار ڈیڑھ بجے دن کے وقت آپ اس جہان فانی سے سورگ لوک کو سدھار گئے۔

آپ کے حواس آخری دم تک قائم رہے اور آپ مسٹر سوبھاش چندر بوس، مسٹر بھوگی لال، اور مسٹر سنتھالال سے برابر گفتگو کرتے رہے۔ وفات سے کچھ دیر قبل آپ نے حسب ذیل آخری پیغام دیا جس کا

حرف حرف حبِ وطن میں ڈوبا ہوا ہے:۔

"میرے تمام اہلِ وطن اور میرے تمام احباب کو خواہ وہ ہندوستان میں ہوں یا دنیا کے کسی اور حصہ میں میری طرف سے دعا پہونچا دو۔ مرنے سے پہلے میں دعا کر رہا ہوں کہ خدا ہندوستان کو جلد سے جلد آزادی عطا کرے۔"

آہ اب ایسا پرخلوص، صاحب دل دردمند اور وفا شعار محبِ وطن کہاں دیکھنے میں آئیگا۔ ایشور آپ کی روحِ پرفتوح کو غریقِ رحمت کرے۔

مادۂ تاریخ: ہمارے مکرم مولوی محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔اے نے آپ کی وفات کی تاریخ اس فقرہ سے نکالی ہے:۔
"مسٹر پٹیل بجناں رفتہ"
۱۹ ۳۳

نادر شاہ مرحوم

دوسری جنگ افغانستان کے بعد جب افغانستان کی حکومت امیر عبدالرحمٰن خاں کے ہاتھ میں آئی اور امیر یعقوب خاں کو انگریزوں نے ہندوستان لاکر ڈیرہ دون میں نظر بند کر دیا تو دیگر امرا، اور سرداران کے ساتھ امیر موصوف کے داماد سردار یحییٰ خاں بھی ہندوستان آئے اور ڈیرہ دون میں قیام پذیر ہوئے یہیں ۱۸۸۳ء میں سردار یحییٰ خاں کے بیٹے سردار محمد یوسف کا فرزند نادر خاں پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نونہال کی پرورش اور تربیت امیرزادوں کی طرح ہوئی اور علوم و فنون جدیدہ کے ساتھ ساتھ دینیات کی بھی تعلیم دی گئی۔ چنانچہ اِس سلسلے میں نادر خاں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سے بھی مستفید ہوئے۔

اپنے عہد سلطنت کے آخری دور میں امیر عبدالرحمٰن نے جلاوطن افغان سرداروں کی اولاد کو افغانستان واپس آنے کی اجازت دیدی اور عبدالرحمٰن خاں کے بعد حبیب اللہ خاں کے ابتدائی دورِ حکومت یعنی ۱۹۰۱ء میں نادر خاں کا خاندان بھی اپنے وطن کو واپس گیا جہاں اُن کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اور وہ اپنے وطن میں عزت و احترام کے ساتھ آباد ہو گئے۔ اور کچھ عرصے کے بعد امیر حبیب اللہ خاں نے نادر خاں کی ہمشیرہ سے شادی کر لی۔ اسی ملکہ کے بطن سے شہزادہ اسداللہ جان پیدا ہوئے تھے۔ نادر خاں کو ابتدائے عمر ہی سے فن سپہگری سے ایک خاص شوق تھا، چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں ان کی فوجی معلومات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے ان کو ۱۹۰۳ء میں افغان فوج میں کرنیل بنا دیا۔ نادر خاں نے اس قدر محنت اور دیانت سے اس عہدہ کا کام کیا کہ دو ہی سال بعد یعنی ۱۹۰۵ء میں آپ کو برگیڈیر کے درجہ پر ترقی دیدی گئی

اور افغان سپاہ کی جدید تنظیم و تربیت آپ کے سپرد ہوئی۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں جب امیر حبیب اللہ خاں سیر و سیاحت کے لئے ہندوستان تشریف لائے تو نادر خاں بھی اُن کے ہمرکاب تھے اور اس وقت افغان سپاہیوں کی چستی چالاکی فرمانبرداری اور ڈسپلن دیکھ کر سب لوگ دنگ رہ گئے اور افغان سپاہیوں کے ساتھ اُن کے افسر اعلیٰ نادر خاں کی قابلیت کا سکہ بھی دلوں پر بیٹھ گیا۔ ہندوستان سے واپسی پر امیر حبیب اللہ خاں نے افغانستان کے طول و عرض کا دورہ کیا تو اُس وقت بھی نادر خاں اُن کے ہمرکاب تھے۔ امیر صاحب نادر خاں کی مستعدی و قابلیت سے اس درجہ خوش ہوئے کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے ان کو جرنیل کا معزز عہدہ عطا فرمایا۔

دو سال بعد یعنی سنہ ۱۹۱۲ء میں افغانستان کے جنوبی سمت میں قبیلہ منگل نے شورش برپا کی اور یہ بغاوت اس قدر زور پکڑ گئی کہ باغیوں نے شاہی فوج کو شکست فاش دیدی، اس پر امیر حبیب اللہ خاں نے نادر خاں کو شاہی فوج دیکر باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ نادر خاں نے باغیوں کو شکست پر شکست دیکر جنوب میں چاروں طرف امیر صاحب کی دھاک بٹھادی۔ اس شاندار فتح کے بعد نادر خاں پہلے افغانستان کے نائب سپہ سالار اور سنہ ۱۹۱۳ء میں کمانڈر انچیف بنادئے گئے۔ آپ نے اپنے عہد میں افغانی فوج کو غیر معمولی ترقی دی اور فوجی نظم و نسق میں قابلقدر اصلاحیں کیں، مثلاً پہلے سپاہیوں کو تنخواہ بصورت جنس ملا کرتی تھی آپ نے یہ طریقہ موقوف کر کے سب کی تنخواہیں نقد میں مقرر کردیں جس سے تمام فوج آپ کے نام کا کلمہ پڑھنے لگی۔ اور یہی ہردلعزیزی سنہ ۱۹۱۹ء کی تیسری جنگ افغانستان میں کام آئی۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں شکارگاہ میں قتل کردئے گئے اور سردار نصر اللہ خاں نے جلال آباد اور امان اللہ خاں نے کابل میں اپنی اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا لیکن نصر اللہ خاں اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوئے اور ملک نے امان اللہ خاں کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا۔ چونکہ قتل کے وقت امیر حبیب اللہ خاں کے ساتھ نادر خاں بھی تھے اس لئے انھیں جدید حکومت نے گرفتار کر کے قید کردیا۔ لیکن چند روز بعد جب امان اللہ خاں کے پاؤں جم گئے تو نادر خاں کو رہا کر کے اُن کا سابق منصب بحال کردیا گیا۔

امان اللہ خاں کے تخت نشین ہونے کے بعد جب گورنمنٹ ہند نے اُن کو سرکاری طور پر تسلیم کرنے میں چون وچرا سے کام لیا تو سنہ ۱۹۱۹ء میں ہندوستان اور افغانستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس میں جنوبی کمان جنرل نادر خاں کے سپرد تھی۔ نادر خاں نے اس لڑائی میں فنون جنگ میں وہ کمال دکھایا کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ آپ نے ایک طرف وزیرستان میں انگریزی اقتدار کو زک پہونچانے کی کوشش کی اور دوسری طرف انگریزی علاقہ میں گھس کر تھل پر حملہ کردیا۔ اس حملے کا اثر یہ ہوا کہ انگریزی حکومت صلح پر مجبور ہوگئی اور جنرل نادر خاں

ہی حکومت ہند سے غیر الطّ صلح طے کرنے کے لئے ہندوستان بھیجے گئے۔ یہاں جنرل مذکور نے اپنے حسن تدبّر اور سیاست دانی کا بھی ثبوت دیا۔ اور دیگر مطالبات کے ساتھ آپ نے وزیرستان کے اُن تمام باغی پٹھانوں کو جو افغانستان کی ہمدردی میں انگریزوں سے لڑے تھے معافی دلادی۔ اس کامیابی سے نادر خاں کا اثر واقتدار اس قدر بڑھ گیا کہ تمام قبائل افغانستان ان کو قومی ہیرو سمجھنے لگے حتیٰ کہ ملّاؤں نے بھی ان کا لوہا مان لیا۔

جدید صلحنامہ کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے افغانستان کو ایک خودمختار سلطنت کی حیثیت سے تسلیم کرلیا چنانچہ اب اُس کی خارجی پالیسی حکومت ہند کے ہاتھ میں نہیں رہی اور اُس کے سفیر براہ راست لنڈن اور دیگر ممالک یورپ میں مقرر ہونے لگے۔ اس شاندار فتح کی یادگار میں کابل میں ایک مینار استقلال تعمیر ہوا اور نادر خاں سپہ سالار کے علاوہ وزیر جنگ بھی مقرر ہوگئے۔

اِس عظیم الشان واقعہ کے بعد جنرل نادر خاں کی ہردلعزیزی میں اس قدر اضافہ ہوگیا کہ تمام اہل افغانستان کے دلوں میں اُن کی ہمت واستقلال اور اولوالعزمی وقابلیت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ خصوصاً افغانستان کے جنوبی حصّے میں تو اُن کا اثر ورسوخ شاہ امان اللہ سے بھی بڑھ گیا۔ امان اللہ کے اصلاحی پروگرام میں یہ اثر حائل ہونے لگا جس کی وجہ سے شاہ موصوف نے نادر خاں کو کچھ عرصہ کے لئے افغانستان سے باہر بھیجدینا ہی مناسب سمجھا چنانچہ ۱۹۲۴ء میں آپ کو پیرس میں افغانی سفیر مقرر کرکے یورپ کو روانہ کردیا گیا۔ اس حیثیت سے بھی آپ نے افغانستان کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ لیکن جنرل موصوف اور شاہ امان اللہ خاں کے درمیان اختلافات بڑھتے ہی گئے جن کی وجہ سے نادر خاں ۱۹۲۶ء میں سفارت سے مستعفی ہوکر فرانس کے قصبہ نیس میں جاکر امن وسکون کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اس کے بعد جب ۱۹۲۸ء میں امان اللہ خاں اپنے مشہور دورہ کے سلسلے میں یورپ تشریف لے گئے تو اُنھوں نے نادر خاں کو افغانستان واپس بلانا چاہا لیکن آپ نے اس استدعا کو قبول نہیں کیا اور اپنے بھائیوں کے ساتھ فرانس ہی میں مقیم رہے۔

۱۹۲۹ء میں جب امان اللہ خاں کی جلدبازانہ اصلاحات کی بدولت افغانستان میں عام بغاوت رونما ہوئی اور حکومت کا تمام شیرازہ درہم برہم ہوگیا تو امان اللہ خاں کو بچہ سقہ سے شکست کھاکر قندھار کی طرف بھاگنا پڑا اُس وقت امان اللہ خاں نے پھر جنرل نادر خاں کو یاد کیا چنانچہ وہ اپنے بھائیوں سمیت ہندوستان آئے اور امان اللہ خاں کو تخت کابل پر بحال کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر جب کچھ دن پشاور ٹھہر کر آپ پاراچنار کی طرف سے افغانستان میں داخل ہوئے اور امان اللہ خاں نے جو اس وقت قندھار کے قریب بچہ سقہ سے برسرِ جنگ تھے آپ کو بلایا تو آپ ٹال گئے اسی اثنا میں آپ نے ایک ہفتہ وار اخبار "اصلاح" کے نام سے جاری کیا جو سائیکلو اسٹائل پر چھپتا تھا۔ اور

اسکے ذریعہ پروپیگنڈا کرکے آپ نے ایک لشکر جمع کیا اور بچہ سقہ کے خلاف جہاد کا اعلان کرکے دھاوا بول دیا۔ آپ کی فوج کا ایک حصہ آپ کے بھائی جنرل شاہ ولی خاں کی کمان میں مشرقی سمت سے بڑھا، دوسرا حصہ آپ کے دوسرے بھائی جنرل شاہ محمود خاں کی ماتحتی میں جنوب کی طرف سے روانہ ہوا اور تیسرا حصہ خود آپ کی کمان میں علی خیل میں مقیم رہا۔ اسی اثنا میں امان اللہ خاں بچہ سقہ سے شکست کھا کر تخت و تاج سے دستبردار ہو کر اٹلی چلے گئے۔

بچہ سقہ کی فوج کو نادر خاں کے لشکر نے ہر جگہ شکست دی۔ ان لڑائیوں میں علاقہ وزیرستان کے وزیریوں نے نادر خاں کی بڑی مدد کی۔ بہر حال متواتر شکستوں کے بعد بچہ سقہ نے بالآخر کابل میں مقابلہ کیا لیکن یہاں بھی شکست کھائی۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ ہمیشہ یادگار رہیگا کہ بچہ سقہ جس قلعہ میں خود محصور تھا اُسی میں اُس نے نادر خاں کے بال بچوں کو بھی قید کر رکھا تھا لیکن نادر خاں نے اپنے بھائی جنرل شاہ ولی خاں کو حکم دیا کہ وہ بیوی بچوں کی کوئی پروانہ کریں اور قلعہ کو توپ سے اڑا دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بچہ سقہ تاب مقاومت نہ لا کر بھاگا اور اکتوبر ۱۹۲۹ء میں جنرل شاہ ولی خاں فتحمندانہ طور پر کابل میں داخل ہو گئے بعد ازاں بچہ سقہ گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔ اس کے بعد نادر خاں لوی جرگہ کی رائے سے نادر شاہ کے نام سے افغانستان کے تخت شاہی پر متمکن ہو گئے۔ آپ نے تمام رعایا کو مساوی حقوق دینے اور آئینی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا، اور مسکرات و منشیات کا استعمال ممنوع قرار دیا، اور تجارت، زراعت اور تعلیم کو ترقی دینے اور ریلوے اور نہروں کی تعمیر کرنے کا وعدہ کیا۔ نومبر ۱۹۲۹ء میں برطانیہ نے بھی نادر شاہ کی حکومت تسلیم کر لی۔

اپنے مختصر دور سلطنت میں نادر شاہ نے وہی پالیسی جاری رکھی جو امان اللہ خاں نے شروع کی تھی۔ مگر اصلاح و ترقی کے پروگرام میں انھوں نے وہی امور جاری کئے جو قدامت پرست افغانوں کو ناگوار نہ ہوئے۔ آپ نے افغانی فوج کی بھی تنظیم و ترتیب کی اور اسی تنظیم کی بدولت تمام ملک میں امن و امان قائم رکھا اسی کے بھروسے پر وہ اپنے خلاف مخالفت کو غیر معمولی سختی سے دباتے رہتے۔

۱۹۳۲ء کے آخری دنوں میں جنوبی سمت میں ایک سخت شورش برپا ہوئی جو ان انقلاب انگیزانہ سازشوں کا نتیجہ تھی جو بعض سرداروں نے کابل میں بیٹھ کر کی تھیں یہ بغاوت سختی کے ساتھ فرو کی گئی اور سازش کا بھی انکشاف ہو گیا۔ اور اسی سلسلہ میں نادر شاہ نے امان اللہ خاں کے وفادار جرنیل اور یوسف زئی قبیلہ کے طاقتور سردار جنرل غلام نبی خاں چرخی اور بعض دیگر سربرآوردہ سرداروں کو نہایت بیرحمی سے قتل کرا دیا۔ اسی طرح اور بھی کئی مشہور لوگ قتل کر دیے گئے جس سے ملک میں آپ کے مخالفوں کی تعداد میں کچھ نہ کچھ

اضافہ ہوتا گیا۔

نادر شاہ نے اس تھوڑے ہی عرصہ میں افغانستان میں بہت سی ملکی اصلاحیں جاری کردیں مثلاً وضع قوانین کے لئے ایک مجلس شوریٰ کی بنیاد بھی ڈال دی۔

نادر شاہ نے غلامی اور بیگار کا بھی انسداد کیا اور ملک میں جبریہ تعلیم کا سلسلہ جاری کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک اقتصادی پروگرام مرتب کیا۔ بہت سی نئی سڑکیں تعمیر اور پرانی سڑکوں کی مرمت کرائی، انھیں میں سے ایک سڑک کابل سے سرحد روس تک جاتی ہے۔ اس وقت کابل اور پشاور کے درمیان بھی ایک جدید سڑک زیر تعمیر ہے۔ جرمن ماہرین کے صلاح ومشورہ سے تعمیر ریلوے جات کے لئے بھی ایک اسکیم تیار کی گئی اور پایۂ تخت سے سرحد تک ہوائی ڈاک کا سلسلہ قائم کرنے کا بھی خیال تھا۔ جرمن ماہرین کی امداد سے افغانستان میں ہوائی بیڑہ بھی قائم کیا گیا ہے۔

تعلیم کی ترقی کے لئے ملک بھر میں بہت سے پرائمری اسکول جاری کئے اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کابل میں یونیورسٹی قایم کرنے کی اسکیم بھی زیر غور تھی۔ اسی سلسلہ میں نادر شاہ نے سر راس مسعود، سر محمد اقبال اور مولانا سید سلیمان ندوی کو کابل میں مشورہ کی غرض سے مدعو کیا تھا۔

نادر شاہ نے ہمسایہ سلطنتوں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کی انتہائی کوشش کی، اسی لحاظ سے انھوں نے روس سے تجارتی تعلقات قائم کئے اور حکومت برطانیہ اور گورنمنٹ آف انڈیا سے بھی اپنے تعلقات شگفتہ رکھے۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء کے موسم گرما میں جب بعض مفسدہ پردازوں اور شورش پسندوں نے نادر شاہ کے خلاف قبائل میں ایجی ٹیشن شروع کیا تو گورنمنٹ ہند نے اس شورش کو فرو کرنے میں ہوائی جہازوں سے مدد دی۔ انگلستان۔ فرانس۔ جرمنی۔ اٹلی۔ پولینڈ۔ جاپان۔ ترکی اور ایران وغیرہ سے بھی انھوں نے دوستانہ تعلقات اور تجارتی معاملات قائم کرلئے۔

نادر شاہ کے عہد میں افغانستان کی آمدنی بھی بہت بڑھ گئی، یعنی سترہ لاکھ پچاس ہزار پونڈ سے بڑھکر اب اس کی آمدنی بیس لاکھ پونڈ سالانہ ہوگئی ہے۔ کچھ دنوں سے کاغذی نوٹ بھی جاری ہیں۔ ملک کے اندر اور ممالک غیر سے تار برقی اور ٹیلیفون کے سلسلے بھی قائم ہوگئے ہیں۔ زچہ وبچہ کے لئے شفا خانہ اور ایک دار الصحت (سینی ٹوریم) بھی قائم ہے۔ مگر ان تمام اصلاح وترقی کے باوجود ان کی سخت گیری ایک ذی اثر طبقے کو ناگوار تھی۔ افغانستان میں فرمانرواؤں کا قتل ایک معمولی بات ہے۔ افسوس ۸۔ نومبر ۱۹۳۳ء کی سہ پہر کو جب نادر شاہ قصر دلکشا میں ایک فٹ بال میچ کی کامیاب ٹیم کو انعام تقسیم کرنے گئے تو عبد الخالق نامی ایک نوجوان طالب علم اور فٹ بال کے کھلاڑی نے تین فیر کرکے بادشاہ موصوف کو قتل کردیا

معلوم ہوا ہے کہ قاتل نے اقرار جرم کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس نے نادر شاہ سے اپنے باپ کے آقا جنرل غلام نبی خاں کے قتل کا انتقام لیا ہے۔ جنھیں اسی تاریخ کو ۱۹۳۲ء میں نادر شاہ نے نہایت بیدردی سے قتل کرادیا تھا۔ اس کے بعد بھی کئی نامور لوگوں کے ساتھ اسی قسم کی سختی روا رکھی گئی۔ ہم کو نادر شاہ کے قتل کا افسوس ہے۔ لیکن کیا کیا جائے۔

گندم از گندم بروید جو ز جو

فی الحال اُن کا ایک اکلوتا بیٹا ظاہر خان ان کا جانشین ہوا ہے۔ دیکھئے ابھی کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے یا افغانستان کی حکومت نادر شاہ ہی کے خاندان کے سپرد رہتی ہے۔

تنقید کتب

"دیکھا جائیگا!"

مصنفہٗ مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے ایل ایل۔ بی وکیل چیفکورٹ جودھپور، مارواڑ ۲۰×۳۰ کی چھوٹی تقطیع ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ لکھائی چھپائی۔ کاغذ عمدہ۔ ٹائٹیل دیدہ زیب مجلد قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ: دفتر کتابت عظیم بیگ چغتائی وکیل جودھپور یہ کتاب جو مزاحیہ پیرایہ میں لکھی گئی ہے بلحاظ پلاٹ غالباً مرزا صاحب کی تمام کتابوں میں سب سے اچھی ہے۔ دو بوالہوس بھائی اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شریف زادہ ایک متمول لڑکی کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دونوں بھائیوں کی نظروں میں لڑکی کی دولت مگر تیسرے نوجوان کی نظر میں اس کے اوصاف ذاتی ہیں۔ امتحان میں دونوں بوالہوس بھائی ناکامیاب ہوتے ہیں اور تیسرا سچا عاشق عروس مراد سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہ کتاب آجکل کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب کے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کی زبان بھی مرزا صاحب کی بعض دیگر تصانیف سے اچھی ہے۔ اگرچہ اس میں بھی بعض بعض مقامات پر نامانوس فقرے موجود ہیں۔

جنت کا بھوت

یہ بھی مرزا عظیم بیگ چغتائی کا ایک مزاحیہ فسانہ ہے اور اس کے ٹائیٹل پر ایک مہیب تصویر بنائی گئی ہے کتاب کے نام سے مغالطہ ہوتا ہے کہ شاید اسمیں کسی ذات شریف کا بیان ہو لیکن درحقیقت اسمیں ایک میاں بیوی کا افسانہ ہے جسمیں بھوت کا پارٹ شوہر نے ادا کیا ہے قصہ پرلطف ہے مزید تفصیل کے لئے کتاب دیکھئے۔

ملنے کا پتہ: دفتر کتابت جودھپور۔ قیمت ۱۲/

تنقید کتب

مغل اور اردو[^1]

یہ اگرچہ بذات خود ایک مکمل کتاب ہے لیکن درحقیقت وہ نواب خیال کی ایک دوسری مبسوط کتاب داستان اردو کا ایک دلچسپ باب ہے جس کے مختلف حصے ملک کے اکثر علمی و ادبی رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں، اور یہ باب جسے مغل اور اردو کے نام سے شائع کیا گیا ہے اس بڑی کتاب کا شاہکار ہے۔

شروع میں نو صفحوں پر مصنف کی سوانحعمری اور شجرۂ نسب شائق احمد صاحب عثمانی کے قلم سے اور بیس صفوں پر مسٹر جمیل مظہری ایم۔ اے کا ایک مقدمہ ہے جس میں ان خدمات سے روشناس کرایا گیا ہے جو فاضل مصنف نے وقتاً فوقتاً اردو زبان و ادب کی انجام دیں۔ فہرست مضامین کے بعد اور شاہان مغلیہ کے نسب کے بعد اصل مضمون ۲۰۰ صفحات پر ختم ہوا ہے۔ کتاب کا خط بہت جلی ہے معمولی قلم سے اس کا تمام مضمون نصف حجم میں سما سکتا تھا۔ اس کے لائق مصنف نواب سید نصیر حسین خاں خیال کو اردو سے خاص انہماک ہے گو خیالی یا نظریاتی پہلو سے وہ اس کتاب کو دلچسپ بنانے میں ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن اسمیں انھوں نے منقول سے بہت کم کام لیا ہے۔ یعنی عہد بعہد کے شعراء کے کلام کا انتخاب یا مصنفین کی تحریروں کا اقتباس نہ ہونے کے برابر ہے۔ محض زبانی داستان سرائی کی گئی ہے جو محققین کے نزدیک مستند نہیں سمجھی جا سکتی۔

کتاب کی عبارت رنگین و فصیح اور صنائع بدائع لفظی و معنوی کے ساتھ سلیس و سادہ ہے۔ اور یہی نواب خیال صاحب کا طرز خاص ہے۔ آپ حسب موقعہ ضلع و جگت سے کام لینے میں بھی کوتاہی نہیں کرتے۔ مثلاً ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے پہلے فارسی کو نکالکر اردو کو دفتری زبان قرار دیا بعد ازاں اردو کو خارج کرکے انگریزی کو دفتری زبان بنا دیا۔ ان واقعات کو فاضل مصنف اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

"اب مغلوں اور تودڑمل کی دفتری زبان (فارسی) کا گلا گھونٹ دینا کیا مشکل تھا۔ مگر دانا جلد باز نہیں ہوتا مچھلی زور کرکے پھنسائی نہیں جاتی۔ تجربہ کار دریا میں اپنی ڈور ادھر ادھر چھوڑ کر بیٹھ جاتا اور سانس نہیں لیتا ہے مچھلی نے چارا کھایا اور بھاگی، سمجھی کہ کٹ اڑے۔ مگر زناتکاری اس وقت زور نہیں کرتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے۔

[^1]: مصنفہ نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال عظیم آبادی حجم ۲۶۸ صفحات قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ:۔ ایس اے عثمانی اینڈ سنز ۔ فیرس لین کلکتہ

مچھلی کے منہ میں ڈور کا کانٹا ہے، جائیگی کہاں؟ وہ پانی میں روڑی دھوپی، آخر تھکی گری اور مزے میں پکڑی گئی!
سیاسیات کا جال بھی یوں ہی بچھایا جاتا اور غریب مچھلیوں کو پہلے چار دیکر تھکایا جاتا پھر نکالکر ان کا چھلکا ادھیڑا جاتا ہے"

کتاب شروع سے آخر تک اس قدر دلچسپ ہے کہ ختم کئے بغیر چین نہیں پڑتا، ہماری رائے میں تحقیق سے قطع نظر محض ایک ادبی حیثیت سے بھی اس کو مقبول عام ہونا چاہیئے۔ البتہ بعض واقعات جو فاضل مصنف نے درج فرمائے ہیں محتاج تصدیق معلوم ہوتے ہیں مثلاً صفحہ ۵۴ پر فاضل مصنف نے نادر شاہی فوج کے ہاتھوں دہلی کے قتل عام کا ذکر کرتے ہوئے نواب عمدۃ الملک محمد امیر خاں المتخلص بہ انجام کے بارہ میں تحریر فرمایا ہے:۔

"نادر کے قہر و غضب کی آگ بھی انھی عمدۃ الملک نے بجھائی ۔۔۔۔ آخر عمدۃ الملک کمر کس کر اور جان ہتھیلی پر رکھکر اُس کے سامنے آئے۔ نادر نے پوچھا: "خیر باشد محمد امیر چہ میخواہی؟" اُنھوں نے دست بستہ عرض کی ؎

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی　　مگر کہ زندہ کنی خلق را دوبارہ کشی

یہ برجستہ و باموقعہ شعر سُنکر نادر نرم ہوا، تلوار میان میں کر کے کہا "خیر بخشیدم"

اسی پر فٹ نوٹ میں فاضل مصنف نے یہ حاشیہ بھی بڑھایا ہے کہ:۔

"بعض ناواقفوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس موقع پر آصف جاہ نادر کے پاس گئے اور اُس کے آتش غضب کو اُنھوں نے سرد کیا، مگر یہ صحیح نہیں۔"

نواب خیال کا یہ خیال دعویٰ بے دلیل ہے، کیونکہ مشہور عام یہی ہے کہ نادر شاہ کا غصہ آصف جاہ نے فرو کیا، ملاحظہ ہو تاریخ مظفر شاہی:۔

"نظام الملک فتح جنگ و اعتماد الدولہ قمر الدین خاں نصرت جنگ سر برہنہ کردہ بہ زانو زدہ بہ الحاح تمام حکم امان خواستند، نادر شاہ حکم امان دادہ داخل قلعہ ارک شد۔"

نواب صاحب کو اپنے خیال کی تائید میں تاریخی سندات پیش کرنا چاہیئے تھیں۔

دوسری بات یہ کھٹکتی ہے کہ فاضل مصنف کو دکن اور اہل دکن سے کچھ خاص مخالفت معلوم ہوتی ہے مثلاً (۱) حضرت ولی دکھنی کو اُردو کے تمام تذکرہ نویسوں نے غزل کا باوا آدم تسلیم کیا ہے، اور فارسی دیوان کے طرز پر اُردو دیوان کی ترتیب کا سہرا انھی کے سر رکھا ہے لیکن ولی کے متعلق فاضل مصنف نے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں (صفحہ ۵۹)

"اور تو اور ہمارے تذکروں میں میاں ولی دکھنی اُردو غزلوں کے باوا آدم کہے جاتے اور کم نظری کی وجہ سے آج تک وہ سراہے جاتے ہیں، مگر ایک ولی کیا کسی ولی نے زبان کی یہ کرامت کبھی نہیں دکھائی، حق یوں ہے کہ ولی محمد شاہ کے شروع زمانہ میں اپنا دیوان بغل میں دبائے، کھوٹے کھرے کی شناخت کے لئے دکھن سے دہلی کے

ٹکسال گھر تک آئے اور اُردو سیکھنے لگے۔ ولی بیچارے کو وہ زبان کہاں نصیب جو اُردوے معلّٰی کہی جاتی اور قلعہ معلّٰی اور دہلی کے امرا کے محلوں سے ابھی باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ (ولی) تو وہی زبان بولتے تھے جو اس وقت دکھن میں رائج اور نربدا دریا کے ادھر رائج رہی"

نواب نصیر حسین خاں خیال کی کتاب کا نام "مغل اور اردو" ہے" اردوے معلّٰی نہیں۔ بہرحال اس سے انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ ولی اُردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔ ایسی صورت میں نواب صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ولی کی تنقیص کے سوائے انکا اور کوئی مقصد نہیں معلوم ہوتا ہے۔

(۲) نثر اُردو کے بارے میں نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"محمد شاہ کا اُردو پرست زمانہ اس زبان کی پہلی نثر کے لئے بھی ممتاز اور یادگار رہیگا۔ فضلی نے اسی بادشاہ کے عہد (۱۱۴۵ھ) میں کربل کتھا لکھکر نثر اُردو کی بنیاد بھی ڈال دی اور اپنے اخلاف کے لئے ایک شاہراہ کھول دی" (صفحہ ۷۲)

مصنفین کا خیال ہے کہ نثر اُردو کی ابتدا فضلی کی کربل کتھا سے صدیوں پہلے ہو چکی تھی۔ مثلاً خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے جن کا زمانہ ۱۳۲۱ء لغایۃ ۱۴۲۲ء گذرا ہے نثر اُردو میں "معراج العاشقین" لکھی اس کے بعد اسی مصنف کی دوسری کتاب "ہدایت نامہ" وجود میں آئی۔ اور فضلی کی کربل کتھا سے پورے سو برس پیشتر یعنی ۱۰۴۵ء میں وجہی نے اپنی کتاب "سب رس" اُردو نثر میں لکھی جواب طبع ہو چکی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ سب مصنفین دکھنی تھے۔ غالباً اسی وجہ سے فاضل مصنف نے انھیں نظر انداز کر دیا۔ بہرحال ممکن ہے کہ "اُردوے معلّٰی" کی سب سے پہلی نثر کتاب فضلی کی کربل کتھا ہو لیکن اردو نثر کی یہ پہلی کتاب ہرگز نہیں ہے۔

کل کتاب میں حوالوں پر سُنی سنائی روایات کو زیادہ ترجیح دی گئی ہے جس کے باعث یہ کتاب پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچتی۔

عالمِ حیوانی

اس کتاب کے لائق مصنف نے بڑی تقطیع کے چھ سو سے زائد صفحات پر شیر خوار جانوروں کے مفصل حالات قلمبند فرمائے ہیں اور ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے اسے نہایت اہتمام کے ساتھ ٹائپ میں شائع کیا ہے۔ شروع میں ایک مبسوط اور پر از معلومات دیباچہ ہے۔ آخر میں مختلف جانوروں کی عکسی تصاویر بھی ہدیۂ ناظرین کی گئی ہیں اور وھیل، زیبرا، زرافہ، کانگرو اور بیوما وغیرہ جانوروں کی رنگین تصویریں ہیں۔

؂۱ مولفہ مسٹر برجیش بہادر بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ پبلشر ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد۔ قیمت ؏

فاضل مؤلف نے سواد و سو شیر خوار جانوروں کے دلچسپ حالات. اُن کی طرز بود و باش، عادات و خصائل وغیرہ درج کئے ہیں۔ جن کے پڑھنے سے عالمِ حیوانی کی کافی سیر ہو جاتی ہے. کتاب کے دیباچہ میں جانوروں کی ساخت، ارتقا، اور دیگر امور متعلقہ پر سائینٹفک حیثیت سے قابل قدر بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تالیف و اشاعت سے اردو ادب کے سرمایہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے اور ہم بلاکسی پس و پیش کے قدر دانانِ اُردو سے اس کی خریداری کی سفارش کرتے ہیں۔

اس کتاب میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر کہیں کہیں ایک آدھ نقص بھی باقی رہ گیا ہے مثلاً جھلک بجلی کے بجائے "زرق برق" استعمال ہوا ہے جو مذاق سلیم کو گراں گذرتا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے "ان کے پاؤں میں غیر منقسم کھر ہوتے ہیں" یہاں غیر منقسم کھر کے بجائے "سُم" ہونا چاہیئے۔ فاضل مصنف نے زرافہ کو "ضرافہ" لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔ لاطینی اصطلاح Moschidae کا ترجمہ مشکی ہرن کیا ہے۔ یہ "مشک ہرن" ہونا چاہیئے کیونکہ "مشکی" کے معنی سیاہ ہیں۔ اسی طرح سائینٹفک اصطلاح Bovidae کا ترجمہ "گائے" کیا ہے۔ حالانکہ اصطلاح مذکور کے اندر گائے اور بیل سب موجود ہیں۔ اس لئے اس کا ترجمہ "گاؤ" ہونا چاہیئے۔ آسٹریلیا میں ایک سمور دار چھوٹا سا چوپایہ جانور ہوتا ہے جس کا منہ بطخ کی چونچ کی طرح ہوتا ہے، اسے انگریزی میں Duck Bill کہتے ہیں فاضل مؤلف نے انگریزی نام برستور رہنے دیا ہے اگر وہ چاہتے تو اس کا ترجمہ اپنی زبان میں "بطخ چونچا" یا "بطمنقارہ" کر سکتے تھے جس سے زبان میں ایک اصطلاح بھی پیدا ہو جاتی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ دوسرے اڈیشن میں یہ باتیں دُور کر دی جائیں گی۔

نوابِ جمیل الشان[1]

یہ ایک فرضی افسانہ ہے جس میں آج سے پچاس برس پیشتر کے لکھنؤ کی سوسائٹی کا مرقع پیش کیا گیا ہے اور مصنف کو اس مقصد میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔ ان کے تمام کردار جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔ زبان بھی نہایت شستہ اور رو چپار ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ ہے گو اس کے بعض واقعات غیر معمولی ہونیکی وجہ سے ناقابلِ یقین ہیں۔ اس ناول میں نوابِ جمیل الشان جن کے نام سے کتاب موسوم ہے ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ قصہ کی اصل روح رواں کمو جان ہیں اور اُن کے بعد نواب بنیاد حسین خاں کا نمبر ہے بہرحال نوابی زمانہ کے آخری دور کا اسمیں اچھا خاصا مرقع پیش کیا گیا ہے اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا لطف بھی موجود ہے۔

---

[1] مصنفہ عبدالرؤف عباسی صاحب اڈیٹر اخبار حق لکھنؤ۔ حجم ۲۰۰ صفحات۔ لکھائی چھپائی کاغذ معمولی۔ قیمت ۱۲؍

عالمِ نسواں

ملک کے مختلف حصوں میں ترقیِ نسواں کی تحریک زور پر ہے ، چنانچہ حال میں اس کے متعلق بہت سے اہم جلسے ہوئے مثلاً ۲۹ .اکتوبر کو انجمن خواتین اودھ کی ساتویں کانفرنس سینیئر مہارانی صاحبہ نانپارہ کی صدارت میں بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ میں منعقد ہوئی .مہارانی صاحبہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس بات پر بہت زور دیا کہ اب لمبی چوڑی تقریروں اور ریزولیوشن بازیوں کا وقت نہیں ہے بلکہ عملی جدوجہد کی ضرورت ہے اس لئے تعلیم یافتہ خواتین اور دور اندیش مردوں کو تعلیم نسواں کی راہ سے تمام رکاوٹیں دُور کردینا چاہیئے .مس کھنّا لوکل سکریٹری نے ۱۹۳۲ء کے کام کی رپورٹ پڑھکر سنائی .کانفرنس نے سات سب کمیٹیاں قائم کیں اُنمیں سے ایک تعلیم کے متعلق دوسری انسداد چھوت چھات تیسری اسپتال چوتھی امدادو اعانت بیوگان اور پانچویں دیہات کے متعلق ہے .آخر میں کانفرنس نے دس ریزولیوشن پاس کئے جن کا تعلق ، عام تعلیم نسواں ، عام اور جبریہ ابتدائی تعلیم ، لڑکیوں کی ورزشی تعلیم حقوقِ نسواں ، دیہات کے تعمیری کام ، حق رائے دہی ، انسداد چھوت چھات و انسداد گداگری وغیرہ سے تھا .

نومبر کے پہلے ہفتہ میں آل انڈیا مارواڑی خواتین کانفرنس کا اجلاس زیرِ صدارت شریمتی جانکی دیوی یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ ہال کلکتہ میں منعقد ہوا .جس میں بہت سی خواتین نے تقریریں کیں اور متعدد ریزولیوشن پاس کئے جن کا تعلق انسداد پردہ ، تعلیم نسواں ، شاردا ایکٹ کی حمایت ، اچھوت ادھار ، سودیشی پرچار ، انسداد فضول خرچی سے تھا .ایک ریزولیوشن میں جداگانہ نیابت کی مذمت بھی کی گئی ، ایک میں حکومت سے شوہروں کی ملکیت میں بیویوں کو حق دلانے کا مطالبہ کیا گیا .ایک میں حکومت سے درخواست کی گئی کہ وہ عورتوں کے اغوا کرنیوالے مجرموں کو عبرتناک سزائیں دے .اس کانفرنس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تمام مارواڑی خواتین پہلی مرتبہ بے پردہ شریک ہوئیں .

انجمن خواتین ممالک متوسط حصہ جنوبی کا ستھواں سالانہ اجلاس پچھلے مہینہ بھنڈارہ میں زیرِ صدارت مسز شانتابائی منعقد ہوا .گردو نواح کے اضلاع سے تقریباً چار سو ڈیلیگیٹ خواتین شریک ہوئی تھیں .پریسیڈنٹ صاحبہ نے

منجملہ دیگر باتوں کے قانون دھرم شاستر میں بعض اصلاحات کی ضرورت بھی بتلائی اور اس امر پر زور دیا کہ خاص حالتوں میں عورت کو خلع کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ عورت کا درجہ بلند کرنے کے لئے آپ نے فرمایا کہ بیوی کو شوہر کی جائداد اور ملکیت میں حصہ ہونا چاہیئے، اور عورتوں کی بہبودی کے لئے انجمنیں اور گھریلو دستکاریاں قائم ہونی چاہئیں۔ آپ نے تحریک ضبط تولید (برتھ کنٹرول) کی بھی تائید کی۔

اکتوبر کے آخری ہفتہ میں الہ آباد میں اگروال قوم کی خواتین نے بھی مسز تارا دیوی اگروال کی صدارت میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں پریسیڈنٹ صاحبہ نے انسداد پردہ کے لئے اپیل کی۔ اور کم عمر کی لڑکیوں کے ازدواج کی مخالفت کی۔ اور توہم پرستی اور بھوت پریت کی پوجا ترک کرنے کی تاکید فرمائی۔ میونسپل بورڈ سے زنانہ پارک کھولنے اور جبریہ تعلیم نسواں جاری کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

امسال جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے یوم تاسیس کے جلسے میں دہلی کی کم وبیش ایک ہزار خواتین شریک ہوئیں جلسہ کی صدر بیگم انصاری صاحبہ تھیں جنھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں عورتوں کو اصلاح معاشرت اور تعلیم کی طرف توجہ دلائی۔ بیگم آصف علی نے ایک تقریر کی جس میں عورتوں کو اپنے اندر اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ پیدا کرنے اور اپنے بچوں اور بچیوں کو اچھی تعلیم و تربیت دینے کی نصیحت کی۔ مس بورن نے بھی جو جامعہ میں چھوٹے بچوں کی تربیت کی نگراں ہیں اردو میں ایک دلچسپ تقریر فرمائی۔ اس جلسہ کی کامیابی کا سہرا مسز آصف علی کے سر رہا۔

ریاست حیدرآباد دکن کی لیجسلیٹو کونسل میں مسٹر خالد زماں صدیقی نے ایک مسودۂ قانون پیش کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کو خاص حالات میں خلع کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ مثلاً بیوی اپنے شوہر کی بدسلوکی اور عدم ادائے حقوق کی صورت میں طلاق حاصل کر سکے۔ اس قانون کا منشا یہ بھی ہے کہ نابالغی کی حالت میں شادی ہوجانے کے بعد اگر سن بلوغ کو پہونچکر میاں بیوی کے درمیان موافقت نہ ہو تو بیوی علحدگی حاصل کر سکے گی

ترکی عورتوں کی طرح ایران کی خواتین بھی زندگی کے ہر شعبہ میں دلچسپی لینے لگی ہیں۔ چنانچہ سرکاری اداروں کے علاوہ وہ بنکوں، تعلیمی اور طبی اداروں میں بھی کام کر رہی ہیں۔ تازہ خبر ہے کہ ایک خاتون مجلس وزارت میں بھی داخل ہوئی ہیں جن کے محکمہ ڈاک، تار اور صیغۂ محاسبات کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ یہ پہلی ایرانی خاتون ہیں جو حکومت کے شعبۂ انتظامیہ میں شامل ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے دولت ایران کی عنان حکومت (اعلیٰحضرت رضا شاہ پہلوی

کے ہاتھ میں آئی ہے ملک و قوم دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ ایران کی کچھ عورتیں جرنلسٹ بھی ہو گئی ہیں۔

صوبہ برار کی مشہور شاعرہ خورشید آرا بیگم بنت جناب قاضی محمد قیام الدین صاحب پنشنر سب رجسٹرار امراؤتی نے تین ماہ کی قلیل مدت میں تیاری کر کے "منشی فاضل" کا کورس ختم کیا اور پنجاب یونیورسٹی کے امتحان میں اچھے نمبروں میں پاس ہوئیں۔ برار میں یہ پہلی مسلم خاتون ہیں جنھوں نے منشی فاضل کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔

مس ایچ۔ ایم۔ ڈبلیو ڈوڈ مسٹرس سرٹی کے۔ ایس زنانہ ہائی اسکول سکندرآباد نے حال میں لندن یونیورسٹی سے تعلیمی ڈپلومہ حاصل کیا ہے۔ آپ کو اس کام پر حیدرآباد کے ارباب ریزیڈنسی نے خاص طور پر مامور کیا تھا۔

مس ڈبلو۔ جی۔ ایم۔ بوچر مرزاپور میونسپل بورڈ کی ممبر نامزد کی گئی ہیں۔ آپ مرزاپور میونسپل بورڈ کی پہلی ممبر خاتون ہیں۔ اس وقت آپ پبلک ہیلتھ کمیٹی کی چیرمین ہیں۔

مس دوار کا بائی بھٹ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (بمبئی) سابق آنریری سپرنٹنڈنٹ سیوا سدن پونہ لندن یونیورسٹی سے ٹی۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے آئی ہیں۔

بیگم سلطان میر امیر الدین صاحبہ بی۔ اے نے جو میر امیر الدین ڈسٹرکٹ و سشن جج سیلم کی زوجہ محترمہ ہیں ۱۴۔ نومبر کو ٹامل نیڈو خواتین کانفرنس کی صدارت فرمائی۔ آپ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن سروس لیگ کی بانی اور پریسیڈنٹ بھی ہیں۔

کماری کانتی دیوی سرپاستو نے جو مسٹر بخت بہادر سرپاستو کی دختر نیک اختر ہیں، بین پوری نمائش سنہ ۳۳ء کی موسیقی کانفرنس میں فن موسیقی کا تمغہ حاصل کیا۔

راجکماری اکا صاحب نے جو ریاست اوندھ کی شہزادی اور اصلاح معاشرت میں مشہور اور ہر دلعزیز کارکن ہیں کشیدہ کاری اور کیرتن میں ایک طلائی تمغہ حاصل کیا۔

"آنسو"

(از منشی جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی بی اے)

آئینہ بردارِ غم، غمازِ جذباتِ دروں — باعثِ تسکینِ خاطر مایۂ ضبط و سکوں

شعلۂ سوزِ نہانی، مرہمِ زخمِ کہن — سرخیِ افسانۂ غم، دفترِ رنج و محن

ذرۂ شورِ نمکداں خونِ ارمانِ حزیں — آشنائے دردِ غمدیدہ نشاطِ دل نشیں

پردہ پوشِ چشمِ عریاں کاشفِ رازِ نہاں — ثمرۂ سوزِ محبت جوہرِ جنسِ گراں

قطرۂ دریا بداماں غنچۂ نخلِ الم — حاصلِ کشتِ تمنا دفترِ جذباتِ غم

گوہرِ چشمِ یتیماں لختِ دل خونِ جگر — سرخیِ احوالِ بیکس پیکرِ جذب و اثر

بے زبانی کی زباں اے پاسبانِ آبرو — نقشِ دامانِ تحمل اے نشانِ آبرو

تجھ کو اے مونس سراپا حسرتِ عاشق کہوں — دل میں دوشیزہ کے ارماں آنکھ میں بیوہ کی خوں

مظہرِ حسنِ عقیدت تیری ذاتِ پاک ہے — زخم کی چشمک زنی سے تیرا دامن چاک ہے

فی الحقیقت تو پسندِ خاطرِ ناشاد ہے — تیرے دم سے پانی پانی خنجرِ فولاد ہے

تیری گرمی سے پگھل جاتا ہے پتھر کا جگر — سنگدل بھی موم ہو جاتا ہے تجھ کو دیکھ کر

آنکھ کا پانی ڈھلا تو چشمِ بینا کور ہے — تجھ سے کب وہ آشنا ہے جس کے دل میں چور ہے

حسنِ بے پردہ ہوا تو جلوہ سامانی نہیں — روزنِ تاریک ہے جس آنکھ میں پانی نہیں

آنکھوں ہی آنکھوں میں پی جائے تجھے وہ مرد ہے
قدر تیری جانتا ہے جو سراپا درد ہے

ادائے حسن

(از مولوی محمد زبیر صاحب روحی الہ آبادی)

شام کا تھا وقت ہر اک شے تھی مرجھائی ہوئی — تھی فضائے دہر پر اک خامشی چھائی ہوئی
ہر شجر تھا گویا بحرِ فکر میں ڈوبا ہوا — اور لبِ جو سبزۂ شاداب تھا سویا ہوا
رک گئی تھی چلتے چلتے باغ میں بادِ صبا — ہر طرف اشجار پر تھا طائروں کا جمگھٹا
سو گئی تھیں تال کی موجیں بھی زیرِ سطحِ آب — اور پانی پر نظر آتی نہ تھی شکلِ حباب
پتے پتے پر سکوتِ شام تھا چھایا ہوا — ہر گلِ رنگیں نظر آتا تھا مرجھایا ہوا
گائیں چر کے آ رہی تھیں سب کی سب بستی کی طرف — گویا روحیں جا رہی تھیں اصل ہستی کی طرف
یاد ہے اس وقت تم تنہا کھڑے تھے بام پر — اور شفق پھولی ہوئی تھی چرخِ نیلی فام پر
بھورے بھورے بادلوں کا تھا سماں پیشِ نظر — بجلیاں چمکا رہے تھے تم یہ منظر دیکھ کر
یعنی تھی برقِ تبسم کی چمک ہر سو عیاں — ہو رہا تھا اور بھی مضطر مرا قلبِ تپاں
آڑ سے اک پیڑ کی میں دیکھتا تھا بار بار — میری آنکھیں تھیں تمہارے حسنِ رنگیں پر نثار
الغرض بیتاب ہو کر سامنے آ ہی گیا — کیا کہوں پھر آہ میں اس لطف سے محروم تھا

تم نے جب دیکھا مجھے تو مسکرا کر چھپ گئے
رہ گیا چپکا کھڑا میں قلب پر حسرت لئے

ایک سبق آموز واقعہ

(از پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، بی۔ اے)

کہتے ہیں نان برہمن ہے، برہمن ہے یہ ۔۔۔ کاسٹ ہندو ہے یہ جین اور ہری جن ہے یہ
شیخ ہے، سید ہے، یہ بوہرا ہے تو میمن ہے یہ ۔۔۔ پارسی ہے یہ ۔ وہ سکھ اور کرسچن ہے یہ

گر رہے ہیں ہندو و مسلم میں تمیزیں ایسی
تناقص نہ کہیں پائیں گے چیزیں ایسی

کنفرنسی ہے اگر کوئی تو لیگی کوئی ۔۔۔ ہے کوئی دھرم سبھائی تو سماجی کوئی
قادیانی ہے کوئی اور حنفی بھی کوئی ۔۔۔ شیعہ، اثنا عشری ہے تو ہے سنی کوئی

اپنی اپنی سبھی تعریف بکے جاتے ہیں
سنتے سنتے یہ کتھا ہم تو تھکے جاتے ہیں

ایک دن تھا ہمیں آرام سے سب رہتے تھے ۔۔۔ ضد و تفریق کے دریا نہ یہاں بہتے تھے
آ کے افتاد جو پڑتی تو بہم سہتے تھے ۔۔۔ اور زباں سے نہیں دل سے یہی سب کہتے تھے

ہندو و مسلم تو ہیں یکجان، یہ کٹ سکتے ہیں؟
چولی دامن کا ہے ساتھ ان کا۔ یہ پھٹ سکتے ہیں؟

کبھی جمعیت اضداد یہاں جاری تھی ۔۔۔ یعنی یکجان و دو تن خلق خدا ساری تھی
انس باہم تھا مواسات تھی غم خواری تھی ۔۔۔ تھی وہ آپس میں مروت وہ رواداری تھی

لہ اس واقعاتی نظم کی شان نزول یہ ہے کہ امسال تیوہار دیوالی میں کانپور میں پانچسو سے زائد آدمی جوا کھیلتے ہوئے گرفتار کئے گئے۔ ان میں سے ایک سو بتیس (۱۳۲) مسلمان و عیسائی بھی شامل تھے۔ اس خبر کو پڑھکر ہمارے مخدوم جناب کیفی نے یہ قابل قدر نظم لکھی ہے۔ اردو میں واقعاتی نظموں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اگر ہمارے شاعر ذرا سی توجہ فرمائیں تو یہ کمی بہت جلد رفع ہو سکتی ہے۔ جناب کیفی نے اس طرف طبع آزمائی فرما کر سخنوران اردو کے سامنے ایک قابل تقلید مثال قائم کر دی ہے:
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

(ایڈیٹر)

کہ شریک اس کا وہ ہوتا تھا غم و شادی میں
وہ ہم آہنگی و یک رنگی تھی آبادی میں

اب وہ آیا ہے زمانہ کہ بس اللہ کی پناہ
نہیں اِس بھول بھلیاں سے نکلنے کی راہ

ملک تو ہو نہیں سکتا ہے سوا اس سے تباہ
جس کی پڑتی ہے بس اپنے ہی پہ پڑتی ہے نگاہ

نفسی نفسی پڑی ایسی کہ کوئی حد ہی نہیں
ایسی تفریق، یہ تقسیم نہ پاؤ گے کہیں

وہ بھی ہیں کڑھتے ہیں جو دیکھ کے یہ حال وطن
اُن کو کھٹکا ہے اُجڑ جائے نہ اپنا یہ چمن

ہے یقیں ان کو یہ فارق ہیں خود اپنے دشمن
نہ انھیں دردِ وطن ہے نہ ترقی کی لگن

طشت از بام ہے جو گت ہے چھپائے نہ چھپے
کام بگڑا ہے کچھ ایسا کہ بنائے نہ بنے

جن کے سینے میں کھبا دردِ وطن کا ہے تیر
دل سے ہے جن کی فغاں اور ہیں نالے شبگیر

خنجرِ عشقِ وطن کے جو جگر ہیں نخچیر
اُن کو بتلاتے ہیں ہم آج نئی اک تدبیر

ہے جو منظور یہ ناچاقیاں یکسر ہوں گم
دھندے سب چھوڑ دو جوئے خانے یہاں کھولو تم

یہ مبنی کی نہیں بات لے مرے پیارے بھائی
سنو خبروں کی جو ایجنسی ہے اے۔پی۔آئی

ہر کہیں تار پر اُس نے یہ خبر پہنچائی
مستقر میں جو زمانہ[۱] کے دِوانی آئی

منعقد اہلِ وطن نے وہاں کی بزمِ قمار
ہندو و مسلم کا کر سیجن کا نہ تھا جس میں شمار

کئی سو اُن میں سے پکڑے ہیں پولیس نے جواری
اُن کی پیشی کی عدالت میں ہے اب تیاری

کوئی چاہے اسے ذلت کہے چاہے خواری
میں تو کہتا ہوں یہی اصل میں ہیں احراری

جو ہم وفق و مدارا کا سبق دیتے ہیں
اس کے امکان کی خلقت سے قسم لیتے ہیں

اہلِ دل کے لئے ہے حیرت و غیرت کا مقام
منع ہیں دھرم میں جو دین میں ہیں سخت حرام

ایسے کاموں میں تو شرکت ہے باخلاص تمام
مگر آ جائے وطن کی کہیں خدمت کا جو کام

[۱] یعنی کانپور

تفرقے ذات و مذاہب کے گنے جاتے ہیں

ہم یہ ہیں۔ ہم وہ ہیں۔ ڈھرید یہ سُنے جاتے ہیں

آسکے فہم میں انساں کے نہ یہ بوالعجبی ۔۔۔ ایسی حالت تو زمانے میں نہ دیکھی نہ سُنی

ہاں جوئے خانہ میں ہو سکتی ہے شرکت سب کی ۔۔۔ مانع اس میں ہے نہ ذات اور نہ فرقِ ملی

لیکن اصلاح و ترقی کے جو کام اُن کو بتائیں

کندھا ڈالیں وہیں اور صاف ہی کاندھی بچائیں

عیب کرنے کو تو سب شیر و شکر ہوتے ہیں ۔۔۔ رات دن لہو میں مِل جُل کے بسر ہوتے ہیں

معصیت میں تو وہ یک جان و جگر ہوتے ہیں ۔۔۔ صدقے جی جان سے اک دوسرے پر ہوتے ہیں

لیکن آجائے اگر پیش کوئی ملکی کام

لینے لگتے ہیں جھگڑے، مذہب و ملت کا نام

فلسفۂ حسن و الفت

(از جناب محمود اسرائیلی صاحب)

جب باغ ازل کے دامن میں مستی کی ہوا روپوش ہوئی
پھولوں سے ٹپکا بادۂ حسن اور خود فطرت مے نوش ہوئی
اس گلکدہ کا ہر برگِ نو، اک دفتر تھا اپنائی کا
اِس منظر کا ذرہ ذرہ، آئینہ تھا رعنائی کا
تھا قطرۂ گل شاداب مگر وہ تشنۂ دیدہ شیدا تھا
تھے غنچۂ و گل رنگیں لیکن اک یاس کا عالم پیدا تھا
جب حسن کی فطرت شوخی کو پیغام نمائش دیتی تھی
جذبات کے گہوارے میں پیہم کوئی شے کروٹ لیتی تھی
شوخی و حیا کے ہنگاموں نے حشر بپا کر رکھا تھا
خود حسن میں پیکر الفت کا قدرت نے بنا کر رکھا تھا

ماتم پٹیل

(از مہاشہ جیمنی سرشار، خیر پور سادات)

چھایا فضا پہ آتشِ غم کا دھواں ہو کیوں ہر سمت شورِ نالۂ و آہ و فغاں ہے کیوں؟
محزوں ہر ایک طفل و پیر و جواں ہے کیوں غم سے نڈھال مادرِ ہندوستاں ہے کیوں؟

بیتاب و بیقرار ہے سیماب وار قوم
کس کے غمِ جدائی میں ہے اشکبار قوم

جس شیر دل سپوت پہ بھارت کو ناز تھا دیں کو۔ وطن کو۔ قوم کو۔ ملت کو ناز تھا
ذہن و ذکا و فہم و فراست کو ناز تھا جس پر اسمبلی کی صدارت کو ناز تھا

مردِ جری وہ راہی ملکِ بقا ہوا
وی۔جے۔ پٹیل کشتۂ تیغِ قضا ہوا

وہ یادگارِ عظمتِ عہدِ کہن پٹیل وہ چارہ سازِ حسرت و رنج و محن پٹیل
سرمستِ جامِ بادۂ حبِ وطن پٹیل جنگ آزما۔ دلیر۔ جری۔ صف شکن پٹیل

ہیبت سے جس کی لرزہ براندام تھے عدو
چالوں پہ چالیں چل کے بھی ناکام تھے عدو

وہ سرفروش آج جہاں سے گذر گیا باغِ امیدِ قوم کو تاراج کر گیا
کس سمت ملک و قوم کا نورِ نظر گیا؟ کہنے کو حالِ قوم و وطن، عرش پر گیا

نالوں سے اپنے گنبدِ گردوں ہلائے گا
آہ و فغاں سے رحمتِ حق کو جگائے گا

وہ لعلِ بے بہا، گہرِ آبدار قوم | چشمِ جہاں میں جس سے تھا قائم وقارِ قوم
تھی جس کی ذات مایۂ صد افتخارِ قوم | وہ چارہ سازِ دردِ دلِ بے قرارِ قوم

دے جاں دیارِ غیر میں بھارت کا نونہال
ہو قوم کیوں نہ کشتۂ رنج و غم و ملال

اس طرح چھوڑ جائیں جب اپنے طبیب آہ! | کس سے رکھیں امیدِ شفا ہم غریب آہ!
ہنستے ہیں حالِ زار پہ اپنے رقیب آہ! | مایوس کیوں نہ ہو دلِ حسرت نصیب آہ!

تھی دھوم جس کے دستِ شفا کی جہان میں
لائے ہیں اس کی لاش کو ہندوستان میں

اپنے وطن میں لاتے نہ احباب کیوں اُسے | رہنا محال ہو گیا غربت میں یوں اُسے
تڑپا رہا تھا ہند کا حالِ زبوں اُسے | ملتا دیارِ غیر میں کیونکر سکوں اُسے

رنجِ فراقِ قوم و وطن سہہ سکا نہ وہ
غربت میں بعد موت کے بھی رہ سکا نہ وہ

رباعیات

(از جناب بسمل الہ آبادی)

موردِ تحقیر ہو کر باعثِ غم ہو گئی | آپ کی عزت نگاہِ خلق میں کم ہو گئی
دیکھئے جسکو وہ اے بسمل ہے غرقِ معصیت | دین پیچھے رہ گیا دنیا مقدم ہو گئی

نہ وہ منصب وہ دولت نہ اب وہ جاہ باقی ہے | مٹے سب گردشِ دنیا سے اک اللہ باقی ہے
دوالا سیٹھ صاحب کا بھی نکلا اب تجارت میں | جسے دیکھو وہ کہتا ہے مری تنخواہ باقی ہے

پریسیڈنٹ پٹیل مرحوم

(از حضرت سحر ہنگامی)

فضائے ہند پہ طاری ہے آج ابرِ الم چہار سمت ہے اشکوں کی بارشِ پیہم
جسے بھی دیکھئے ہے وہ غریقِ لجۂ غم ہے ملک میں شری وی جے پٹیل کا ماتم

گرج سے جسکی حریفوں کے قلب تھے لرزاں
جہاں میں اب نہیں گجرات کا وہ شیرِ ژیاں

وہی ہے بیشہ، وہی دشت اور وہی میداں وہی ہے کوہ کا منظر، وہی ہے آب رواں
ہیں جمع سب ہی لطفِ حیات کے ساماں پر اُن سے لطف اٹھائے وہ شیر نر ہے کہاں؟

پٹیل! تو جو نہیں سب سماں ہوا سونا
تری وفات سے ہندوستاں ہوا سونا!

خدا نے جیونہی بنایا سنوار کر تجھکو تو دیدیا وہیں فولاد کا جگر تجھکو
اگرچہ اپنے مصائب کی تھی خبر تجھکو مگر نہ اُن سے کسی طرح کا تھا ڈر تجھکو

نہ تو نے جسم کو جسم، اور نہ جاں کو جاں سمجھا
ہمیشہ زیست کو اک سخت امتحاں سمجھا

یہی سمجھ کے عمل کوش تو مدام رہا رہا خوشی سے، اگر تجھ کو غم سے کام رہا
فقط خیالِ وطن تجھ کو صبح و شام رہا رہِ سوراج پہ تو خوب تیز گام رہا

زمانہ تھا تری پیری و ناتوانی کا
ترے لہو میں مگر جوش تھا جوانی کا

اسمبلی میں وہ آتش بیانیاں تیری　　وہ جگمگاتی ہوئی دُرفشانیاں تیری
حقوق کی وہ کڑی پاسبانیاں تیری　　وہ سب نہ بھولنے والی کہانیاں تیری

پھر اُس کو چھوڑ کے وہ قید میں ترا جانا
بقول اپنے یونہی پنشن اور لقب پانا

نکل کے قید سے پھر وہ ترا طویل سفر　　نہ غور تو نے کیا اپنی بگڑی صحت پر
وہ ملک ملک میں تیرا بس ایک ہی لکچر　　یہاں کے حال کی دینا وہاں صحیح خبر

گیا بدیس جو یوں ہند کا پیام لئے
تو سن کے اُس کو سبھی نے دل اپنے تھام لئے

وہیں سے اپنے لئے بھی پیام غم آیا　　تری وفات کا حال آہ ایک دم آیا
نہ ہند ہی میں فقط دورِ پر الم آیا　　وہ بلکہ سارے زمانے میں بیش و کم آیا

کوئی چنی ہوئی ہستی فنا جو ہوتی ہے
قلق سے مادرِ گیتی ضرور روتی ہے

یہی ہے خاصۂ شہر اس سرائے فانی کا　　یہ دہر ایک مرقع ہے آنی جانی کا
مگر جہاں میں جو حاصل ہے زندگانی کا　　کہ ایک نقش ہو اُس کی اَمِٹ نشانی کا

تو اے پٹیل! نزع میں ترا یہ حال رہا
تجھے سوراج کا اور ہند کا خیال رہا

علمی خبریں اور نوٹ

پچھلی مردم شماری کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور برہما میں سوا دو سو مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں چونتیس (۳۴) کروڑ انچاس (۴۹) لاکھ اٹھاسی ہزار پانسو ستائیس آدمی ایسے ہیں جو صرف اپنی مادری زبان بولتے ہیں اور چھتیس (۳۶) کروڑ چونسٹھ لاکھ تیس ہزار پانسو سینتیس (۳۷) آدمی اپنی مادری زبان کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔

ان اعداد و شمار کے ساتھ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ممالک کا مقابلہ کیجئے۔ افریقہ اور ایشیا کے دیگر ملکوں میں صرف سترہ (۱۷) زبانیں رائج ہیں اور یورپ میں صرف بیس (۲۰) مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بارہ لاکھ انتالیس ہزار سات سو چھ یورپین صرف اپنی مادری زبان میں گفتگو کر سکتے ہیں اور بقیہ دیگر زبانیں بھی جانتے ہیں۔

پچھلے دنوں الہ آباد میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب کے زیر صدارت ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں ملک کے اکثر نامور شعرا شریک ہوئے تھے۔ سر ممدوح نے جو ہندوستان کے ایک مشہور مدبر و سیاست داں ہونیکے علاوہ ملک کے ایک نامور ادیب بھی ہیں، اپنے خطبۂ صدارت میں دیگر مفید اور دلچسپ باتوں کے علاوہ اس اہم اور وقیع حقیقت کا بھی اظہار فرمایا کہ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے، اور دونوں کی مشترکہ کوششوں سے اس کو اس قدر ترقی نصیب ہوئی ہے۔

مملکت نظام دکن میں سالہ ۱۹۳۱ء میں مختلف زبانوں کی پانسو انسٹھ (۵۵۹) کتابیں شائع ہوئیں، سال ماسبق میں صرف تین سو انسٹھ (۳۵۹) کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ ان اعداد سے ثابت ہوتا ہے کہ حیدرآباد دکن میں اچھی خاصی علمی ترقی ہو رہی ہے۔ بہ لحاظ موضوع پچھلے سال کی کتابوں کی تفصیل یہ ہے:-

مضمون	تعداد کتب	مضمون	تعداد کتب	مضمون	تعداد کتب
ادب	۲۶	سائینس	۴	قصص	۱۵
شعروسخن	۴۶	الٰہیات وحدیث وتفسیر ودینیات	۹۲	قانون	۶۶
سوانحعمری	۵	اخلاق پند ونصائح	۲۶	طب حفظان صحت ومعاشرت	۱۷
تاریخ	۹	افسانہ وڈراما	۳	تعلیمات	۴۵
		متفرق	۴۵		

ان میں اُردو کی ۲۱۳ کتابیں ہیں، تلنگی کی چوالیس، مرہٹی کی چھبیس، انگریزی کی دس، اُردو عربی کی اکیس ایک، ہندی کی چھبیس اور باقی متفرقات۔

ہز مجسٹی ملک معظم نے آئندہ سے ہر سال ایک طلائی اور ایک نقرئی تمغہ انگریزی نظم کی دو بہترین کتابوں کو عطا فرمانے کا اعلان کیا ہے۔ ان انعامات کی کتابوں کے انتخاب کے لئے ملک الشعرائے انگلستان مسٹر جان میسفیلڈ کے زیر صدارت ایک کمیٹی بھی قائم کر دی گئی۔ پہلا انعام ۱۹۳۳ء میں شائع شدہ منتخب کتب پر دسمبر ۱۹۳۴ء میں عطا کیا جائیگا۔

امریکہ کی حبشی النسل آبادی کو آزاد ہوئے تقریباً ایک صدی گذری ہے۔ اس سے پہلے ان لوگوں کا کوئی اخبار شائع نہ ہوتا تھا لیکن اس وقت ان کے ڈیڑھ سو سے زیادہ روزنامے جاری ہیں جن پر چالیس لاکھ پونڈ سرمایہ لگا ہوا ہے اور جن کی اشاعت چھ لاکھ ہے۔ روزانہ اخباروں کے علاوہ دو سو مذہبی رسالے، ۳۵ کالج میگزین، درجنوں ہائی اسکول اخبار، سولہ تجارتی پرچے، تیرہ برادری کے جرنل اور بیشمار ماہوار رسالے نکل رہے ہیں۔ کیا ہم ہندوستانی بھی ادبی ترقی کے معاملے میں اس چھوٹی سی قوم سے مقابلہ کر سکتے ہیں؟

سید ابو محمد کاوش صاحب ندوی (ڈاکخانہ ہسوہ ضلع فتحپور) فارسی کے ہندو شعرا کا ایک تذکرہ مرتب کر رہے ہیں اس لئے اُن حضرات کو جو یا تو خود فارسی کے شاعر ہوں، یا جن کے خاندان یا وطن میں فارسی شعرا ہوں، سید صاحب موصوف سے خط و کتابت کرنا چاہیئے۔

ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ کی سرپرستی میں مولانا کیفی چریا کوٹی نے "جواہر سخن" کے نام سے شعرائے اردو کا ایک شاندار انتخاب مرتب کیا ہے جو سات جلدوں میں ختم ہوگا۔ اسکی پہلی جلد زیر طبع ہے۔ مولانا موصوف نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جسمیں جملہ اصناف سخن پر مبسوط بحث کے علاوہ فنِ تنقید کے اصول بالتفصیل بیان کئے گئے ہیں۔ فاضل مؤلف نے امیر خسرو سے لیکر شاگردانِ داغ و امیر تک مستند اور صاحبِ طرز شعرائے اردو کے تمام اصناف سخن کا مکمل انتخاب کر کے انکو چھ دوروں میں تقسیم کیا ہے، ہر دور کی خصوصیات بیان کر کے ہر شاعر کے مختصر و مستند حالات اور خصوصیات شاعری پر روشنی ڈالی ہے پہلی جلد میں جو عنقریب شائع ہونیوالی ہے "دکھنی" اور "قطب شاہ" سے لیکر "مرزا مظہر" اور اُن کے شاگردوں کے کلام کا انتخاب اور حالات درج کئے گئے ہیں۔

آپ بیتی

اِس نمبر کے ساتھ زمانہ کی زندگی کا ایک سال اور ختم ہوتا ہے، اگلے نمبر سے اس کا تینتیسواں سال شروع ہوگا پچھلے بتیس برس کے عرصے میں جو ایک شخص واحد کی زندگی کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے زمانہ نے ملک اور ابنائے ملک کی کیا خدمت کی، اُردو و ادب کی توسیع و ترقی میں کیا حصہ لیا؟ ان سوالات کے مفصل جواب کا نہ اس وقت موقع ہے اور نہ کارکنانِ زمانہ لمبے چوڑے دعووں کے عادی ہیں۔ حتی المقدور استقلال۔ ایثار اور خاموشی کے ساتھ اُردو داں اہل ملک کی ادبی خدمت کرنا ہی ہلوگونی زندگی کا مقصد ہے۔ یہی خیال شروع سے زمانہ کی اشاعت میں پیش نظر رکھا گیا ہے۔ پچھلے بتیس سال کے اندر اُردو ادب کی ترقی کی بنیادیں بھرنے میں اس ناچیز رسالہ نے بھی جو قابل قدر خدمات انجام دیں اُن کا اعتراف اہل الرائے اصحاب نے فیاضی کے ساتھ کیا ہے۔ انھیں بنیادوں پر ادب اُردو کے عظیم الشان محل کی تعمیر ہوگی۔ اُردو زبان ابھی تک کس مپرسی کی حالت میں ہے، لیکن تیس سال پہلے اس کی بہت ہی زبون حالت تھی۔ اور جہاں پیشتر لوگوں کو ہزارہا روپیوں کے نقصانات اٹھانا پڑتے تھے وہاں اب سیکڑوں سے کام چل جاتا ہے۔ زمانہ کے ابتدائی نقصانات کی مقدار کے لحاظ سے اس وقت کی حالت بہت کچھ قابل شکریہ ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اس وقت بھی اس کی آمدنی اس کے اخراجات کے لئے کافی نہیں ہوتی اور اس کو اخبار آزاد سے جو اسی دفتر سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے، مدد لینا پڑتی ہے۔ ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں توسیع اشاعت کے متعلق ہماری درخواست کی کوئی قابل ذکر شنوائی نہیں ہوئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسالہ کی دلچسپیوں میں اضافہ کرنے کا جو پروگرام ہم نے اپنے ذہن میں تیار کیا تھا اس پر پورے طور سے عمل نہ ہوسکا اور تصاویر کے متعلق ہم کو اپنے ارادوں اور حوصلوں میں کمی کرنا پڑی، لیکن جہاں تک مضامین کا تعلق ہے انکا معیار اب بھی وہی ہے جو بتیس سال پیشتر ہم نے اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ پچھلے سال بھی زمانہ میں جو مضامین نظم و نثر شائع ہوئے ہیں انہیں اکثر اُردو لٹریچر میں مستقل جگہ پانے کے مستحق ہیں ہم خوش ہیں کہ پچھلے سال سے مشاہیر عالم۔ یادِ رفتگاں عالم نسواں وغیرہ جو عنوانات قائم کئے گئے ہیں انھیں ہمارے اکثر احباب نے بہت پسند فرمایا ہے، سال کے خاص خاص واقعات پر اہم مضامین کی اشاعت بھی اس سال زمانہ کی ایک قابل ذکر خصوصیت رہی ہے، چنانچہ اس سلسلے میں معاہدہ اٹاوا" "فتنۂ منجوریا" "انگلو پرشین آئل کمپنی" "ہم ایدرسٹ" وغیرہ مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مشاہیر عالم کے ذیل میں ہر ہٹلر، شاہ رضا خاں، حضرت پور داؤد، پریسیڈنٹ روزولٹ وغیرہ کے دلچسپ و سبق آموز حالات ہدیۂ ناظرین ہوئے۔ "یادِ رفتگاں" کے ذیل میں جو تیس مرحوم بزرگان ملک کے سوانحی حالات درج رسالہ کئے گئے۔ مشاہیر ادب میں مرزا رسوا۔ مولانا نظم طباطبائی۔ میر ناصر علی صاحب کے مفصل حالات مع تصاویر شائع ہوئے۔ مرزا رسوا مرحوم کے سوانحی حالات اور ادبی کارناموں کے متعلق جس قدر مسالہ اس ناچیز رسالہ نے یکجا کردیا ہے وہ بجائے خود ایک قابل فخر ادبی کارنامہ ہے۔ اس سال ہندی ادب کے تین نامور انشا پردازوں سے بھی ناظرین زمانہ روشناس کرائے گئے ہیں، اور بدھ دھرم کے متعلق تین نہایت قابل قدر مضامین شائع ہوئے، کئی شعرا کے متعلق معلومات افزا مضامین طبع کئے گئے۔ "تنقید کتب" کے سلسلے میں تقریباً پچاس کتابوں کا ریویو کیا گیا اُردو میں فن تنقید کو ابھی بہت ترقی کرنا باقی ہے لیکن زمانہ میں شروع ہی سے صحیح اصولوں کے مطابق تو تصنیف کتابوں کی تنقید کا خاص التزام رکھا گیا ہے۔ اس سال بھی جدید مطبوعات کی بے لاگ تنقید کا فرض رسالہ نے بخوبی انجام دیا۔ اس سال چودہ مختصر افسانے بھی ہدیۂ ناظرین کئے گئے ملک کے بہترین شعرائے اُردو کی اعانت و سرپرستی سے اس سال بھی زمانہ کا حصہ نظم خاص طور پر دلچسپ رہا زبان اور لہجہ کے متعلق زمانہ نے ابتدا سے ایک خاص معیار پیش نظر رکھا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ یہی معیار اس وقت بھی ہمارے

سامنے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو، دار المصنفین اعظم گڈھ کے رسالہ معارف، اور جامعہ ملیہ دہلی کے رسالہ جامعہ کے علاوہ اور کسی دوسرے رسالہ کو یہ فخر نصیب نہیں ہے، مگر ان نامور پرچوں میں زیادہ تر ایک ہی طبقے کے مضمون نگار مضامین لکھتے ہیں۔ زمانہ کو ہمیشہ سے ہندو، مسلمان، عیسائی، ہر فرقہ اور ہر مذہب کے اعلیٰ ترین انشا پردازوں اور شاعروں کی امداد حاصل رہی ہے، آج بھی زمانہ کو ملک کے سبھی چیدہ اہل قلم کی فیاضانہ امداد و اعانت حاصل ہے، آج بھی اس کے صفحات ہر قسم کے سنجیدہ مباحث کے لئے اسی کشادہ دلی سے کھلے ہوئے ہیں جیسے کہ تیس سال پہلے۔ غرض اس سال کی فہرست مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے والے کو بھی اس بات کا قائل ہونا پڑیگا کہ یہ ناچیز رسالہ اپنے ادائے فرائض میں اب بھی پورے جوش و مستعدی کے ساتھ سرگرم کار ہے۔ اس وقت تک اس نے کسی رئیس یا والیِ ملک کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا ہے اور اپنی قلیل البضاعتی کے باوجود اس نے اردو کی بہترین خدمت انجام دینے میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اردو کے علاوہ ملک کی کسی دوسری زبان کے نام لیوا اپنے خادمانِ ادب سے اس قدر بے نیاز نہیں ہیں۔ قدردانانِ اردو کی بے حسی کی جو شکایت کی جائے کم ہے۔ کیونکہ بتیس سال سے زائد کام کرنے کے بعد بھی ابھی تک زمانہ کو اتنی مالی فراغت حاصل نہیں ہو سکی کہ اس کے کارپرداز اس کی آئندہ زندگی کی طرف سے بے فکر ہو جائیں یا جو لٹریچر کہ اس کی بدولت اس عرصے میں فراہم ہو گیا اُس کو مستقل کتابی صورت میں اہل ملک کے سامنے پیش کر دیں۔ یہ امر اگر ایک طرف کارپردازانِ رسالہ کے لئے ایک افسوسناک حقیقت ہے تو دوسری طرف اردو داں جماعت کے لئے بھی از حد شرمناک ہے۔ اسی سرد مہری کی بدولت اردو ادب کی ترقی کی رفتار اس قدر سست ہے۔ اسی کس مپرسی کے سبب خادمانِ ادب کی ہمتیں اس قدر پست ہیں، اسی ناقدری کی ہم کو بھی ہر سال شکایت کرنا پڑتی ہے۔ ہر سال دسمبر کے پرچے ہیں ناظرین سے توسیع اشاعت کی درخواست کی جاتی ہے، لیکن معدودے چند اصحاب کے سوا عام طور پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ آج بھی اگر ہمارے قدرداں اصحاب اپنے علم دوست احباب سے زمانہ کی خریداری کی سفارش کر کے کم سے کم دو نئے خریدار دینے کا تہیہ کر لیں تو اس کے حجم وغیرہ میں غیر معمولی ترقی نظر آنے لگے۔ جب تک آمدنی میں اضافہ نہ ہو اخراجات میں کیسے توسیع کی جا سکتی ہے؟ اور مزید اخراجات کے بغیر ہمارے حوصلے پورے نہیں ہو سکتے ہیں۔
بہر حال ہمارے ناظرین سنیں یا نہ سنیں ہم ایک دفعہ پھر ان سے توسیع اشاعت کی اپیل کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ زمانہ کی گذشتہ خدمات اس کے آئندہ ارادوں کی کافی ضمانت ہیں۔ توسیع اشاعت کے متعلق ہمارے قدر شناس تھوڑی سی بھی توجہ کر کے دیکھیں کہ اس کا رسالہ کے حجم و مضامین وغیرہ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ رسالہ کا ماہوار حجم سوا سو صفحات سے کم نہ ہو بہت سے عنوان ہمارے ذہن میں ہیں جن پر ہم مزید مصارف کے بغیر توجہ نہیں دے سکتے ہیں۔ بہر حال ہم آئندہ بھی اپنے فرائض ادا کرنے کیلئے بیش از بیش مستعد ہیں۔ مگر ناظرین کو بھی اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے اسلئے ترقی خواہان اردو اور قدر شناسانِ ادب سے ہماری درخواست ہے کہ زمانہ کی سرپرستی فرما کر اس کی بنیاد مستحکم کرتے اور اس کے مقاصد میں توسیع و ترقی دینے کی کوشش میں ہماری دستگیری فرمائیں۔ خدا کرے یہ درخواست صدا بصحرا نہ ثابت ہو۔

خدا کرے ہمارے ناظرین کو نیا سال مبارک ہو۔

خریدارانِ زمانہ کی خدمت میں ضروری اطلاع

جن صاحبوں کی خریداری ماہ جنوری سے شروع ہوتی ہے اُن کا حساب اس نمبر کے ساتھ ختم ہوگیا ہے اور اب آئندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہوگئی ہے۔ لہذا گزارش ہے کہ ایسے صاحبان ۵ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء تک زمانہ کا سالانہ چندہ مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں ورنہ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء کا رسالہ سالانہ قیمت کے لئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (V. P.P.) ارسال ہوگا۔

(۱) قیمت طلب (ویلیو پے ایبل V.P.P.) پیکٹ میں پانچ آنے کا صرفہ ہوتا ہے، کیونکہ اب ہر ویلیو پے ایبل رجسٹری شدہ بھیجا جاتا ہے اور دو آنہ فیس منی آرڈر کے علاوہ تین آنہ رجسٹری فیس بھی ادا کرنی پڑتی ہے، اس لئے منی آرڈر سے قیمت بھیجنے والے اصحاب کو تین آنہ کی کفایت ہوگی۔

(۲) یہ بھی خیال رہے کہ ویلیو پے ایبل پیکٹ ایک ہفتہ سے زائد ڈاک خانہ میں امانت نہیں رکھا جاسکتا ہے اسلئے استدعا ہے کہ جو خریدار صاحبان منی آرڈر کے ذریعہ قیمت نہ بھیجیں وہ براہ مہربانی جنوری نمبر کا قیمت طلب پیکٹ ڈاکخانہ میں پڑا نہ رہنے دیں بلکہ اُسے فوراً وصول فرمالیں۔

(۳) منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ (اور جہانتک ممکن ہو) اپنا نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں تاکہ رجسٹروں میں رقم مرسلہ کا صحیح اندراج ہوسکے۔

جن صاحبان کو آیندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو وہ براہ کرم اس نمبر کے پہونچنے کے بعد فوراً ہی اطلاع دے دیں تاکہ اُن کی خدمت میں آئندہ رسالہ نہ بھیجا جائے اور وہ قیمت طلب (V.P.P) پیکٹ کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر ہذا مزید نقصان سے محفوظ رہے۔

جنوری سنہ ۱۹۳۴ء کا رسالہ ۱۰ جنوری تک شائع ہوجائیگا۔

منیجر

اپنے باغ میں یہ قلمیں ضرور لگائیے
سلہٹ
شیریں بے ریشہ لانبا وزن تین پاؤ رنگ زرد عہ/ تخم خورد باریک چھلکا کثرت سے پھلنے والا مشہور آم ہے
آمن انگوری عہ/
پوست باریک رنگ زرد مغز بہی مائل پر مغز بے ریشہ نہایت شیریں قابل قدر آم ہے۔ وزن ڈیڑھ پاؤ
انگبین عہ/ وزن یک پاؤ
بہت شیریں خوش ذائقہ خوش رنگ سندیلہ کا مشہور آم ہے اور خوب پھلتا ہے۔
آمن مرشد آباد
آفوز قلم ایک روپیہ وزن ڈیڑھ پاؤ
تخم خورد بے ریشہ پتلا چاشنی دار لیکن پال میں بہت مزیدار ہو جاتا ہے بنگلور کا خاص آم ہے۔
بھدیاں بجنور ۱۲/ وزن ڈیڑھ پاؤ
شیریں۔ قدرے ریشہ۔ کثرت سے پھلنے والا رنگ زعفرانی۔ پال کا نہایت عمدہ ہوتا ہے۔
بھدیلی کالیتھ والا ۱۲/
دیرپا شیریں خفیف ریشہ مشہور آم ہے وزن پاؤ بھر
بے مثال قلم ۱۲/ وزن یک سیر
چھلکا باریک بے ریشہ رنگ زرد تخم خورد۔ شیریں خوش ذائقہ۔ پر مغز کثرت سے پھلنے والا مشہور آم ہے
بیدانہ خالصپور
بے نظیر سندیلہ عہ/ تین پاؤ
بے ریشہ۔ باریک چھلکا۔ شیریں۔ تخم خورد پھلنے میں اچھا عمدہ خوش رنگ آم ہے
بڑا انناس
خوشبو مثل انناس نہایت تیز۔ مغز سفید شیریں آم ہے۔ وزن ڈیڑھ پاؤ عہ/
بنگلہ والا
بہت پھلنے والا وزن ڈیڑھ پاؤ۔ قلم عہ/
روغنی
خربوزہ
زعفران شاہ آباد
زعفران مرشد آباد عہ/
باریک چھلکا رنگ زرد چتی دار اوپر دانے کریلے کی طرح ابھرے ہوئے بے ریشہ مضبوط و دیرپا کثرت سے پھلنے والا ہے۔
زردہ
تخم خورد پوست باریک رنگ زرد بے ریشہ پر مغز شیریں شکل میں دسہری سے ملتا نہایت نفیس ہر سال کثرت سے پھلنے والا کارخانہ کا خاص اور عمدہ آم ہے شروع فصل میں تیار ہو جاتا ہے وزن ڈیڑھ پاؤ
قلم عہ/
حسن جنت وزن آدھ سیر
شیریں شاداب خفیف ریشہ دار آم ہے
بھدیاں
چپٹی بمبئی
دھرتی دھمک
رطب
تیموریہ
سدا پھل
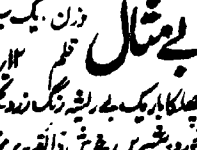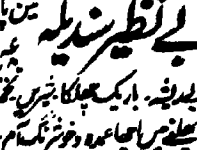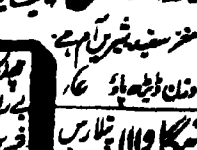
نئے سال کا نیا تحفہ
دماغ، رگ اور پٹھوں میں طاقت پہنچانے
اور تھکاوٹ دور کرنے میں بے مثل ہے
جسم میں قوت پہنچاتا اور سستی و
کاہلی دور کرتا ہے
افیون چھڑاتا ہے
سالہائے گذشتہ کی طرح امسال بھی